ہفتہ وار میگزین "خواتین کا اسلام" میں شائع
ہونے والے مقبولِ عام ۱۲۳ مضامین کا مجموعہ

درسِ قرآن و حدیث

داعیٔ قرآن حضرت مولانا محمد اسلم شیخوپوری رحمۃ اللہ علیہ



مکتبۃ الاسلام کوسہ ممبرا ضلع تھانہ
۹۳۲۲۴۷۱۰۴۶

ہفتہ وار میگزین "خواتین کا اسلام" میں شائع ہونے والے مقبولِ عام
۱۲۳ رمضامین کا حسین گلدستہ

درس قرآن و حدیث

مؤلف

حضرت مولانا محمد اسلم شیخوپوری رحمۃ اللہ علیہ

تائید و توثیق

خطیب اهل السنة

حضرت مولانا عبد اللہ صاحب قاسمی حفظہ اللہ

باہتمام: ظفر احمد نعمانی

مکتبۃ شیخ الاسلام کوسہ ممبرا
MAKTABA SHAIKHUL ISLAM
Mobile & whats App: 9322471046
Email: msislam829@gmail.com

تفصیلات

نام کتاب: ---------- درس قرآن و حدیث

مؤلف: ---------- حضرت مولانا اسلم شیخوپوری رحمۃ اللہ علیہ

تائید وتوثیق: ---------- حضرت مولانا عبداللہ صاحب قاسمی حفظہ اللہ

باہتمام: ---------- ظفر احمد نعمانی

کتابت وتزئین: ---------- ایم ایس، اسلام گرافکس ممبئی

تعداد اشاعت: ---------- ۱۱۰۰

ناشر: ---------- مکتبۃ شیخ الاسلام کوسہ ممبرا

{اسٹاکسٹ}

مکتبہ صدائے حق کشمیر

نزدیک رحمت دیدی جامع مسجد، لال چوک، اسلام آباد، کشمیر

9858741547 / 9797701048
9086625698 / 7006112253

قرآن وسنت کی نشر واشاعت کا عالمی ادارہ

مکتبہ صفدریہ دیوبند

Mobile & Whats App No:8881030588
Email:msislam829@gmail.com

{ملنے کا پتہ}

دیوبند کے تمام بڑے کتب خانوں پر بھی ہماری مطبوعات دستیاب ہیں

حبیبیہ صوت الاسلام کیسیٹ سینٹر، سری نگر، کشمیر ---- مکتبہ الغزالی، سری نگر، کشمیر

الحراء پرفیومرس تبلیغی مرکز، مسجد ومدرسہ دار الفلاح، کوسہ، ممبرا، ضلع تھانہ

عبدالسلام خان قاسمی، ۱/۷۹ کتاب مارکیٹ، بھنڈی بازار ممبئی

فردوس کتاب گھر، نزد شالیمار ہوٹل، بھنڈی بازار ممبئی

ذکریا بکڈپو، مسجد نور کارولی روڈ، بھیونڈی

مکتبہ القاسم (مالیگاؤں) 09373471142

فہرستِ عنوانات

تعارفِ مضامین

چند سال قبل زیارتِ حرمین کے موقع پر بارہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک وقیع اور عظیم الشان کتاب نظر سے گزری، نام تھا " نضرة النعيم في اخلاق الرسول الكريم صلى الله عليه وسلم " یہ کتاب صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اخلاق کے موضوع پر نہیں مطلقاً اخلاق کے بارے میں بھی بے مثال انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، اس کتاب کی تیاری میں مختلف علوم وفنون کے ماہرین کی ایک بڑی جماعت نے حصہ لیا ہے، جس کی نگرانی کے فرائض حرمِ مکی کے امام وخطیب صالح بن عبداللہ بن حمید اور دارالوسیلۃ کے مؤسس اور مدیر عبدالرحمٰن بن محمد بن عبدالرحمٰن بن ملوح نے سرانجام دیے ہیں، اس کتاب کی پہلی جلد مفصل اور مطول مقدمہ اور سیرتِ نبویہ پر مشتمل ہے، مقدمہ میں کتاب کے اغراض ومقاصد، منہج واسلوب کے علاوہ زندگی اور نفس انسانی، ابتلاء اور نفس انسانی کی روشنی میں ایمانی زندگی، اسلام میں اخلاق کی اہمیت وعظمت، اخلاق کا مفہوم، اسلامی اخلاق کی طبیعت، مصادر اور ارکان، اخلاقی تربیت میں اسلامی امتیازات اور اس کے وسائل و اسباب پر بحث کی گئی ہے، جبکہ "سیرتِ نبویہ" کے عنوان کے تحت ولادت سے لے کر وفات تک سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔

دوسری جلد سے اصل کتاب کا آغاز ہوتا ہے، اخلاق کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے آٹھ جلدوں میں "الصفات المستحبۃ" اور تین جلدوں میں "الصفات المذمومۃ" حروفِ تہجی کے اعتبار سے بیان کی گئی ہیں جبکہ بارہویں جلد مختلف فہارس پر مشتمل ہے۔

کتاب کا انداز یہ ہے کہ اولاً کسی بھی خلق کے عنوان کے تحت اس کے لغوی اور اصطلاحی معنی بیان کیے جاتے ہیں ثانیاً قرآن کریم کی جتنی بھی آیات میں اس کا مادہ آیا ہو وہ آیات

درج کی جاتی ہیں، ثالثاً جن احادیث میں صراحۃً اس خلق کا ذکر ہو وہ احادیث باحوالہ نقل کی جاتی ہیں، رابعاً وہ احادیث لائی جاتی ہیں جن میں اشارۃً اس خلق کا ذکر ہو، خامساً جانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ سے اس خلق کی مناسبت سے کوئی ایک یا چند واقعات لائے جاتے ہیں، سادساً زیر بحث خلق کے بارے میں صحابہ کرام، محدثین، مفسرین، صوفیاء اور اولیاء کے اقوال نقل کیے جاتے ہیں، سابعاً اگر خلق حسن ہو تو اس کے فوائد اور اگر خلق قبیح ہو تو اس کے نقصانات بیان کیے جاتے ہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد دل میں یہ داعیہ شدت سے پیدا ہوا کہ کاش اردو میں اس کا ترجمہ ہو جائے۔ بعض مالدار کتب خانوں کے مالکان کو بھی اس کارِ خیر کی طرف متوجہ کیا مگر کسی نے بھی ہیرے جواہرات سے بھری اس کان کا بار اپنے کندھوں پر لینے کی جرأت نہ کی۔

غالباً تین سال پہلے روزنامہ اسلام کی انتظامیہ نے مجھے ''خواتین کا اسلام'' کے لیے ''درسِ قرآن وحدیث'' لکھنے کے لیے کہا اور میں نے اس پر آمادگی ظاہر کردی، بظاہر تو میں نے ان کی چاہت پر حامی بھری تھی لیکن حقیقت میں مجھے اس پرانی آرزو کی تکمیل ہوتی دکھائی دے رہی تھی کہ کسی طرح ''نضرۃ النعیم'' کے مضامین سے اردو دان طبقے کے لیے بھی استفادہ آسان ہو جائے، ظاہر ہے پوری کتاب کا ترجمہ نہ تو میرے جیسے کمزور انسان کے لیے ممکن تھا اور نہ ہی ایک چھوٹا سا ہفت روزہ اس کی اشاعت کا بوجھ برداشت کرسکتا تھا، میں نے اپنے اعذار اور مصروفیات کے پیش نظر اس کتاب کے علمی، اصلاحی اور اخلاقی مضامین کی تلخیص کا فیصلہ کیا۔

میں یہ کرتا کہ ہر ہفتے کسی ایک عنوان کا مطالعہ کرتا اور اسکا خلاصہ اپنے الفاظ میں قارئین اور قاریات کے سامنے بیان کر دیتا، اس سلسلۂ مضامین کو باری تعالیٰ نے بے حد مقبولیت سے نوازا، گھروں اور محفلوں میں اسے اجتماعی طور پر پڑھا گیا، بعض خطباء نے اطلاع دی کہ وہ اس کا درس بھی دیتے ہیں اور خطبۂ جمعہ بھی اس کی بنیاد پر تیار کرتے ہیں،

متعدد حضرات وخواتین نے کتابی شکل میں ان مضامین کی اشاعت پر اصرار کیا چنانچہ اللہ کے بھروسے پر ان کی اشاعت کا فیصلہ کرلیا گیا۔

عزیزم مولوی محمد اسامہ سروار نوی سلمہ اللہ نے ان تمام مضامین پر نظر ثانی کی، حتی الامکان حوالہ جات کی تخریج کا اہتمام کیا، کمپوزنگ کے بعد باریک بینی سے پروف ریڈنگ کی اور اب یہ کتاب اس اُمید پر اپنے کرم فرماؤں کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے کہ وہ اس سے استفادہ کا حق ادا کریں گے۔

کتاب کے مطالعہ سے پیشتر قارئین اس نکتے کو خاص طور پر ذہن میں رکھیں کہ ہمارے آقا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو نبوت ملنے سے پہلے بھی اور نبوت ملنے کے بعد بھی آپ کے اعلیٰ اخلاق تھے، جس ہستی کے لیے خود خالق کائنات نے ﴿ وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ﴾ کی گواہی دی ہو اس کی بلندیٔ اخلاق کا ہم تو صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔

آپ خود بھی اخلاقِ عظیمہ کے مالک تھے اور اپنی اُمت کو بھی ان سے متصف دیکھنا پسند فرماتے تھے، اسی لیے آپ نے اخلاقِ حسنہ پر جتنا زور دیا ہے اتنا کسی دوسرے شعبے پر زور نہیں دیا، ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا مقصد ہی اچھے اخلاق کی تکمیل کو قرار دیا ہے، ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: " إنما بعثت لاتمم صالح الاخلاق " "مجھے نیک اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے۔"

صحیح بخاری میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مؤمنوں میں سے سب سے کامل ایمان والا وہ شخص ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔"

حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: "قیامت کے دن مؤمن کے نامہ اعمال میں اچھے اخلاق سے زیادہ

وزنی چیز کوئی نہیں ہوگی۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "مؤمن اچھے اخلاق کی بدولت روزے دار اور شب بیدار کا درجہ پالیتا ہے۔"

ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مثالی زندگی اور اخلاق کے بارے میں مؤثر اور مؤکد ہدایات، دوسری طرف آج کے مسلمانوں کی اخلاقی پستی اور زوال، حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں ذرا بھی مناسبت نہیں، بجا طور پر ہماری خواہش ہے کہ مسلمان پوری دنیا پر غالب آئیں اور انہیں عزت کی نظر سے دیکھا جائے لیکن جب تک وہ اپنے آپ کو اخلاقِ عالیہ سے متصف نہیں کریں گے ایسا ہونا ممکن نہیں دکھائی دیتا۔

معاشی خوشحالی، سیاسی استحکام اور عسکری ترقی سب اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں، مگر ناچیز کی نظر میں بین الاقوامی دنیا میں اپنا مقام بنانے اور اشاعتِ اسلام کی رفتار تیز تر کرنے میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ اپنے کردار واخلاق اور معاملات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اگر یہ کتاب اپنے قارئین کے دل میں اسلامی اخلاق کی اہمیت پیدا کرنے میں کامیاب ہوجائے تو اس کا مؤلف سمجھے گا کہ اس کی محنت ٹھکانے لگ گئی۔

آخر میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ کتاب من وعن "نضرۃ النعیم" کے مضامین کا ترجمہ یا خلاصہ نہیں اور ایسا کرنا ممکن بھی نہ تھا بلکہ اس کے موضوعات کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش ہے، کم وبیش بیس مضامین ایسے ہیں جو نضرۃ النعیم سے نہیں لیے گئے بلکہ کتاب وسنت کی روشنی میں اَز خود لکھے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس حقیر سی کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور اپنے بندوں کے لیے نافع بنائے۔ (آمین)

محتاجِ دعا
محمد اسلم شیخوپوری

اِتباع

لغت میں ''اتباع'' کا معنی ہے کسی کے پیچھے پیچھے اور نقشِ قدم پر چلنا، جبکہ اصطلاح میں اتباع کا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول اور ثابت ہے اس کی اتباع کرنا اور اس کے مطابق زندگی گزارنا۔

(لسان العرب لابن منظور : ١/٤١٦، ٤١٩)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور تقریرات، سنت اور دین کا حصہ ہیں، تقریرات سے مراد وہ اعمال ہیں جو آپ کے سامنے کیے گئے مگر آپ نے ان کے کرنے سے منع نہیں فرمایا۔ سنت کی اتباع، اللہ کا محبّ ہونے کی دلیل بھی ہے اور محبوب ہونے کی نشانی بھی۔ حضرت سہل بن عبداللہ رحمہ اللہ کا قول ہے: ''اللہ کی محبت کی علامت قرآن کی محبت ہے، قرآن کی محبت کی علامت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی علامت سنت کی محبت ہے اور ان سب کی محبت کی علامت آخرت کی محبت ہے یعنی جو شخص دنیا کے مقابلے میں آخرت سے محبت کرتا ہے وہ اللہ، قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سب سے محبت کرتا ہے۔ (تفسیر قرطبی : ٤/٤٠)

سورۂ آل عمران میں ہے ''اے پیغمبر! فرمادیجئے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، تم سے اللہ محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور اللہ بہت معاف کرنے والا بے حد مہربان ہے۔'' (سورۃ آل عمران : ٣١)

اس آیت کریمہ کو ''آیتِ محبت'' بھی کہا جاتا ہے، یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب بعض نصاریٰ نے محبتِ الٰہیہ کا دعویٰ کیا، ان سے کہا گیا کہ اگر واقعی تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو اس کا ثبوت بھی پیش کرو اور محبت الٰہیہ کا سب سے بڑا ثبوت اور واضح نشانی خاتم النبیین

صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ اس آیت کے حوالے سے فرماتے ہیں: ”اللہ عزوجل کی محبت، حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔

(مدارج السالکین: ۲۲/۳)

عام انسان تو رہے ایک طرف، اگر بالفرض ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ونبوت کے بعد کوئی نبی بھی آجائے تو اسے بھی آپ ہی کی اتباع کرنی پڑے گی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ایک موقع پر تورات کے چند اوراق دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سخت غصہ میں آگئے تھے اور آپ نے فرمایا: ”اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر (صاحبِ تورات) موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو انہیں میری اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا۔ (مسند احمد: ۳۸۷/۳)

آج کا دور چونکہ فتنوں کا دور ہے اس لیے اندھیری رات کے شیاطین کی طرح آئے دن نئے نئے فتنے پیدا ہوتے رہتے ہیں، ان میں سے ایک خطرناک فتنہ منکرینِ حدیث کا بھی ہے، جن کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم صرف ان احکام کی اتباع کرتے ہیں جو قرآن سے ثابت ہیں باقی رہی حدیث تو ہم اس کی اتباع کے مکلف نہیں ہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ ہی میں اس فتنہ کی نشاندہی فرمادی تھی، حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں تم میں سے کسی کو قرآن پر (متکبرانہ انداز میں) ٹیک لگائے ہوئے نہ پاؤں کہ اس کے پاس میری کوئی ایسی حدیث پہنچے جس میں میں نے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیا ہو مگر وہ یہ کہے کہ ہم اسے نہیں جانتے ہم تو بس اسی کی اتباع کریں گے جو ہم نے کتاب اللہ میں پایا۔“ (ابوداؤد: ۴۶۰۵)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کوئی معمولی چیز نہیں ہے، یہ تو حقیقت میں دخولِ جنت

کے استحقاق اور اس سے محروم رہنے کا معیار ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری ساری امت جنت میں داخل ہوگی سوائے اس شخص کے جس نے انکار کیا، عرض کیا گیا یارسول اللہ! انکار کرنے والے سے کون مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: جس نے میری اتباع کی وہ جنت مس داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی وہ انکار کرنے والا ہے۔'' (صحيح بخارى : ۷۲۸۰)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی نیت سے اگر شادی بیاہ کیا جائے، بہتر غذا کھائی جائے تو ثواب ملتا ہے اور اگر آپ کی اتباع کو چھوڑ کر عبادت بھی کی جائے تو انسان اللہ کی رضا سے محروم رہتا ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات سے آپ کی خفیہ عبادت اور معمولات کے بارے میں سوال کیا، پھر ان میں سے ایک نے عزم کیا کہ میں کسی عورت سے شادی نہیں کروں گا، دوسرے نے کہا میں کبھی گوشت نہیں کھاؤں گا، تیسرے نے کہا میں بستر پر نہیں سوؤں گا، (آپ کو ان تینوں کے عزائم کے بارے میں اطلاع ملی تو آپ تشریف لائے) اللہ کی حمد وثنا بیان کرنے کے بعد فرمایا: ''لوگوں کو کیا ہوگیا ہے جو وہ اس طرح کی باتیں سوچتے ہیں، جہاں تک میرا تعلق ہے میں نماز بھی پڑھتا ہوں، سوتا بھی ہوں، روزے بھی رکھتا ہوں، افطار بھی کرتا ہوں، عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں (ان کے حقوق بھی ادا کرتا ہوں! یہی میری سنت ہے) پس جو میرے سنت سے اعراض کرے گا اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔'' (صحيح مسلم : ۱۴۰۱)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا ایسا جذبہ پایا جاتا تھا جس کی مثال پیش کرنے سے تاریخِ عالم قاصر ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ

عنہما سے روایت ہے کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی انگوٹھی بنوائی (آپ کو دیکھ کر) لوگوں نے بھی سونے کی انگوٹھیاں بنوالیں، آپ نے فرمایا: میں نے سونے کی انگوٹھی یقیناً بنوائی تھی مگر آج کے بعد میں اسے کبھی نہیں پہنوں گا، یہ فرماتے ہوئے آپ نے وہ انگوٹھی پھینک دی، آپ کی دیکھا دیکھی صحابہ نے بھی انگوٹھیاں پھینک دیں۔

(صحیح بخاری: ۷۲۹۸)

بعض اوقات ایک بات ان کی طبیعت کے خلاف بھی ہوتی تھی تب بھی وہ اپنے عظیم آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ضرور کرتے تھے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ حجرِ اسود کے پاس آئے، اسے بوسہ دیا اور فرمایا میں خوب جانتا ہوں تو ایک پتھر ہے نہ نقصان دے سکتا ہے اور نہ نفع دے سکتا ہے (مجھے بتوں کی وجہ سے پتھروں سے ایسی نفرت ہوگئی ہے کہ) اگر میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے بوسہ نہ دیتا۔ (صحیح بخاری: ۱۵۹۷)

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی کام کا پختہ ارادہ فرمالیا کرتے تھے لیکن جب انہیں بتایا جاتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام نہیں کیا تو وہ رک جاتے تھے۔ (اغاثة اللهفان: ۱/۱۳۶)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جو مقامات اور مراتب حاصل ہوئے وہ اتباع کی برکت سے حاصل ہوئے، اب بھی اگر کسی کو اللہ کا قرب، محبت، معرفت اور رضا حاصل ہوسکتی ہے تو وہ اتباع کی برکت ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔ عوام کے ذہنوں میں مرتبۂ ولایت کے بارے میں نہ معلوم کیا کیا تصورات ہیں بالخصوص کرامات کو تو ولایت کا لازمی جزء سمجھا جاتا ہے بلکہ ہمارے اسلاف صرف اسے ولی اللہ سمجھتے تھے جو کتاب وسنت کی اتباع میں کامل ہوتا تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ "اگر تم کسی صاحبِ کرامات کو ہوا میں بھی اڑتا ہوا دیکھ لو تو اس کے بارے

میں دھوکا نہ کھاؤ جب تک تم یہ نہ دیکھ لو کہ شریعت کے امر و نہی اور حدود کی حفاظت میں اس کا رویہ کیسا ہے۔" (إغاثة اللّهفان لابن قیم : ۱/۱۲٤)

آیئے! ہم زندگی کے ہر شعبے میں سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا عہد کریں کہ اسی اتباع میں دنیا و آخرت کی سعادت ہے، قبولِ توبہ اور ہدایت ہے، خطا اور ضلالت سے سلامتی کی ضمانت ہے، اللہ کی رضا، مغفرت اور رحمت ہے۔

اِبتہال

ابتہال کا معنی ہے اللہ کے سامنے گڑگڑانا، تضرّع اور عاجزی کرنا، اللہ کی طرف متوجہ ہوکر خوب دعا کرنا، ابتہال ہی سے مباہلہ بھی ہے، (المفردات فی غرائب القرآن : ۶۳) مباہلہ میں یہی ہوتا ہے کہ دوفریق اللہ کی طرف متوجہ ہوکر دعاء کرتے ہیں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہے اس پر اللہ کی لعنت ہے، جب نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد جو کہ ساٹھ افراد پر مشتمل تھا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بحث مباحثہ کیا، آپ نے اس وفد کے شرکاء کا عقیدۂ توحید اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حقیقی مقام سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اعترافِ حق پر آمادہ نہ ہوئے، تب آپ نے اللہ کے حکم سے انہیں مباہلہ کی دعوت دی اور فرمایا: ''آپ ان سے کہہ دیجئے کہ آؤ! ہم اپنے بیٹوں کو اور تم اپنے بیٹوں کو، ہم اپنی عورتوں اور اور تم اپنی عورتوں کو، ہم اپنے آپ کو اور تم اپنے آپ کو لے آؤ پھر ہم خوب خشوع اور عاجزی سے اللہ سے دعاء کریں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہے اس پر اللہ کی لعنت ہے۔ (آلِ عمران : ۶۱)

چونکہ یہ لوگ دل سے حقیقت کو جان تو چکے تھے مگر زبان سے تسلیم کرنے میں انہیں اپنی عزّت اور وجاہت اور سیادت وقیادت کی موت دکھائی دیتی تھی، اس لیے وہ مباہلہ کے لیے تو تیار نہ ہوئے، البتہ سالانہ جزیہ دینے پر راضی ہوگئے، لیکن ہمیں اس وقت مباہلہ کی حقیقت کے بارے میں بحث نہیں کرنی بلکہ ''ابتہال'' جو کہ ایک اہم ایمانی صفت اور اہلِ ایمان وتقویٰ کی خاص نشانی ہے، اس کے بارے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں چند گزارشات پیش کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنے مخصوص بندوں کی جو امتیازی

صفات بیان فرمائی ہیں ان میں سے ایک صفت ''ابتہال'' بھی ہے یعنی وہ رب ذوالجلال کے سامنے روتے، گڑگڑاتے اور تضرع کے ساتھ دعائیں کرتے ہیں۔

سورۂ اسراء میں ہے:

''جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے جب وہ ان کو پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار پاک ہے بے شک ہمارے پروردگار کا وعدہ پورا ہو کر رہا اور وہ ٹھوڑیوں کے بل گر جاتے ہیں اور روتے جاتے ہیں اور اس سے ان میں اور زیادہ عاجزی پیدا ہوتی ہے۔''

(سورۂ بني إسرائيل: ۱۰۷-۱۰۹)

سورۂ سجدہ میں ہے:

''ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں اور وہ اپنے پروردگار کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں اور جو مال ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

(سورۂ سجده : ۱٦)

احکم الحاکمین کے سامنے ابتہال، تضرّع، عاجزی، لاچاری، محتاجی اور مسکینی کا اظہار عبدیت ہے اور انسان کی تخلیق کا مقصد جو خود اسے پیدا کرنے والے نے بتایا ہے وہ عبدیت اور عبادت ہے، بندوں کے مقامات میں سے سب سے بلند مقام عبدیت ہی ہے، اسی کی وجہ سے بندے کو فضل وشرف حاصل ہوتا ہے۔

ہمارے آقا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساری مخلوقات اور کائنات میں سب سے فائق تھے، یوں تو آپ کی پوری زندگی اور زندگی کا ہر عمل اپنے اندر عبدیت کی شان لیے ہوئے تھے مگر آپ کی دعائیں خاص طور پر عبدیت کا شاہکار تھیں، دعا کرتے ہوئے آپ پر ''ابتہال'' کی ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی، آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے، لب

کپکپانے لگتے، جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے، ہاتھ آسمان کی طرف اٹھ جاتے اور پھر اٹھتے ہی چلے جاتے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعاء میں دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے دیکھا یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی دکھائی دینے لگی۔'' (صحيح مسلم : ٨٩٥)

غزوۂ بدر کا وہ منظر مطالعۂ سیرت کرنے والے ہر مسلمان کو یاد ہے جب ایک طرف مشرکین کے ایک ہزار جنگجو تھے تو دوسری طرف تین سو تیرہ بے سروسامان مسلمان تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ رخ ہو کر اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے اور یہ دعاء مانگنے لگے: ''اے اللہ! جو تو نے وعدہ کیا تھا وہ پورا فرما، اے اللہ! جو کچھ دینے کا تو نے وعدہ کیا تھا وہ عطا فرما، اے اللہ! اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہو گئی تو تیری عبادت کرنے والا کوئی بھی باقی نہیں رہے گا۔''

(صحيح مسلم : ١٧٦٣)

یہ دعاء کرتے ہوئے آپ پر ''ابتہال'' کی کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ آپ کے کندھے سے چادر گر گئی (اور آپ کو خبر بھی نہ ہوئی) حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آئے اور انہوں نے چادر اٹھا کر شانۂ مبارک پر ڈالی اور پیچھے سے لپٹ کر عرض کیا: یا نبی اللہ! اتنی ہی دعاء کافی ہے، بے شک اللہ نے آپ سے جو وعدہ کیا ہے وہ اسے پورا فرمائے گا۔''

(صحيح بخاري : ٣٩٥٣)

آپ کی وہ دعاء بھی بڑی عجیب تھی جب آپ نے اپنی امت کو یاد کرتے ہوئے بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ اٹھائے اور یہ عرض کرتے ہوئے آپ رو پڑے: ''اے اللہ! میری امت پر رحم فرما، میری امت پر رحم فرما، اللہ عزوجل نے (سب کچھ جانتے ہوئے بھی) جبریل سے کہا

جاؤ! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھو کہ آپ کیوں رو رہے ہیں، جبریل نے حاضرِ خدمت ہوکر سوال کیا آپ نے (امت کے بارے میں اپنی فکرمندی کے بارے میں) انہیں آگاہ کیا، تو اللہ نے فرمایا ''اے جبریل جاؤ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں اور میرا یہ پیغام پہنچادو کہ ''ہم آپ کو آپ کی امت کے بارے میں خوش کردیں گے اور آپ کو پریشان نہیں ہونے دیں گے۔'' (صحیح مسلم: ۲۰۲)

یونہی آپ کی ہر دعاء ''ابتہال'' یقین ورضا اور عجز وفنائیت کی صفات کی حامل ہوتی تھی، بسا اوقات جب آپ سحر کے مبارک وقت میں مصروف دعاء ہوتے تھے تو آپ کے سینے سے رونے کی گھٹی گھٹی آواز یوں نکلتی تھی جیسے آگ پر ہنڈیا کے ابلنے کی آواز ہوتی ہے۔

''ابتہال'' سے غم اور پریشانی دور ہوجاتی ہے، اللہ کی نصرت نازل ہوتی ہے، اس کی رحمتیں ہم دوشِ سفر ہوجاتی ہیں، دل کا تزکیہ ہوتا ہے اور نفس کو راحت حاصل ہوتی ہے، دعائیں قبول ہوتی ہیں اور بندے اور خدا کا تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوجاتا ہے۔

مسلمان کی شان یہ ہے کہ اولاً تو ہمہ وقت ہی اس پر ابتہال اور توجہ الی اللہ کی کیفیت طاری رہے ورنہ بوقتِ دعاء ابتہال بہرحال ضروری ہے، وہ دعائیں جو ڈھلمل یقین، تغافل، کاہلی، بے نیازی اور عدمِ توجہ کے ساتھ کی جاتی ہیں وہ قبولیت اور اجابت سے محروم رہتی ہیں۔

اِجتماعیت

اِسلام اِجتماعیت کا دین ہے، اس کے تقاضے اور احکام جنگلات کے گوشوں اور پہاڑوں کی غاروں میں پورے نہیں ہوسکتے، انہیں رو بہ عمل لانے کے لئے اجتماعیت کی ضرورت ہے، نماز روزہ ہو یا حج اور زکوٰۃ، جمعہ اور عیدین ہوں یا جہاد اور حدودِ شرعیہ کا نفاذ، ان سب کے اندر کسی نہ کسی انداز میں اجتماعیت کارفرما ہے، اجتماعیت، مسلمانوں میں باہمی الفت ومحبت پیدا کرتی ہے، اجتماعیت کی وجہ سے دشمنانِ اسلام کے دلوں میں خوف پیدا ہوتا ہے اور وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف قدم اٹھاتے ہوئے سو بار سوچتے ہیں، اجتماعیت اخلاقِ فاضلہ پیدا کرنے کے مؤثر وسائل میں سے ہے کیونکہ انسان کی فطرت ایسی ہے کہ وہ دوسروں کا اثر قبول کرتا ہے۔ جب وہ امت کے ساتھ جڑ کر رہے گا، اس کے اجتماعی معاملات میں دلچسپی لے گا، اجتماعات اور مجالس میں آنا جانا رکھے گا تو صلحاء اور صاحبِ اخلاق مسلمانوں کے اثرات ضرور قبول کرے گا اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرے گا، اجتماعیت کی وجہ سے بے چینی، پریشانی اور وساوس جیسے نفسیاتی امراض سے نجات حاصل ہوتی ہے کیونکہ متعدد بیماریاں ایسی ہیں جو الگ تھلگ اور کٹ کر رہنے کی وجہ سے جنم لیتی ہیں۔ بالخصوص انسان کو جب یہ احساس ہو کہ میرے ہم مذہب بھائی مجھے مشکل اور پریشانی میں اکیلا نہیں چھوڑیں گے تو یہ احساس اسے اندرونی طور پر مضبوط کردے گا، اجتماعیت کی وجہ سے انسان شیطانی حملوں سے بھی محفوظ رہتا ہے کیونکہ ”خانۂ خالی را دیومی گیرد“ (ویران گھر پر شیطان قبضہ جمالیتا ہے) جبکہ جماعت کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ملامت کے ڈر سے یا نیک دوستوں کی صحبت کے زیرِ اثر برائی سے حفاظت ہوجاتی ہے، اجتماعیت کی وجہ سے لحہ بہ لحہ فرد اور معاشرہ بلکہ پورے عالمِ اسلام کو نئی قوت حاصل ہوسکتی ہے، اجتماعیت کی

برکت سے اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اجتماعیت اختیار کرنے اور تفرقہ اور اختلاف سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہے: ''سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور فرقہ فرقہ نہ ہو جاؤ اور اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو جب تم دشمن تھے پھر اس نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی پس تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے۔'' (آلِ عمران : ۱۰۳)

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب پورا خطۂ عرب حالتِ جنگ میں تھا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے برسرِ پیکار تھا، ہر شخص کی کسی نہ کسی سے دشمنی تھی، مکان اور زمین کی طرح اولاد کو جنگ اور دشمنی بھی وراثت میں ملتی تھی، ایک ایک جنگ سالہا سال تک جاری رہتی تھی، انتقام در انتقام کا سلسلہ رکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا، قریب تھا کہ انسان آپس ہی میں لڑ لڑ کر ختم ہو جاتا کہ اللہ نے اپنی حسین ترین مخلوق کو بچانے کے لئے رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک برق صفت کتاب دے کر بھیج دیا، اسی کتاب نے ۲۳ سال کے مختصر عرصہ میں جزیرۃ العرب کی کایا پلٹ دی، سینے بغض وحسد سے پاک ہو گئے، محبت اور پیار کی مبارک ہواؤں نے ہر چھوٹے بڑے کو مست کر دیا، کل کے دشمن آج کے دوست اور کل کے ڈاکو آج کے محافظ اور امین بن گئے، ایسا انقلاب آیا کہ چشمِ فلک نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ خود رب تعالیٰ نے اس معجزانہ محبت والفت کا تذکرہ فرمایا ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے پیدا ہو گئی تھی۔

سورۂ انفال میں ہے: ''اور ان کے دلوں میں محبت ڈال دی اگر آپ وہ سب کچھ خرچ کر دیتے جو زمین میں ہے تو ان کے دلوں میں محبت نہیں ڈال سکتے تھے لیکن اللہ نے ان کے دلوں میں محبت پیدا فرما دی بے شک وہ غالب اور حکمت والا ہے۔''

(سورۃ الانفال : ٦٣)

قرآن کریم کے علاوہ مختلف احادیث میں بھی اجتماعیت پر زور دیا گیا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔'' (ترمذي: ٢١٦٦)

امت کی سطح کے علاوہ گھر، بستی اور محلے کی سطح پر بھی آپ نے اجتماعیت کی تاکید فرمائی ہے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''جس بستی یا گاؤں میں تین افراد ہوں مگر وہ مل کر نماز ادا نہ کریں تو ان پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے۔ پس تم جماعت کا اہتمام کیا کرو کیونکہ ریوڑ سے الگ ہو جانے والی بکری کو شیطان کھا جاتا ہے۔'' (ابو داؤد: ٥٤٧)

عام مشاہدہ بھی یہی ہے کہ جو شخص جماعت کے ساتھ جڑا رہتا ہے وہ گمراہ ہونے سے بچا رہتا ہے لیکن جو تفرّد کا عادی ہو جائے اور جماعت سے کٹ جائے وہ بہت جلد گمراہ فرقوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں یہ بات بھی بٹھا دی تھی کہ اجتماعیت کی وجہ سے رزق میں بھی برکت ہوتی ہے، چنانچہ وہ کھانے پینے میں بھی اجتماعیت کا اہتمام کرتے تھے۔ حضرت وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم کھاتے ہیں مگر سیر نہیں ہوتے، آپ نے فرمایا: لگتا ہے کہ تم الگ الگ کھاتے ہو، ہم نے تسلیم کیا کہ واقعی ایسا ہوتا ہے۔ تو آپ نے فرمایا: ''کھانا مل کر کھایا کرو اور اس پر اللہ کا نام ذکر کر لیا کرو تمہارے کھانے میں برکت ہوگی۔''

(ابن ماجه: ٣٢٨٦، ابو داؤد: ٣٧٦٤)

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بابرکت تعلیم کا تجربہ ہم میں سے ہر کسی کو ہوتا رہتا ہے کہ بسا اوقات مل کر کھانے سے تھوڑے سے کھانے میں اللہ تعالیٰ ایسی برکت پیدا فرما دیتا ہے کہ وہ بہت سارے افراد کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔

نماز جمعہ میں چونکہ مسلمانوں کی اجتماعیت کا خاص طور پر اظہار ہوتا ہے اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے چھوڑنے پر سخت وعید بیان فرمائی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر تشریف رکھتے ہوئے یہ فرماتے ہوئے سنا: ''لوگ جمعہ چھوڑنے سے باز آجائیں ورنہ اللہ ان کے دلوں پر مہر لگادے گا پھر وہ غافلوں میں سے ہوجائیں گے۔'' (صحيح بخاری : ٦٤٧)

امتِ اسلامیہ میں اجتماعیت کو پیدا کرنے اور باقی رکھنے کا مؤثر ترین نسخہ یہ ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کو مضبوطی سے تھامیں رکھیں اور کسی حال میں بھی ان کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔

مالک بن انس رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں، جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑے رکھو گے، ہرگز گمراہ نہیں ہوگے یعنی اللہ کی کتاب اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت۔''

(مؤطا امام مالك : ٨٩٩)

آج جو مسلمانوں میں انتشار اور افتراق دکھائی دیتا ہے تو دوسرے اسباب کے علاوہ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں نے کتاب اللہ اور سنتِ نبوی سے منہ پھیر لیا ہے۔

احتساب

اسلامی تعلیمات میں سے ایک اہم تعلیم ''احتساب'' کی بھی ہے اور یہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق میں سے ایک نمایاں خلق بھی ہے، ''احتساب'' کا لفظ پڑھتے اور سنتے ہی ہمارے ذہن میں محاسبہ کا معنی آتا ہے اور چونکہ ہم آئے دن اخبارات میں اقتدار سے محروم کیے جانے والے سیاست دانوں اور لیڈروں کے احتساب کے بارے میں اپنے حاضر ڈیوٹی حکمرانوں کے تہلکہ خیز بیانات پڑھتے رہتے ہیں اس لیے ہمارے ذہنوں میں ''احتساب'' محاسبہ اور گرفت کا معنی راسخ ہو چکا ہے جبکہ عربی زبان میں ''احتساب'' کے دو معنی زیادہ مشہور ہیں: شمار کرنا اور کافی ہو جانا۔ (مقاییس اللغة : ۶/۲) قرآن کریم کی آیت کا وہ مشہور ٹکڑا جسے وظیفہ کے طور پر بھی پڑھا جاتا ہے: ﴿حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل﴾ اس میں "حسبنا" کفایت ہی کے معنی میں ہے یعنی ''ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔'' (سورۂ آل عمران : ۱۷۳)

کتاب وسنت میں ''احتساب'' کا لفظ عام طور پر طلبِ اجر اور رضاءِ الٰہی کیلئے استعمال ہوتا ہے، کسی بھی عبادت اور نیک عمل میں صرف رضاءِ الٰہی کی نیت کرنا اور مصائب و امراض میں طلبِ اجر کی نیت سے صبر کرنا ''احتساب'' کہلاتا ہے۔ (النہایة لابن اثیر: ۴) قرآنِ کریم میں اگرچہ ''احتساب'' کا لفظ تو نہیں آیا ہے لیکن مذکورہ بالا مفہوم کو ادا کرنے والی آیات بے شمار ہیں مثال کے طور پر سورۂ رعد کی آیت 22 ہی کو لے لیجئے جس میں فرمایا گیا ہے:

''اور وہ لوگ جو اپنے رب کی رضا حاصل کرنے کے لیے صبر کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خفیہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں اور برائی کو اچھائی کے ساتھ دفع کرتے ہیں ان کے لیے آخرت کا اچھا انجام

ہے۔'' (سورۂ رعد: ۲۲)

کہا جاسکتا ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں ''احتساب'' کی تعلیم دی گئی ہے۔

یونہی سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہ جو حکم دیا ہے ''اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیجئے جنہیں جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں یقیناً ہم اللہ کے لئے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے خصوصی رحمتیں بھی نازل ہوتی ہیں اور عمومی رحمتیں بھی نازل ہوتی ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں'' تو یہاں بھی ''احتساب'' والوں ہی کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

(سورة البقرة: ۱۵۶، ۱۵۷)

حضرت قتادہ رحمہ اللہ سورۂ بقرہ کی مذکورہ آیات کے حوالے سے فرماتے تھے کہ ''جو شخص ایک مصیبت میں تین انعاماتِ الٰہی حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ''احتساب'' کے ذریعہ حاصل کرسکتا ہے یعنی خصوصی رحمت، عمومی رحمت اور ہدایت، کیونکہ اللہ تعالیٰ جو چیز اپنے ذمہ لے لیتا ہے وہ ضرور عطا کرتا ہے'' جب اس نے مصیبت اور پریشانی میں خالص اسی کی رضاء کے لیے صبر کرنے والوں کے ساتھ تین انعامات کا وعدہ کیا ہے تو یقیناً وہ یہ تین انعامات عطا کرے گا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ قرآن کریم میں ''احتساب'' کا لفظ صراحۃً نہیں آیا ہے، البتہ احادیث میں یہ لفظ بار بار آیا ہے۔ مسندِ احمد کی وہ مشہور روایت جو حضرت اُبی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، وہ آپ نے ضرور سنی ہوگی جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کیے ہیں جبکہ میں نے اس کے قیام کا حکم دیا ہے: '' فمن صامه وقامه احتساباً '' جو شخص رضاءِ الٰہی کے لیے اس کے روزے رکھے گا اور قیام کرے گا وہ گناہوں سے ایسے پاک ہو جائے گا جیسے اس دن پاک تھا جس دن اس کی

ماں نے اسے جنا تھا۔" (مسند أحمد : ۳/ ٦٦٠) اسی سے ملتے جلتے الفاظ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی اس روایت میں بھی ہیں جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

(بخاری : ۳۸، مسلم : ۷٦٠)

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے یہ حقیقت بھی سمجھ آ گئی ہوگی کہ احتساب کا تعلق ظاہر سے زیادہ باطن کے ساتھ ہے اور اس کا مفہوم اخلاص کے بہت قریب اور مشابہ ہے۔ "احتساب" کی وجہ سے ایسے مباح اعمال بھی عبادت بن جاتے ہیں جنہیں بظاہر انسان دنیوی ذمہ داری کے طور پر بجالاتا ہے، اہل وعیال کے نان نفقہ ہی کو لے لیجئے یہ ہر شخص کی شرعی، اخلاقی اور معاشرتی ذمہ داری ہے لیکن جب وہ اپنے بیوی بچوں پر ارشادِ باری تعالیٰ کی تعمیل اور رضاءِ الٰہی کے حصول کی خاطر خرچ کرتا ہے تو اس ازدواجی فریضہ کی ادائیگی کو بھی صدقہ اور نیکی شمار کیا جاتا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب مسلمان اپنے اہل وعیال پر "احتساب" (طلبِ ثواب کی نیت) سے خرچ کرتا ہے تو اس کے لیے صدقہ ہوتا ہے۔" (مسلم : ۱۰۰۲)

یہی حال مصائب اور حوادث کا ہے، جب کسی حادثہ یا مصیبت کے پیش آنے کی صورت میں کوئی شخص طلبِ ثواب کی نیت کر لیتا ہے تو بارگاہِ الوہیت سے اسے جنت کی بشارت سنائی جاتی ہے، ابن ماجہ میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ سبحانہ تعالیٰ فرماتا ہے، اے آدم کے بیٹے! اگر تو نے پہلے صدمہ کے وقت صبر کیا اور طلبِ ثواب کی نیت کی تو میں تیرے لیے جنت کے علاوہ کسی بدلے پر راضی نہیں ہوں گا۔" (ابن ماجہ : ۱۵۹۷)

اللہ کی طرف سے جو مصیبت آنے والی ہے، اسے انسان ٹال تو نہیں سکتا البتہ اگر وہ

رضا بالقضاء اور طلبِ ثواب کی نیت کر لے تو اس کے حق میں یہ مصیبت، رحمت اور راحت بن سکتی ہے۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب کسی کے بیٹے کا انتقال ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ فرشتوں سے سوال کرتا ہے کہ تم نے میرے بندے کے بیٹے کی روح قبض کر لی؟ وہ اثبات میں جواب دیتے ہیں، اللہ دوبارہ پوچھتا ہے کیا تم نے میرے بندے کے لختِ جگر کو موت دے دی؟ فرشتے عرض کرتے ہیں جی ہاں! پھر رب تعالیٰ دریافت فرماتا ہے: (جب تم نے ایسا کیا) میرا بندہ کیا کہہ رہا تھا؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ وہ آپ کی تعریف کر رہا تھا اور ''انا للہ'' پڑھ رہا تھا، اللہ فرماتے ہیں: ''میرے بندے کے لیے جنت میں ایک گھر تعمیر کر دو اور اس کا نام رکھ دو ''بیت الحمد'' (جامع ترمذی: ۱۰۲۱)

مختصر یہ کہ ''احتساب'' اللہ کی محبت اور رضا تک پہنچانے والا راستہ ہے، ایمان کے کمال اور اسلام کے حسن کی دلیل ہے، جنت کے حصول اور جہنم سے بچاؤ کا ذریعہ ہے، احتساب کی وجہ سے دارین کی سعادت حاصل ہوتی ہے، مصائب کا برداشت کرنا نہ صرف آسان ہو جاتا ہے بلکہ ان پر اجر و ثواب بھی حاصل ہوتا ہے، احتساب کی وجہ سے ریا سے بچاؤ ہو جاتا ہے اور پروردگار پر اعتماد اور اس کے ساتھ حسنِ ظن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اِحسان

عربی زبان میں احسان، اساءۃ (برائی) کی ضد ہے، (لسان العرب: ۱/۸۷۷) ایسا فعل جس سے کسی کو فائدہ ہوا سے احسان کہا جاتا ہے۔ مثلاً بھوکے کو کھانا کھلانا، پیاسے کو پانی پلانا، بھولے بھٹکے کو راہ دکھانا، مظلوم کی مدد کرنا، ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنا، گمراہ کو سیدھی راہ پر لگانا، جاہل کو علم سکھانا، مقروض کو مہلت دینا، مجبور کو معاف کر دینا۔ یہ سب احسان ہی کی صورتیں ہیں۔

اصطلاح میں احسان کا لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی کا تعین موقع محل کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ بخاری اور مسلم میں ایک مشہور حدیث ہے جسے ''حدیثِ جبریل'' کہا جاتا ہے، اس میں آتا ہے کہ ایک موقع پر حضرت جبرئیل علیہ السلام انسانی شکل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے صحابہ کی تعلیم اور افادہ کی غرض سے آپ سے مختلف سوالات کئے، ان میں سے ایک سوال احسان کی حقیقت کے بارے میں بھی تھا، آپ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ ''تم اللہ کی عبادت اس تصور کے ساتھ کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر تم یہ تصور قائم نہیں کر سکتے تو یہ یقین رکھو کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' (مسلم ، كتاب الإيمان : ۲۹ ، بخاري ، كتاب الايمان : ۱۲)

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ احسان کا یہ مرتبہ ایمان کا خلاصہ، اس کی روح اور اس کا کمال ہے احسان کے باقی سارے مراتب اس میں آجاتے ہیں، اور اس مرتبہ کی جزاء اور بدلہ جنت کے سوا کچھ نہیں ہے، سورۂ رحمان میں ہے: ﴿ هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ ﴾ ''احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ نہیں۔'' (نظرة النعيم : ۲/ ۷۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیتِ کریمہ میں پہلے احسان سے مراد " لا إله إلا الله " اور دوسرے احسان سے مراد جنت ہے اور اس کا

مطلب یہ ہے کہ جو شخص لا الہ الا اللہ کہے اور جو شریعت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے اس کا بدلہ جنت کے سوا کچھ نہیں۔ (قرطبی: ۳۵/۱۷)

ایک روایت میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ آیت پڑھی اور پھر صحابہ سے پوچھا کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے رب نے کیا کہا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ اس آیت میں تمہارے رب نے یہ فرمایا ہے کہ ”جس شخص پر میں توحید کی صورت میں انعام کروں اس کا بدلہ جنت کے سوا کچھ نہیں۔“ (بحوالہ نضرۃ النعیم: ۷۲/۲)

اس حدیث میں اللہ عز وجل کے ساتھ کمالِ حضور، کمالِ محبت ومعرفت اور کمالِ اخلاص کا معاملہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

صوفیاءِ کرام احسان کو سلوک وتصوف کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں کیونکہ سلوک وتصوف کی روح یہ ہے کہ بندۂ مومن کے دل میں اللہ کے حاضر وناظر ہونے کا یقین پیدا ہو جائے، جس انسان کے دل میں اللہ کے حاضر وناظر ہونے کا یقین اور اس کی محبت و معرفت پیدا ہو جائے گی وہ جو عمل بھی کرے گا اچھے طریقے سے کرے گا، اس کی نماز اس کا روزہ، اس کی دعوت وتبلیغ، اس کا جہاد، اس کی تجارت وسیاست اور اخلاق ومعاملات میں اس کی جھلک دکھائی دے گی، وہ کسی کا حق نہیں دبائے گا، دوسروں کا دل نہیں دکھائے گا، کمزوروں پر ستم نہیں ڈھائے گا بلکہ یوں بھی ہوگا کہ وہ دوسروں کو ان کے حق سے زائد دے گا، یہی چیز احسان کو عدل پر فوقیت دلاتی ہے، عدل یہ ہے کہ اپنا حق پورا پورا وصول کر لیا جائے اور دوسروں کا حق انہیں پورا پورا دے دیا جائے جبکہ احسان یہ ہے کہ اپنے حق سے کم وصول کیا جائے اور دوسروں کو ان کے حق سے زائد دیا جائے، عدل واجب ہے اور احسان مستحب ہے، قرآن کریم میں دونوں کا حکم دیا گیا ہے، سورۂ نحل میں ہے: ”بے شک اللہ عدل

اور احسان کا حکم دیتا ہے۔" (سورۂ نحل : ۹۰)

یہ وہ آیتِ کریمہ ہے جو جمعہ کے دن ہر خطیب خطبہ جمعہ میں تلاوت کرتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دور سے ایسا ہو رہا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ایک روایت منقول ہے جس کے مطابق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کو سارے اخلاق میں سے بہترین خلق قرار دیا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا: "کیا میں تمہیں دنیا اور آخرت کے اخلاق میں سے سب سے بہترین خلق کے بارے میں نہ بتاؤں؟ جو تم سے توڑے تم اس سے جوڑو، جو تمہیں محروم رکھے، تم اسے دو اور یہی احسان ہے۔" (محاور الخمسة: ۱۹۲)

جب ہم ان آیاتِ کریمہ اور احادیثِ شریفہ میں غور و فکر کرتے ہیں جو احسان کے بارے میں آئی ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ احسان کا دائرہ انسان کی اپنی ذات، قوم، قبیلہ سے لے کر پورے معاشرہ اور ساری انسانیت تک پھیلا ہوا ہے:

- احسان کا پہلا دائرہ جس میں انسان کی اپنی ذات آتی ہے وہ عبادت کے اخلاص اور طاعت کے کمال کو شامل ہے۔ سورۂ اسراء میں ہے: "اگر تم احسان کرو گے تو اپنی جانوں کے لئے کرو گے اور اگر برائی کرو گے تو اس کا وبال بھی تمہاری ہی جانوں پر ہوگا۔"

(سورة الاسراء : ۷)

- احسان کا دوسرا دائرہ والدین کو شامل ہے، سورۂ اسراء ہی میں ہے: "اور تمہارے رب نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو۔"

(سورة الاسراء : ۲۳)

- تیسرا دائرہ تمام قرابت داروں کو شامل ہے۔ (ملاحظہ کیجئے سورہ بقرہ آیت ۸۳)
- چوتھے دائرے میں وہ معاشرہ آجاتا ہے جس میں انسان زندگی گزارتا ہے،

یتامیٰ، مساکین، مسافر، ہم سفر، ہم درس، لونڈیاں اور غلام سب ہی اس میں شامل ہیں۔

(مطالعہ فرمایئے سورۃ نساء آیت ۳۶)

- پانچویں دائرے میں مخالف اور دشمن آجاتے ہیں، سورہ مائدہ آیت ۱۳ میں دشمنوں کو معاف کرنے اور ان سے درگزر کرنے کا حکم دینے کے بعد ارشاد ہوتا ہے ''بے شک اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے''۔
- چھٹے دائرے میں زندگی کے ہر شعبے اور اس کائنات کی ہر چیز کو شامل کیا جاسکتا ہے، اس میں تعمیرات بھی آجائیں گی اور ماحولیات بھی، حیوانات بھی اور نباتات بھی، راستے بھی آجائیں گے اور گلی کوچے بھی، اس سلسلہ میں ہمیں صحیح مسلم کی وہ حدیث پیش نظر رکھنی ہوگی جو حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو باتیں خاص طور پر یاد رکھی ہیں آپ نے فرمایا: ''بے شک اللہ نے ہر چیز مین احسان فرض کیا ہے، جب تم (قصاص یا جہاد کے موقع پر) قتل کرو تو اچھی طرح سے قتل کرو اور جب تم جانور کو ذبح کرو تو اچھی طرح سے ذبح کرو، تمہیں چاہئے کہ چھری تیز کرلیا کرو اور اپنے ذبیحہ کو راحت پہنچاؤ۔'' (مسلم: ۱۹۵۵)

مذکورہ بالا گزارشات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ احسان ایک ایسی صفت ہے جس کا تعلق ظاہر سے باطن تک، فرد سے معاشرہ تک اور انسانوں سے حیوانوں تک ہر چیز اور ہر شعبے کے ساتھ ہے احسان عقیدہ میں بھی ضروری ہے اور عبادت میں بھی، تجارت میں بھی ضروری ہے اور سیاست میں بھی، صنعت وحرفت میں بھی ضروری ہے اور کاروبارِ سلطنت میں بھی، احسان اعزاء واقارب کے ساتھ بھی لازم ہے اور مسافروں، یتیموں، مسکینوں، پڑوسیوں، دوستوں بلکہ دشمنوں کے ساتھ بھی، انسانوں کے ساتھ بھی لازم ہے

اُخوت

اخوت، محبت اور بھائی چارے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، عربی زبان میں ''اخ'' بھائی کو کہا جاتا ہے، قرآن کریم میں اس لفظ کا اطلاق پانچ مواقع پر ہوا ہے:

۱۔ اس فرد پر جو ماں اور باپ دونوں میں یا ان میں سے کسی ایک میں شریک ہو، سورۂ نساء میں میراث کے احکام اور سورۂ مائدہ میں ہابیل اور قابیل کا قصہ بیان کرتے ہوئے یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

۲۔ ایک قوم اور قبیلہ کے افراد کو بھی آپس میں بھائی بھائی کہا جاتا ہے۔ حضرت ہود، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام کے بارے میں قرآن میں جو آتا ہے کہ ان (کی قوم کی طرف ان) کے بھائی کو بھیجا گیا تو اس سے مراد یہی نسلی اور قومی اخوت ہے۔

۳۔ دینی اور ایمانی اخوت، سورۂ حجرات میں ہے: ''بے شک ایمان والے بھائی بھائی ہیں۔''

۴۔ جن کے دلوں میں آپس میں محبت ہوتی ہے اور ان کے سینے بغض اور حسد سے خالی ہوتے ہیں انہیں بھی بھائی بھائی کہا جاتا ہے، سورۂ حجر میں ہے: ''ان کے دلوں میں جو کینہ ہے ہم اسے نکال دیں گے اور وہ بھائی بھائی بن جائیں گے۔''

۵۔ اپنے ساتھی اور شریک کو بھی بھائی (اخ) کہا جاتا ہے۔ سورۂ ص میں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں ایک ستم رسیدہ نے اپنے ساتھی کے ظلم اور زیادتی کے بارے میں ان الفاظ میں شکایت کی تھی ''یہ میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک دنبی ہے۔'' (نزھة الاعین النواظر : ۱۳۲)

باہمی اخوت ومحبت کے جتنے بھی اسباب ہیں ان میں سے سب سے قوی اور مؤثر سبب

ایمان اور دین کا رشتہ ہے، اس میں کوئی مادی غرض اور مالی مفاد بھی پیشِ نظر نہیں ہوتا ہے بلکہ اللہ کی رضا ہی مقصود ہوتی ہے اس لیے ہمارے دین میں اخوت کی بنیاد، ایمان کو قرار دیا گیا ہے، یہی وہ بنیاد تھی جس نے فارس کے سلمان، حبشہ کے بلال، روم کے صہیب اور عرب کے ابوسفیان رضی اللہ عنہم کو آپس میں بھائی بھائی بنا دیا تھا، انہوں نے عرب وعجم، حسب نسب، غربت وامارت اور رنگ اور زبان کے سارے امتیازات ختم کر کے ایمان ہی کو اخوت کی بنیاد قرار دے لیا تھا۔

قرآن کریم اور احادیثِ نبویہ میں اس اخوت کا تذکرہ بار بار ملتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ احسان جتلایا ہے کہ ''تم آپس میں دشمن تھے، اللہ نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی پس تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے۔''

(آلِ عمران: ۱۰۳)

سورۂ توبہ میں ہے: ''اگر مشرکین توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیتے رہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔'' (سورة التوبة: ۱۱)

سورۂ احزاب میں ہے: ''تم لوگوں کی نسبت ان کے آباء کی طرف کرو! یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے اور اگر تمہیں ان کے آباء کا علم نہ ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی اور دوست ہیں۔'' (سورة الأحزاب: ۵)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذہنوں میں اخوت کا یہ تصور بہت مضبوطی سے راسخ ہو چکا تھا اور یہ اصل میں قرآنی ہدایات اور مصطفوی تعلیمات کا نتیجہ اور ثمرہ تھا، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی روزمرہ گفتگو، مواعظ اور ارشادات میں قصداً ایسے جملے استعمال فرماتے تھے جن سے مخاطب کے ذہن میں ہر کلمہ گو مسلمان کے لیے اخوت کا تصور مستحکم سے مستحکم ہوتا چلا جاتا تھا، اس کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

۱۔ حضرت جابر بن سلیم رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بہت ساری نصیحتیں ارشاد فرمائیں، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ تم اپنے (مسلمان) ''بھائی'' کے ساتھ بشاشت سے پیش آیا کرو کیونکہ یہ بھی ایک نیکی ہے۔ (ابو داوٗد : ٤٠٨٤)

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک شخص اپنے ''بھائی'' کی زیارت کے لیے کسی بستی کی طرف روانہ ہوا، راستے میں اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ مقرر کر دیا جس نے اس سے سوال کیا کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ اس نے کہا میں فلاں بستی میں اپنے (مسلمان) بھائی سے ملاقات کے لیے جا رہا ہوں، فرشتے نے پوچھا کیا اس نے تمہارے اوپر کوئی احسان کیا تھا جس کا تم بدلہ چکانا چاہتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ اس کا میرے اوپر کوئی احسان نہیں، بس میں اللہ کی رضا کے لیے اس سے محبت کرتا ہوں، فرشتے نے اسے بتایا کہ مجھے اللہ نے تمہارے پاس یہ خوشخبری سنانے کے لیے بھیجا ہے کہ جیسے تم اس (مسلمان بھائی) سے اللہ کے لیے محبت کرتے ہو ایسے ہی اللہ بھی تم سے محبت کرتا ہے۔ (مسلم : ٢٥٦٧)

۳۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنے (مسلمان) ''بھائی'' کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو، لوگوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ہم مظلوموں کی تو مدد کریں لیکن ظالم کی کیسے مدد کریں، آپ نے فرمایا: تم اسے ظلم سے روک دو۔ (یہی اس کی مدد ہے) (بخاری : ٣٤٤٣)

۴۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی ایک تفصیلی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول یہ دو جملے بھی ہیں کہ تمہارا اپنے (مسلمان) ''بھائی'' کے سامنے مسکرانا بھی صدقہ ہے اور اپنے ڈول سے اپنے ''بھائی'' کے ڈول میں کچھ ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔ (جامع ترمذی : ١٩٥٦)

مجھے یہ بتانا تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم قصداً بار بار ہر مسلمان کے لیے ''بھائی'' کا لفظ استعمال فرماتے تھے تاکہ ہر ایک کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے کہ واقعی ہر کلمہ گو ہمارا ''بھائی'' ہے اور اسلامی اخوت کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہو جائے اور حقیقتاً ایسا ہو چکا تھا اور ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنا بھائی ہی سمجھتا تھا، اس کے فائدہ کو اپنا فائدہ اور اس کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھتا تھا، کوئی مسلمان بیمار ہوتا تو اس کی عیادت کرتے، پریشان حال ہوتا تو اس کی مدد کرتے، مظلوم ہوتا تو ظالم کا ہاتھ توڑ دیتے، اس کی عزت خطرے میں ہوتی تو اس کا تحفظ کرتے، ان کے دشمن بھی جانتے تھے کہ مسلمان اخوتِ اسلامیہ کے رشتے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اس لیے انہیں ان کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

آج جب کہ یہ رشتہ کمزور پڑ گیا ہے اور اغیار کی سازشوں نے مسلمانوں کو علاقائی، وطنی، لسانی، قبائلی اور گروہی تعصبات میں مبتلا کر کے چھوٹی چھوٹی جماعتوں اور فرقوں میں تقسیم کر دیا ہے تو اب انہیں مغلوب رکھنا کافروں کے لیے بڑا آسان ہو گیا ہے، اک پٹتا ہے تو باقی سارے مسلمان لبِ ساحل کھڑے ہو کر اس کی ہلاکت اور غرقابی کا تماشا دیکھتے ہیں حالانکہ وہ نہیں جانتے کہ انہیں دبا لینے کے بعد یہ سیلابِ بلا ان کے شہروں اور ملکوں کا بھی رخ کرنے والا ہے۔ اے کاش! مشرق و مغرب کے مسلمان ''اخوتِ اسلامیہ'' کے لازوال رشتہ میں دوبارہ جڑ جائیں پھر روس ان کا غلام ہوگا اور امریکا ان کی لونڈی!

اِخبات

اِخبات کا مادہ مختلف صیغوں میں قرآن کریم میں تین مقامات پر استعمال ہوا ہے، سورۂ ہود کی آیت ۲۳ میں اور سورۂ حج کی آیت ۳۴ اور ۵۴ میں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے بہت سے مفسرین نے "اخبات" کو تواضع کے معنی میں لیا ہے، امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "اخبات" طمانیت کے مقامات میں سے پہلا مقام ہے اور اخبات کے تین درجات ہیں:

☆ پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان کی عفت وعصمت اس کی شہوت پر، اس کا ارادہ غفلت پر اور اس کی محنت فارغ البالی پر غالب آ جائے۔ وہ عفیف ایسا ہو کہ شہوت اسے بدکاری میں مبتلا نہ کرے، اس کا عزم ایسا مصمم ہو کہ وہ غفلت کا شکار نہ ہو اور اس کے دل میں اللہ کی محبت اس قدر ہو کہ فراخی اور فارغ البالی کے باوجود وہ اللہ کو نہ بھولے۔

☆ دوسرا درجہ یہ ہے کہ کوئی عارض اور فتنہ اسے وحشت میں مبتلا نہ کرے وہ اپنے کام میں لگا رہے اور حالات سے پریشان نہ ہو۔

☆ اِخبات کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک تعریف اور مذمت برابر ہو جائے، نہ کسی کی مدح سے اس کے دماغ میں فتور آئے اور نہ ہی ذم سے وہ پریشان ہو، یہ مقام ان لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو نفس کی آلائشوں سے پاک ہو جاتے ہیں، رب کی عبودیت میں فنا ہو جاتے ہیں، ایمان کی حلاوت پا لیتے ہیں اور ان کا دل اسماء وصفات کے انوار کی جلوہ گاہ بن جاتا ہے، ان کے مقابلے میں جو لوگ انسانوں کی مدح وذم پر نظر رکھتے اور اس سے متأثر ہوتے ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ انہیں اللہ کی محبت اور معرفت کی روح حاصل نہیں ہوئی اور انہوں نے ایمان کی حلاوت اور صدق ویقین کا مزہ نہیں چکھا۔

اصل میں اللہ کا قرب اور محبوبیت حاصل کرنے کے راستے میں ''نفس'' کی مثال ایک دشوار گزار پہاڑ کی سی ہے، جو بھی اس راستے پر چلتا ہے اسے اس پہاڑ پر چڑھنا ہی پڑتا ہے پھر کسی کے لیے اس پہاڑ پر چڑھنا آسان ہو جاتا ہے اور کسی کے لیے مشکل ہو جاتا ہے، اس پہاڑ کے دائیں بائیں اور اوپر نیچے وادیاں اور گھاٹیاں بھی ہیں، خاردار جھاڑیاں بھی ہیں اور چور اور ڈاکو بھی ہیں، بالخصوص جب یہ سفر اندھیری شب میں ہو رہا ہو تو یہ خطرات بہت بڑھ جاتے ہیں، جن مسافروں کے پاس ایمان کا ہتھیار اور یقین کا وہ چراغ نہ ہو جسے ''اخبات'' کے تیل سے روشن کیا گیا ہو انہیں قدم قدم پر موانع پیش آتے ہیں اور ان کے اور ان کی منزل کے درمیان ایسی رکاوٹیں کھڑی ہو جاتی ہیں کہ ان کے لیے سفر کا جاری رکھنا مشکل ہو جاتا ہے، پھر بہت سارے سالک ایسے ہوتے ہیں جو راستے کی مشکلات دیکھ کر دل چھوٹا کر لیتے ہیں اور الٹے قدم واپس چلے آتے ہیں۔ (مدارج السالکین لابن قیم : ۲/۶)

امام ابن قیم رحمہ اللہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جن سعادت مندوں کے اندر ''اخبات'' کی صفت پیدا ہو جاتی ہے، ان کے لیے ''وصول الی اللہ'' (اللہ تک پہنچنا) آسان ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ اس مضمون کے آغاز میں عرض کیا گیا تھا کہ قرآن کریم میں تین مقامات پر ''اخبات'' کا ذکر آیا ہے، ان تین مقامات میں سے قدرے تفصیل کے ساتھ سورۂ حج کی آیت ۳۴ اور ۳۵ میں اس کا بیان ہوا ہے، آیت ۳۴ کے آخر میں ''مخبتین'' (وہ لوگ جن کے اندر اخبات کی صفت پائی جاتی ہے) کو بشارت سنائی گئی ہے اور پھر آیت ۳۵ میں ان کی بعض صفات اور علامات بیان کی گئی ہیں، ارشاد ہوتا ہے ''آپ خوشخبری سنا دیجیے عاجزی کرنے والوں کو، وہ کہ جب اللہ کا نام ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور وہ مصیبت پر صبر کرنے والے اور نماز قائم کرنے والے ہیں اور ہم نے ان کو جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں'' سورۂ ہود کی آیت ۲۳ میں ہے: ''بے شک وہ لوگ جو ایمان

لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے اور اپنے رب کے سامنے عاجزی اختیار کی وہی جنت والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

ترمذی شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بڑی پیاری دعاء منقول ہے اور اس میں کون شک کرسکتا ہے کہ ہمارے آقا کی ہر دعاء ہی بڑی پیاری ہے اور اس قابل ہے کہ اسے وردِ زبان اور وظیفۂ جان بنالیا جائے، یہ دعاء جس کا ہم ذکر کرنے لگے ہیں اپنے اندر بڑی جامعیت لیے ہوئے ہے، اس دعاء میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے جو چیزیں مانگی ہیں ان میں سے ایک "اخبات" (تواضع) بھی ہے، بہت مناسب ہوگا اگر قارئین اور قاریات، دعاؤں کا کوئی مستند مجموعہ دیکھ کر دعاء زبانی یاد کرلیں اور اسے نماز کے بعد پڑھ لیا کریں، "درسِ قرآن وحدیث" کے صفحہ کی تنگ دامنی کی وجہ سے ہم صرف اس کا ترجمہ لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں:

"اے میرے رب! میری مدد فرما اور میرے خلاف کسی کی مدد نہ فرما، مجھے غلبہ عطا فرما اور مجھ پر کسی کو غلبہ عطا نہ فرما، میرے لیے تدبیر فرما اور میرے اوپر کسی کی تدبیر نہ چلنے دیجئے، مجھے ہدایت دے اور میرے لیے ہدایت آسان فرما، جو مجھ پر زیادتی کرے اس کے مقابلے میں میری نصرت فرما، اے میرے رب! مجھے بنادے تیرا بہت زیادہ شکر کرنے والا، کثرت سے تیرا ذکر کرنے والا، تجھ سے بہت ڈرنے والا، تیری طاعت کرنے والا، تیرے سامنے "اخبات" (عاجزی) کرنے والا، تیرے سامنے آہ وزاری اور تیری طرف رجوع کرنے والا، اے میرے رب! میری توبہ قبول فرمالے، میرے گناہوں کو دھوڈال، میری دعاء قبول فرمالے، میری حجت قوی فرمادے، میری زبان کو درست فرمادے، میرے دل کو ہدایت دے اور میرے سینے کی میل کچیل دور فرمادے۔"

(ترمذي : ۳۵۵۱، ابن ماجه : ۳۸۳۰)

یہاں یہ عرض کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بارہویں صدی کے سب سے بڑے عالم اور کتاب وسنت کے عظیم شارح شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''انسان کی سعادت اور نیک بختی ان چار چیزوں میں ہے:

(۱) طہارت

(۲) اخبات

(۳) سماحت (بہیمی خواہشات اور حقیر چیزوں سے بچنا)

(۴) عدالت

اگر طہارت کی بجائے نجاست ہوگی خواہ عقیدہ میں ہو یا عمل میں، اخبات یعنی عاجزی کی بجائے غرور، سماحت یعنی فیاضی کی بجائے خسیس خواہشات اور عدالت کی بجائے ظلم ہوگا تو یہ بدبختی کی علامت ہے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تمام انبیاء اور تمام آسمانی شرائع نے ان چار چیزوں کی تعلیم دی ہے۔'' (معالم العرفان)

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ اِخبات یعنی عاجزی اور تواضع ایک ایسی صفت ہے جس کے حصول کی ہر مسلمان کو کوشش کرنی چاہئے، جن لوگوں کے اندر یہ صفت پیدا ہو جاتی ہے ان کے لیے اللہ کی طرف سے جنت کی بشارت ہے، ان کی نظریں بلند ہو جاتی ہیں اور وہ انسانوں کی مدح وذم سے بے نیاز ہو جاتے ہیں، ''سیر الی اللہ'' کا راستہ ان کے لیے آسان ہو جاتا ہے اور انہیں ایمان اور یقین کی حلاوت نصیب ہو جاتی ہے۔

ایمان

سورۂ حجرات میں ہے: ''یہ لوگ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ مسلمان ہو گئے ہیں، کہہ دو کہ اپنے مسلمان ہونے کا مجھ پر احسان نہ رکھو بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کا راستہ دکھایا بشرطیکہ تم سچے (مسلمان) ہو۔'' (سورة الحجرات: ١٧)

اس میں شک نہیں کہ ہم پر اللہ تعالیٰ کے بے شمار احسانات ہیں اگر ہم انہیں شمار کرنا چاہیں تو شمار نہیں کر سکتے، اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ باری تعالیٰ کے احسانات میں سے سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ہمیں ایمان کی توفیق عطا فرمائی ہے، قرآن کریم کی بے شمار آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کا اور ایمان والوں کو تذکرہ کیا ہے، کہیں ایمان والوں سے خطاب کر کے انہیں مختلف احکام دیئے گئے ہیں، کہیں ان کی صفات ذکر کی گئی ہیں، کہیں ان کی تعریف کی گئی ہے، کہیں غلطیوں پر تنبیہ کی گئی ہے، کہیں ان کے جہد و ایثار اور اخلاص و وفا کے واقعات بیان کئے گئے ہیں، ان تمام آیات پر نظر ڈالنے سے ایمان کی حقیقت معلوم ہوتی ہے، خود ہمارے آقا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مختلف احادیث میں ایمان کی حقیقت بیان فرمائی ہے اور آج کے درس میں ہم ایمان ہی کے حوالے سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

ایمان اصل میں تصدیق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے مگر اس میں امان کے معنی کا بھی لحاظ ہوتا ہے کیونکہ جو اللہ پر ایمان لے آتا ہے، اللہ اسے امن عطا کر دیتا ہے اور وہ اللہ کی امان میں داخل ہو جاتا ہے۔

ایمان کا شرعی معنی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو تعلیمات اللہ کی طرف سے لے کر آئے ہیں ان سب کی دل سے تصدیق کرنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا۔ صحیح مسلم کی

وہ مشہور روایت جو کہ حدیث جبریل کے نام سے مشہور ہے اس میں ہے کہ صحابہ کی معلومات میں اضافہ کے لئے انسانی شکل میں آ کر حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو مختلف سوالات کئے تھے ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ ایمان کیا ہے؟ اور آپ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا: ''یہ کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں اور رسولوں پر، آخرت کے دن اور اچھی اور بری تقدیر پر۔''

(مسلم کتاب الإیمان : ۲۹)

اس حدیث میں جن چھ چیزوں پر ایمان رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، ہر مسلمان ان پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے بغیر وہ مسلمان ہو ہی نہیں سکتا، کوئی شخص صرف تورات اور انجیل، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان رکھ کر اور باقی ساری کتابوں اور سارے انبیاء کا انکار کر کے یہودی یا عیسائی ہو سکتا ہے لیکن کوئی بھی ایسا شخص جو جماعتِ انبیاء میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرتا ہو وہ مسلمان نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ہی کیوں نہ رکھتا ہو، جماعتِ انبیاء کے آخری فرد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے آپ پر نبوت ختم ہو گئی، آپ کو تمام انبیاء پر فضیلت حاصل ہے۔

یہاں یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ ایمان اور اعمال و اخلاق کا آپس میں گہرا تعلق ہے، ایمان جڑ ہے اور اعمال و اخلاق اس سے پھوٹنے والی شاخیں اور پھل پھول ہیں، ایمان بنیاد ہے اور اعمال و اخلاق اس بنیاد پر اٹھائی جانے والی خوبصورت عمارت ہیں، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ایمان کے ستر سے زائد شعبے ہیں، جن میں سب سے افضل کلمہ طیبہ ''لا الہ الا اللہ'' ہے اور سب سے ادنیٰ یہ ہے کہ راستے سے ایسی چیزیں ہٹا دی جائیں جن سے گزرنے والوں کو تکلیف ہوتی ہو۔

(بحوالہ نضرۃ النعیم : ۶۰۴۹/۳)

حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ عمل اور اخلاق جو اللہ کو پسند تھا وہ اس نے ایمان کے عنوان میں داخل کر دیا ہے۔ چونکہ اعلیٰ صفات اور عبادت واطاعت کا ایمان سے گہرا تعلق ہے اور یہ سب ایمان کے عنوان میں داخل ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے سورۂ حجرات میں ارشاد فرمایا ہے: ''اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایمان کی محبت عطا فرمادی اور اسے تمہارے دلوں میں مزین کر دیا اور کفر وفسق اور تمام گناہوں کی نفرت تمہارے دلوں میں بٹھادی''۔ ظاہر ہے کہ اس آیت کریمہ میں ایمان کے عنوان میں سارے اعمال اور اخلاق شامل ہیں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی اس دعویٰ کی تائید کرتا ہے:

"من سرته حسنة و ساء ته سيئة فهو مومن ." (ترمذي : ١١٦٢)

''جسے نیکی سے خوشی اور برائی سے نفرت ہو وہی حقیقی مومن ہے۔''

ایسے شخص کو حقیقی مومن قرار دینے کی وجہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے دل میں نیکی کی محبت اور برائی کی نفرت ڈالی ہوتی ہے۔

اس تفصیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام اعمال اور اخلاق کی بنیاد، ایمان ہی ہے جس کے دل میں ایمان کا نور ہوگا اسے ہر طرح کی بد اخلاقی اور گناہ سے نفرت ہوگی، سچا مومن بد اخلاق نہیں ہوتا وہ مخلوقِ خدا کو کنبہ سمجھ کر اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے، کسی کو دکھ نہیں دیتا، کسی کی جان اور آبرو کو نقصان نہیں پہنچاتا، دوسروں کے حقوق اور جذبات کا خیال رکھتا ہے، صاحب ایمان متواضع ہوتا ہے، متکبر نہیں ہوتا وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا، ساری امیدیں اسی سے وابستہ رکھتا ہے، اسی وجہ سے خوشامد، چاپلوسی، لالچ اور کمینگی جیسی بیماریاں اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتیں، اس کی محبت، احسان اور ایثار محض اللہ کی رضا کے لئے ہوتا ہے، اس کے پیش نظر گھٹیا دنیاوی اغراض نہیں ہوتیں، اس کا شجرِ ایمانی، ہر موسم اور ہر جگہ ثمر دار اور تر وتازہ رہتا ہے، اس کی شادابی اور رعنائی فصلِ گل کی محتاج نہیں ہوتی۔

قرآنی آیاتِ کے علاوہ نہ معلوم کتنی ہی احادیثِ نبویہ ایسی ہیں جن میں اعمالِ حسنہ اور اخلاقِ فاضلہ کے اعتبار سے کسی انسان کے سچا اور کامل مومن ہونے کا فیصلہ کیا گیا ہے، یہاں محض نمونہ کے طور پر چند احادیث درج کی جاتی ہیں:

○ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مومنوں میں سے سب سے کامل ایمان والا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں اور ان میں سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیوی کے لئے بہتر ہو۔''

(جامع ترمذی: ۱۱۶۲)

○ حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے: ''کوئی بندہ خالص ایمان کا حق اس وقت تک ادا نہیں کرسکتا جب تک وہ صرف اللہ کے لئے محبت اور اللہ کے لئے بغض نہ رکھے، جب وہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کے لئے محبت اور اسی کے لئے بغض رکھتا ہے تو وہ اللہ کی دوستی کا مستحق ہوجاتا ہے اور میرے بندوں اور میری مخلوق میں سے میرے دوست وہ ہیں جنہیں یاد کیا جاتا ہے مجھے یاد کرنے کی وجہ سے اور مجھے یاد کیا جاتا ہے انہیں یاد کرنے کی وجہ سے۔'' (مسند احمد: ۳/۴۳۰)

غرضیکہ اس طرح کی متعدد احادیث ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کامل مومن وہ ہے جس کے ایمان کا اثر اس کے اعمال اور اخلاق میں بھی نظر آئے، یہ جو عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے کہ مومن ہونے کیلئے سوچے سمجھے بغیر بس زبان سے کلمہ پڑھ لینا ہی کافی ہے تو یہ تصور مکمل طور پر صحیح نہیں ہے، ایمان تو حقیقت میں باطن سے ظاہر تک اور دل سے اعضاء تک ہر جگہ اپنا رنگ دکھاتا ہے، دل میں ایمان کا نور ہو تو ظاہر بھی پرنور ہوجاتا ہے اور اعمالِ صالحہ کی توفیق ملتی ہے اور جب اعمالِ صالحہ تسلسل کے ساتھ کئے جاتے ہیں تو ایمانی کیفیات میں بھی ترقی ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ انسان کا باطن اور قلب ودماغ بقعۂ نور بن جاتا ہے۔

○ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''مومن کے دل میں ایمان کے نور کا ایک نقطہ ہوتا ہے جوں جوں ایمان بڑھتا جاتا ہے اس کی نورانیت میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے، جب ایمان کامل ہو جاتا ہے تو سارا دل نور سے چمک اٹھتا ہے، اور نفاق کی وجہ سے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے جیسے جیسے نفاق میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے دل سیاہ ہوتا جاتا ہے، جب کوئی شخص پورا منافق بن جاتا ہے تو اس کا دل پورا سیاہ ہو جاتا ہے، اللہ کی قسم! اگر تم کسی مومن کا دل چیر کر دیکھو تو تم اسے سفید اور چمکتا ہوا دیکھو گے اور اگر تم کسی منافق کا دل چیر کر دیکھو تو اسے بالکل سیاہ پاؤ گے۔

(بیہقی: ۱۸۳/۱، کنز العمال: ۴۰٦/۱)

آج ہمارا حال یہ ہے کہ ہم عبادت اور تلاوت بھی کرتے ہیں تو بھی ہماری ایمانی کیفیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری عبادت وتلاوت اور ذکر و دعاء روح سے خالی ہو چکی ہے اور محض ڈھانچے باقی رہ گئے ہیں۔

ساری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ایک تو ایمان کی حقیقت ہے، اس کے علاوہ ایمان کے کچھ ثمرات اور نتائج ہیں۔ اگر ایمان دل میں پیوست ہو تو اس کے ثمرات یقیناً ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔ حقیقی ایمان سے دل بقعۂ نور بن جاتا ہے، حلاوت اور لذت حاصل ہوتی ہے، ہر نیکی اور نیک انسان سے محبت ہو جاتی ہے ہر بدی سے نفرت ہو جاتی ہے، اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ فاضلہ کی توفیق ارزاں ہوتی ہے، کیا ہمیں بھی یہ نتائج وثمرات اور فوائد حاصل ہو رہے ہیں، اگر خدانخواستہ جواب نفی میں ہے تو اللہ تعالیٰ سے حقیقی ایمان کی دعاء کیجئے اور بار بار کیجئے!

اِخلاص

سورۃ الاعراف میں ہے: ''آپ فرمادیجئے کہ میرے پروردگار نے انصاف کا حکم دیا ہے اور یہ کہ تم ہر سجدہ کے وقت اپنا رخ سیدھا رکھا کرو اور اللہ کو پکارو اسی کے لئے دین کو خالص کرکے۔'' (سورة الأعراف : ۲۹)

سورۃ البینہ میں ہے: ''انہیں یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت اس طرح کریں کہ دین کو اسی کے لئے خالص رکھیں یکسو ہو کر۔'' (سورة البينة : ۵)

ہمارے دین میں اخلاص کو بڑی اہمیت حاصل ہے، تمام قولی اور مالی، بدنی اور قلبی عبادتوں کی قبولیت کی بنیاد اخلاص ہے، اخلاص کے ساتھ کیا گیا چھوٹے سے چھوٹا عمل بے پناہ برکات اور ثمرات کا حامل ہوتا ہے اور بظاہر بہت بڑا نظر آنے والا عمل جو کہ اخلاص سے خالی ہو وہ بے قیمت اور فضول ہوتا ہے گویا اللہ کے ہاں کسی عمل کا چھوٹا یا بڑا ہونا عدد اور مقدار کے اعتبار سے نہیں ہوتا بلکہ اخلاص کے اعتبار سے ہوتا ہے۔

عبادات کی طرح دعاؤں کی قبولیت کی بنیاد بھی اخلاص ہے، اخلاص دنیا اور آخرت میں انسان کے مرتبہ کو بلند کردیتا ہے، اخلاص کی برکت سے وساوس اور اوہام سے حفاظت رہتی ہے، اخلاص کی وجہ سے بندوں کا اللہ سے تعلق مضبوط ہوجاتا ہے اور اس کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوتی ہیں، اخلاص کی وجہ سے بیماریاں، مصیبتیں، پریشانیاں دور ہوجاتی ہیں اور

ہوتا ہے، وہ نہ تو مصائب سے گھبراتا ہے اور نہ ہی انسانوں کے طعنوں اور اعتراضات کی بوچھاڑ کو کبھی خاطر میں لاتا ہے، اس کے دل میں نہ تو قصیدہ خوانی سننے کی ہوس ہوتی ہے اور نہ ہی ملامت کے تیر اس کے قدموں میں لغزش پیدا کرتے ہیں، وہ صراط مستقیم پر مضبوطی سے قدم جماتا ہے اور بہار و خزاں اور وقتی منفعتوں کی پرواہ کئے بغیر اس پر چلا جاتا ہے، وہ مشرق میں ہو یا مغرب میں، غربت میں ہو یا امارت میں، تجارت میں مصروف ہو یا ملازمت میں اس کی توجہات کا رخ اور اس کی کاوشوں کا قبلہ صرف ایک ہوتا ہے، وہ جیتا ہے تو صرف اللہ کی رضا کے لئے اور مرتا ہے تو اللہ کی رضا کے لئے۔

اخلاص بڑی مشکل سے حاصل ہوتا ہے لیکن اگر حاصل ہوجائے تو اس سے بڑی دولت کوئی نہیں، مشکل اس لئے کیونکہ دل کو جتنا بھی پاک کرنے اور رکھنے کی کوشش کی جائے، ہوس چھپ چھپ کر تصویریں بنا ہی لیتی ہے۔ حضرت یوسف بن حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”دنیا میں سب سے مشکل چیز اخلاص ہے، میری حالت یہ ہے کہ میں ریا کو دل سے ختم کرنے کی بہت کوشش کرتا ہوں لیکن وہ کسی دوسرے رنگ اور شکل میں ظاہر ہو جاتی ہے۔“ (مدارج السالکین: ۲/۹۶)

اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ ہر عمل سے مقصد اللہ کی رضا ہو اور صرف اللہ ہی کو دکھانا مقصود ہو کسی اور کو دکھانے کی نیت ہرگز دل میں نہ ہو۔ حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ایک شخص ثواب اور شہرت دونوں کے لئے جہاد میں حصہ لیتا ہے، کیا اسے کچھ حاصل ہوگا؟ آپ نے فرمایا: ”نہیں! اسے کچھ بھی ثواب نہیں ملے گا، اس نے تین بار اپنا سوال دہرایا، آپ نے تینوں بار یہی جواب دیا کہ اسے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا“ پھر آپ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ بندے کے صرف اسی عمل کو قبول کرتا ہے جو اس کے لئے خالص ہو اور جو صرف اسی کی رضا کے لئے کیا

گیا ہو۔" (سنن کبریٰ بیهقی : ۲۸۲/۹)

اخلاص کی تاثیر اور برکت کا حال یہ ہے کہ اگر کلمہ طیبہ ہی اللہ کی رضا کے لئے پڑھ لیا جائے تو وہ انسان کی نجات کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی شخص اخلاص کے ساتھ "لا الہ الا اللہ" کہہ دے تو اس کیلئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں یہاں تک کہ یہ کلمہ عرش تک پہنچ جاتا ہے، بشرطیکہ انسان کبیرہ گناہوں سے بچتا رہے۔ (ترمذي: ۳۵۹۰)

جس بدنصیب کے دل میں ریا کاری اور شہرت کا جذبہ ہوتا ہے وہ لاکھوں خرچ کرتا ہے، بیسیوں حج کرتا ہے، دسیوں بار جہاد میں جاتا ہے لیکن اسے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا جبکہ جس انسان کے دل میں اخلاص اور اللہ کی رضا کا سچا جذبہ ہوتا ہے، اسے خرچ کئے بغیر صدقہ خیرات کا اور سفر کئے بغیر حج اور جہاد کا اجر و ثواب ملتا رہتا ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم ایک غزوہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، آپ نے فرمایا: "مدینہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو ہر میدان اور ہر وادی کو طے کرتے ہوئے تمہارے ساتھ ہیں، انہیں بیماری نے جہاد میں شرکت سے روک دیا ہے۔ (صحیح بخاری : ۲۸۳۹، مسلم : ۱۹۱۱)

یہ وہ مخلص لوگ تھے جو دل سے جہاد میں شرکت کا ارادہ رکھتے تھے مگر بیماری کی وجہ سے وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے اگرچہ وہ شرکت سے محروم رہ گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں ثواب سے محروم نہیں رکھا کیونکہ ان کی نیت خالص تھی اور ان کا عزم پختہ تھا۔ مخلصین کا حال تو یہ ہے کہ وہ بعض اوقات عمل کئے بغیر ہی اجر کے مستحق ہو جاتے ہیں اور ریا کاروں کا حال یہ ہے کہ وہ بے پناہ مشقت اٹھانے کے باوجود ثواب سے محروم رہ جاتے ہیں امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "اخلاص کے بغیر عمل کرنے والے کی مثال اس مسافر کی سی ہے جو

ریت کی بوری اٹھا کر سفر کرے اور اسے کچھ بھی حاصل نہ ہو۔" (الفوائد : ٦٧)

جو اعمال اخلاص کے ساتھ کیے جاتے ہیں ان کا واسطہ دے کر اگر اللہ تعالیٰ سے دعاء کی جائے تو دعاء قبول ہو جاتی ہے اور مسائل حل ہو جاتے ہیں، تین مصیبت زدہ انسانوں کا وہ واقعہ بہت مشہور ہے جو صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ تینوں ایک غار میں پھنس گئے تھے جس سے نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی، ان تینوں نے اپنے اعمال کا واسطہ دے کر اس مصیبت سے نجات کے لئے دعاء کی جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہ تھا اور جو انہوں نے خالص اللہ کی رضا کے لئے کئے تھے چنانچہ انہیں اس مصیبت سے نجات دے دی گئی۔ (بخاري : ٢٢٧٢ ، مسلم : ٢٧٤٢)

ایک جانب اخلاص سے عمل میں وزن پیدا ہوتا ہے تو دوسری جانب اس کی برکت سے دل میں معارف پیدا ہوتے ہیں اور زبان ان معارف کی ترجمان بن جاتی ہے۔ حضرت مکحول رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اگر کوئی شخص چالیس دن تک اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کرے تو اسکے دل اور زبان سے حکمت ودانائی کے چشمے پھوٹنے لگتے ہیں، (مدارج السالکین : ٢/٩٦) اخلاص کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہوتا اس لئے اس کا اجر براہ راست اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے۔ حضرت جنید رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اخلاص اللہ اور بندے کے درمیان ایک راز ہوتا ہے جسے نہ فرشتہ جانتا ہے کہ اسے لکھ سکے اور نہ ہی شیطان جانتا ہے کہ اسے خراب کر سکے۔ (مدارج السالکین : ٢/٩٥)

اخلاص کا تعلق زندگی کے ہر شعبے سے ہے اور ایک سچے مسلمان کی زندگی کا کوئی پہلو بھی اس سے خالی نہیں ہو سکتا، سارے ہی اعمال میں اخلاص کی ضرورت ہے چاہے عقیدہ ہو یا عبادت، اخلاق ہوں یا معاملات، محنت مزدوری ہو یا کہ کھیل کود!

حسن خلق

حسن خلق کا تعلق ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ بھی ہے اور بندوں کے ساتھ بھی، ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ حسن خلق یہ ہے کہ مذکورہ پورے شرح صدر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی پر عمل کرے، محرمات تو کیا بعض مباحات کو بھی اللہ کی رضا کے لئے چھوڑ دے اور دوسری طرف اس کا حال یہ ہو کہ فرائض اور واجبات کے علاوہ نفلی عبادات بھی خوب رغبت اور محبت کے ساتھ ادا کرے۔

لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک یہ ہے کہ ہر کسی کے ساتھ نیکی کرنے کی کوشش کرے اور اپنے قول وعمل سے کسی کو تکلیف نہ دے، احسان کرنے والوں کو بہتر سے بہتر بدلہ دے اور زیادتی کرنے والوں کو معاف کر دے اگر کوئی مسلمان بیمار ہو تو اس کی عیادت کرے، تنگدست ہو تو اس کی امداد کرے، مقروض ہو تو اسے مہلت دے، یہ نہ دیکھے کہ دوسرے میرے ساتھ کیا کرتے ہیں، یہ دیکھے کہ مجھے اللہ کی رضا کے لئے دوسروں کے ساتھ کیسا معاملہ کرنا چاہئے، اس کی گفتگو میں محبت اور اپنائیت کی خوشبو ہو۔

قرآن کریم کی وہ تمام آیات حسنِ اخلاق ہی سے تعلق رکھتی ہیں جن میں اعزاء و اقرباء، یتیموں، مسکینوں، بیواؤں مسافروں اور عام انسانوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے یا وہ آیات جن میں ظلم کی مذمت اور عدل کی تعریف ہے، متکبرین کی برائی اور متواضعین کی مدح ہے، سیۂ کے جواب میں حسنہ اور زیادتی کے جواب میں احسان کرنے کا حکم ہے، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حسنِ اخلاق کی تاکید فرمائی ہے اور اس کے بے پناہ فضائل بیان فرمائے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اہل

ایمان میں سب سے کامل ایمان اس شخص کا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں اور تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ سب سے زیادہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرے۔ (جامع ترمذی : ۱۱۶۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے اس لئے بھیجا گیا ہے تاکہ میں اچھے اخلاق کی تکمیل کروں۔''

(مسند احمد : ۲/ ۳۸۱)

ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ اللہ کے نبی وہ کون سی چیز ہے جو سب سے زیادہ دخولِ جنت کا سبب بنتی ہے، آپ نے فرمایا: ''اللہ کا تقویٰ اور خوش خلقی'' پھر پوچھا گیا وہ کون سی چیز ہے جس کی وجہ سے عام طور پر لوگ جہنم میں داخل ہوں گے آپ نے فرمایا ''منہ اور شرم گاہ۔'' (ترمذی : ۲۰۰۴)

اب آیئے! اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی میں حسن اخلاق کی چند جھلکیاں بھی دیکھ لیجئے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ جو کچھ کہتے تھے وہ کرتے بھی تھے، آپ کے قول و عمل میں کوئی تضاد نہ تھا اور آپ کی زندگی قرآن کریم کی چلتی پھرتی تصویر اور عملی تفسیر تھی:

☆ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اہل مدینہ کی لونڈیوں میں سے کوئی بھی لونڈی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر جہاں چاہتی تھی لے جاتی تھی۔ (صحیح بخاری : ۶۰۷۲) یعنی آپ ہر کسی کی خدمت اور حاجت برآری کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے، چاہے وہ امیر ہو یا غریب، آزاد ہو یا غلام اور لونڈی، اپنا ہو یا پرایا، اور اس میں کسی قسم کی عار محسوس نہیں فرماتے تھے۔

☆ حضرت ام خالد رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں اپنے والد کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس وقت میں نے زرد رنگ کی قمیص پہنی

ہوئی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور اس قمیص کی بہت تعریف فرمائی، میں مہرِ نبوت کے ساتھ کھیلنے لگی، اس پر میرے والد نے مجھے ڈانٹا لیکن آپ نے فرمایا اسے کھیلنے دو پھر آپ نے اس قمیص کے بارے میں دعاء فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں خوب پہننے اور پرانا کرنے کی توفیق نصیب فرمائے چنانچہ (آپ کی دعاء قبول ہوئی) وہ قمیص اتنا عرصہ استعمال ہوتی رہی کہ لوگوں میں اس کی بقا کے تذکرے ہونے لگے۔

(صحیح بخاری : ۵۹۹۳)

ایک چھوٹی سی بچی جو نسبی اعتبار سے رشتہ دار بھی نہیں ہے، سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسمِ اطہر کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتی ہے، اس کا والد اس چھیڑ چھاڑ کو محسوس کرتا اور اسے بے ادبی سمجھتا ہے لیکن اللہ کے وہ نبی جو حسنِ اخلاق کی مجسم تصویر تھے قطعاً برا نہیں مناتے بلکہ الٹا اس بچی کی دلجوئی فرماتے ہیں۔ اس کے پیراہن کی تعریف فرماتے اور دعائیں بھی دیتے ہیں۔

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے دس سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی ہے، آپ نے مجھے کبھی اف تک نہیں کیا، نہ ہی کسی کام کے کرنے پر یہ فرمایا کہ تو نے کیوں کیا اور نہ ہی چھوڑنے پر فرمایا کہ تو نے یہ کام کیوں نہ کیا اور آپ انسانوں میں سب سے زیادہ خوش اخلاق تھے۔" (صحیح بخاری : ۳۵۶۱)

یہ اس خادم کی گواہی ہے جسے ایک دو سال نہیں پورے دس سال خدمت کی سعادت حاصل ہوئی اور جسے آپ کی داخلی اور خارجی، ازدواجی اور معاشرتی زندگی کا ہر پہلو دیکھنے کا موقع ملا، یہ بات حیرت انگیز ہے کہ عام انسانوں کے برعکس جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جتنے زیادہ قریب تھے اور جنہیں آپ کی معاشرت اور معاملات زیادہ سے زیادہ دیکھنے کا موقع ہاتھ آیا وہ اتنے ہی زیادہ آپ کے مداح تھے ورنہ کئی مشہور شخصیات اور لیڈر ایسے

ہوتے ہیں جن کے حسنِ اخلاق اور اصول پرستی وغیرہ کی شہرت تو بہت ہوتی ہے لیکن جب ان کے ساتھ عملی واسطہ پڑے اور انہیں پرکھنے اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملے تو وہ عوامی ہیرو بالکل زیرو ثابت ہوتے ہیں۔

☆ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اب بھی وہ منظر میرے سامنے ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء میں سے ایک نبی (اور در حقیقت خود اپنی ہی) کے بارے میں بتا رہے تھے کہ اسے اس کی قوم نے مار مار کر زخمی کر دیا، وہ اپنے چہرے سے خون پونچھتے ہوئے اللہ سے دعاء کر رہے تھے: اے میرے رب! میری قوم کو معاف فرما دے کیونکہ یہ جانتے نہیں ہیں۔ (بخاری: ٦٩٢٩، مسلم: ١٧٩٢) دوستوں اور محسنوں کے ساتھ بد اخلاقی تو ایک طرف اپنے بدترین دشمنوں کے لئے بھی آپ کے دامن میں مغفرت کی دعاؤں اور حسنِ اخلاق کے سوا کچھ نہ تھا، ہم جو آپ کے نام لیوا ہیں کیا ہم بھی ایسے خوش اخلاق ہیں؟ نہیں ہرگز ہرگز نہیں! ہماری بد اخلاقی اور بد معاملگی تو پوری دنیا میں مشہور ہو چکی ہے ہاں ہم میں سے بعض جو خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو اپنے مطلب اور غرض کیلئے اور یا پھر ان دشمنانِ دین کے سامنے جو اس وقت قوت وطاقت اور سیاست کے سر چشموں پر قابض ہیں اور جنہیں ہر اعتبار سے مادی ترقی اور عروج حاصل ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں محض اس کی رضا کی خاطر حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

اِستقامت

استقامت کا لفظ، ثابت قدمی، مداومت، جماؤ اور اعتدال کے معنی میں آتا ہے۔ ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور کتاب "جامع العلوم والحکم" میں استقامت کی درجِ ذیل تعریف کی ہے "صراطِ مستقیم یعنی دین قیم پر دائیں بائیں مڑے بغیر چلتے جانا، اس کا اطلاق تمام ظاہری اور باطنی طاعتوں کے کرنے اور تمام گناہوں سے بچنے پر ہوتا ہے۔"

(جامع العلوم والحکم: ۱۹۳)

علامہ جرجانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں "استقامت ٹیڑھ پن کی ضد ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ بندہ بندگی کی راہ میں عقل اور شرع کی روشنی میں چلتا چلا جائے۔" (الفتح: ۲۵۷)

ہر مسلمان ہر نماز میں اللہ تعالیٰ سے "صراطِ مستقیم" کی دعاء کرتا ہے، یہ حقیقت میں استقامت والے راستے ہی کی دعاء ہے کیونکہ مستقیم کا لفظ استقامت سے ماخوذ ہے، ہر نبی نے "صراطِ مستقیم" یعنی استقامت والے راستے کی دعوت دی اور خود بھی اس پر زندگی گزاری، ولی بھی وہی ہوتا ہے جو صاحبِ استقامت ہو، حقیقت میں ولایت اور استقامت ہم معنی ہیں، قرآن کریم میں جو بشارت رب کریم نے انبیاء کو دی ہے وہی بشارت، اصحابِ استقامت کے لئے بھی بیان فرمائی ہے۔

سورۂ یونس میں اولیاء اللہ کے بارے میں ہے: "یاد رکھو کہ اللہ کے ولیوں (دوستوں) پر نہ کوئی خوف ہوتا ہے اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔" (سورۂ یونس: ٦٢) اور سورۂ فصلت میں اصحابِ استقامت کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: "جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر انہوں نے استقامت دکھائی، ان کے پاس فرشتے (یہ بشارت سنانے) کے لئے آتے ہیں کہ تم کچھ بھی اندیشہ اور غم نہ کرو بلکہ اس جنت کی بشارت

سن لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔“ (سورۂ فصلت : ۳۰)

سورۂ احقاف میں ہے ”بے شک وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر جمے رہے تو ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“ (سورۂ احقاف : ۱۳)

سورۂ ہود میں ہمارے آقا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے: ”پس آپ جمے رہے جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے اور وہ لوگ بھی جو آپ کے ساتھ توبہ کر چکے ہیں خبردار تم حد سے نہ بڑھنا، اللہ تمہارے اعمال دیکھنے والا ہے۔“ (سورۂ هود : ۱۱۲)

ایک حدیث میں آتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مجھے سورہ ہود نے بوڑھا کر دیا ہے۔“ (النظم المتناثرة في الاحاديث المتواترة : ۲۲۱) علماء کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ سورہ ہود کی مذکورہ بالا آیات کی طرف تھا کیونکہ اسی آیت میں استقامت کا حکم دیا گیا ہے اور استقامت کا پورا پورا حق ادا کرنا، اس طور پر کہ انسان ذرہ برابر بھی صراطِ مستقیم سے ادھر ادھر نہ ہو یہ بڑا مشکل کام ہے۔

ابنِ ماجہ میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”استقامت اختیار کرو مگر تم اس کا حق ادا نہیں کر سکتے اور تم جان لو کہ تمہارے اعمال میں سے سب سے افضل عمل نماز ہے اور وضو کی پابندی صرف مومن کر سکتا ہے۔“

(ابن ماجه : ۲۷۷)

صراطِ مستقیم پر ایسی استقامت کہ بندہ ذرہ برابر بھی ادھر ادھر نہ ہو یہ چونکہ بہت مشکل ہے اس لئے بعض احادیث میں ”سدِّدُوا“ کے بعد ”قَارِبُوا“ کا حکم ہے یعنی اگر پوری طرح صراطِ مستقیم پر کاربند نہیں رہ سکتے تو کم از کم اسی کے قریب قریب تو رہو۔

حقیقت میں، استقامت ایک ایسا جامع کلمہ ہے جس میں سارا دین آجاتا ہے، اس کا تعلق اقوال، افعال، احوال اور نیات سب کے ساتھ ہے اور ان سب میں استقامت کا

مطلب یہ ہے کہ جو کچھ بھی ہو وہ اللہ کے لئے، اللہ کے ساتھ اور اللہ کے حکم کے مطابق ہو۔

اللہ والے اپنے متعلقین کو یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ صاحبِ استقامت بنو، طالبِ کرامت نہ بنو کیونکہ تمہارا نفس کرامتوں کا طلبگار ہوتا ہے جب کہ تمہارا رب تم سے استقامت کا طلبگار ہے، کیونکہ استقامت بدن کے لئے بمنزلہ روح کے ہے جیسے وہ بدن جو روح سے خالی ہو وہ مردہ ہوتا ہے اسی طرح جو حال استقامت سے خالی ہو وہ فاسد ہوتا ہے، (مدارج السالکین : ۲/۱۰۲۔۱۰۹) قیامت کے دن انسانوں کے درجات اور مقامات کا تعین، صراطِ مستقیم پر استقامت کے اعتبار سے ہوگا، دنیا میں جو کوئی جتنا زیادہ ثابت قدم ہوگا، قیامت کے دن اسے اتنا ہی بلند مرتبہ حاصل ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ اصل استقامت دل کی استقامت ہے، دل کی استقامت سے سارے اعضاء کو استقامت حاصل ہوتی ہے، اور دل کی استقامت کا مطلب یہ ہے کہ دل توحید پر جمار ہے اور اللہ کے سوا کسی طرف متوجہ نہ ہو، جب دل، اللہ کی معرفت وخشیت، ہیبت وجلال، محبت وارادت اور رجاء اور دعاء پر جمار ہے گا تو سارے اعضاء اس کی اطاعت پر جمے رہیں گے کیونکہ دل بادشاہ ہے اور باقی اعضاء اس کا لشکر ہیں، جب بادشاہ سیدھا رہے گا تو اس کی فوج اور سپاہی اور رعایا بھی سیدھے رہیں گے، دل کے بعد اعضاء میں سے سب سے زیادہ جس چیز کی استقامت اور حفاظت کی ضرورت ہے وہ زبان ہے اس لئے کہ زبان دل کی ترجمان ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انسان جب صبح کرتا ہے تو اس کے سارے اعضاء زبان کے سامنے لجاجت کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”ہمارے بارے میں اللہ سے ڈرتی رہنا کیونکہ اگر تم سیدھی رہی تو ہم سب سیدھے رہیں گے اور اگر تم نے کجی اختیار کی تو ہم بھی کجی اختیار کرلیں گے۔ (ترمذي : ۲۴۰۷)

ساری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ زندگی بھر دین پر جمے رہنے والوں کے لئے دنیا میں بھی بشارتیں ہیں اور آخرت میں بھی، وہ اللہ کے مقرب اور محبوب بندے ہیں وہ تو اللہ کے ولی ہیں ہی، خود اللہ بھی کہتا ہے کہ میں ان کا ولی ہوں، کیونکہ انہوں نے محض چند دن اور چند راتیں اللہ کے حکموں کے مطابق بسر نہیں کیں، بلکہ وہ زندگی بھر صراطِ مستقیم پر ڈٹے رہے، زمانے کی گردشیں، شہوات کی آندھیاں اور خواہشات کے طوفان انہیں سیدھے راستے سے نہ ہٹا سکے اور یہ انتہائی مشکل کام ہے، وقتی جوش وخروش کے تحت راتوں کو جاگ کر نفلی عبادت کرنا اور دنوں کو روزے رکھنا آسان ہے مگر ساری زندگی فرائض کا ادا کرنا اور حرام سے بچنا مشکل ہے، یونہی ہواؤں میں اڑنا، پانی پر تیرنا اور چلنا اور مختلف خلافِ عادت کام کرنا بھی زیادہ مشکل نہیں، ایسی شعبدہ بازیاں ہندو جوگیوں کے ہاتھوں بھی ظاہر ہو جاتی ہیں۔

مسلمان کا کمال یہ ہے کہ وہ موت تک صراطِ مستقیم سے انحراف نہ کرے، اسی کا نام ولایت ہے اور ایسا شخص ہی حقیقی مومن کہلانے کا حقدار ہے، استقامت سب سے بڑی کرامت اور رب العالمین کی رضا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

استغفار

استغفار کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرنا، بخشش مانگنا، اللہ تعالیٰ غفار ہے اور بندہ گناہ گار ہے، اس دنیا میں انبیاء کے علاوہ کوئی معصوم نہیں، انبیاء کرام کے علاوہ ہر کسی سے گناہ ہوسکتا ہے، اس لئے کریم ورحیم رب نے ہر شخص کے لئے موت کی علامات ظاہر ہونے تک توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے، وہ ایک بار نہیں بلکہ بار بار معاف کرتا ہے، اگر بندہ سو بار بھی توبہ توڑ کر نادم اور شرمندہ ہوکر اس کے دروازے پر آجائے تو بھی وہ معاف کردیتا ہے، اس کی رحمت کا دروازہ صرف مسجد میں نہیں کھلتا، ہر جگہ کھلا ہوا ہے، صحراء ہو یا آبادی، دن ہو یا رات، جہاں کہیں اور جس وقت بھی مغفرت کا کوئی سچا طلبگار روتے ہوئے اس کے سامنے اپنے گناہ آلود ہاتھ اٹھاتا ہے وہیں وہ اپنی رحمت کا دروازہ کھول دیتا ہے، اپنی کتابِ مبین میں نجانے کتنی بار اس نے اپنی مغفرت اور رحمت کا ذکر کیا ہے۔

نامعلوم کتنی ہی آیات ہیں جن کا اختتام اس کی صفات میں سے ''غفور رحیم'' پر ہوا ہے، اس نے براہِ راست اپنے گناہ گار بندوں کو خطاب فرما کر یہ یقین دلایا ہے کہ تم کتنے ہی گناہ گار کیوں نہ سہی، تمہیں کسی حال میں بھی میری رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔

سورۂ زمر میں ہے:

''آپ فرمادیجئے اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے اوپر (گناہوں کی صورت میں) زیادتیاں کی ہیں تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہوجاؤ، بے شک اللہ سارے گناہوں کو معاف کردیتا ہے، یقیناً وہ بہت بخشنے والا بے حد مہربان ہے۔'' (سورۂ زمر: ۵۳)

ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ سورۂ مائدہ میں بندوں کو توبہ اور استغفار کی اس نے کیسے دعوت دی ہے: ''وہ کیوں اللہ کے سامنے توبہ نہیں کرتے اور اس سے مغفرت طلب نہیں کرتے، اور اللہ

بہت بخشنے والا بے حد مہربان ہے۔" (سورۃ مائدۃ : ٧٤)

سورۂ نوح میں اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض انعامات کا ذکر کیا ہے جن کا وعدہ حضرت نوح علیہ السلام نے استغفار کی صورت میں اپنی قوم کے ساتھ کیا تھا، ظاہر ہے کہ یہ وعدہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا کیونکہ اللہ کے نبی اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی بات نہیں کرتے، ارشاد ہوتا ہے: "اور میں نے کہا کہ اپنے رب سے مغفرت طلب کرو وہ یقیناً بڑا بخشنے والا ہے، وہ تم پر آسمان کو خوب برستا ہوا چھوڑ دے گا اور تمہیں خوب پے در پے مال اور اولاد میں ترقی دے گا اور تمہیں باغات دے گا اور تمہارے لئے نہریں نکال دے گا۔"

(سورۂ نوح : ١٠ـ١٢)

سورۂ نوح کی انہی آیات کی بناء پر بعض حضرات استغفار کو سارے مصائب، پریشانیوں، مشکلات اور بیماریوں کا علاج بتاتے ہیں، خواہ فقر و فاقہ اور اولاد سے محرومی ہی کیوں نہ ہو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی استغفار کو تمام مشکلات کا حل بتلایا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص استغفار کو لازم پکڑ لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر تنگی سے نکلنے کا کوئی راستہ اور ہر غم اور پریشانی سے بچاؤ کی کوئی صورت نکالتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے اس کے ملنے کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔" (ابو داؤد : ١٥١٨)

ایک حدیث میں عجیب انداز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استغفار کی تلقین کی ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تمہیں ختم کر دیتا اور ایسے لوگوں کو لے آتا جو گناہ کرتے پھر اللہ سے معافی مانگتے چنانچہ انہیں معاف کر دیتا۔" ([illegible] : ٢٧٤٩)

معاذ اللہ! اس حدیث کا مقصد انسانوں کو گناہوں کی ترغیب دینا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اس دنیائے رنگ و بو اور جہانِ لذت وشہوت میں ہر کسی سے گناہ سے ہوسکتا ہے، جس سے گناہ ہو جائے اسے چاہئے کہ وہ مایوس ہو کر نہ بیٹھ جائے بلکہ توبہ اور استغفار کے ذریعے اس گناہ کی نجاست سے اپنے آپ کو پاک کر لے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ استغفار کے لئے گناہ کا ارتکاب ضروری نہیں، بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ یونہی استغفار کرتا رہے، دیکھا جائے تو ہمیں عبادت پر بھی استغفار کرنا چاہئے، کیونکہ ہم سے عبادت کا حق ادا نہیں ہوتا، نماز ہی کو لے لیجئے! کتنے لوگ ہیں جو نماز کے سارے ارکان و واجبات اور خشوع وخضوع کا اہتمام کرتے ہوئے نماز پڑھتے ہیں بھری مسجد میں کوئی ایک نمازی بھی ایسا نظر آ جائے تو غنیمت محسوس ہوتا ہے، جبکہ ہمیں اس کے صرف ظاہری ارکان دکھائی دیتے ہیں، اس کے باطن کا حال اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

ہمارے آقا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ معصوم اور اللہ کا زیادہ مقرب کون ہوسکتا ہے، اس کے باوجود آپ کثرت سے استغفار فرمایا کرتے تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم نے ایک ہی مجلس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سو مرتبہ یہ کلمات کہتے ہوئے سنا:

”رب اغفر لي وتب علي انك انت التواب الرحيم.“

(مسند احمد : ۲/۶۷)

”میرے پروردگار! مجھے معاف فرما دے، میری توبہ قبول فرما، یقیناً تو بہت توبہ قبول فرمانے والا اور بے حد مہربان ہے۔“

استغفار میں دنیا اور آخرت کے بے شمار فوائد پوشیدہ ہیں۔ اگر ہمیں وہ فوائد معلوم

ہوجائیں تو ہم میں سے کوئی بھی استغفار سے محروم نہ رہے، ہم ذیل کی سطور میں ان میں سے چند فوائد بیان کرتے ہیں:

(١) استغفار کرنے والوں پر موسلا دھار بارش برستی ہے۔

(٢) استغفار کرنے والوں کے اموال اور اولاد میں برکت ہوتی ہے۔

(٣) استغفار کرنے سے وہ وحشت ختم ہوجاتی ہے جو بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوتی ہے۔

(٤) ایسے شخص سے جن اور انسانی شیاطین دور رہتے ہیں۔

(٥) اسے ایمان اور عبادت وطاعت کی حلاوت اور لذت محسوس ہوتی ہے۔

(٦) صاحبِ استغفار کو اللہ کی محبت حاصل ہوتی ہے۔

(٧) اس کے دل میں دنیا بہت حقیر اور ذلیل ہوجاتی ہے۔

(٨) عقل اور ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔

(٩) اللہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کی توبہ سے خوش ہوتا ہے۔

(١٠) جب اس کا انتقال ہوتا ہے فرشتے رب تعالیٰ کی طرف سے اس کا بشارت کے ساتھ استقبال کرتے ہیں۔

(١١) قیامت کے دن جب لوگ گرمی اور پسینے میں ہوں گے، صاحبِ استغفار عرش کے سائے تلے ہوگا۔

(١٢) جب لوگ حشر سے واپس پلٹیں گے تو یہ خوش نصیب اللہ کے اولیاء اور متقین کے ساتھ ہوگا۔ (نضرة النعيم : ٢/٢٠٣)

پاک لوگ

اسلام پاکیزگی کا مذہب ہے، اس نے ہر شعبے میں پاکیزگی کا حکم دیا ہے، عقائد و اعمال کے علاوہ ذریعہ معاش کے بھی پاک ہونے پر بڑا زور دیا ہے۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے " أکلِ طیب " (کھانا پاک ہونے) کا ذکر فرمایا ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۲ میں ہے:

"اے ایمان والو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں دی ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو۔"

سورۃ المؤمنون کی آیت ۵۱ میں ہے: "اے رسولو! پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو بے شک میں جانتا ہوں جو کچھ تم کرتے ہو۔" اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیا تو وہاں بھی یہ قید لگادی کہ مال پاک ہونا چاہئے۔

سورۃ البقرہ کی آیت ۲٦۷ میں ہے: "اے ایمان والو! خرچ کرو ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو تم کماؤ اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا ہے۔"

احادیث میں بھی پاکیزہ روزی کی ترغیب دی گئی ہے اور یہ بھی بتادیا گیا ہے کہ جس شخص کا ذریعہ معاش حرام اور ناجائز ہوگا اس کی دعاء قبول نہیں ہوگی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے لوگو! بے شک اللہ پاک ہے اور وہ صرف پاک ہی قبول کرتا ہے، اللہ نے سارے ایمان والوں کو بھی وہی حکم دیا ہے جو اس نے اپنے انبیاء کو دیا ہے، فرمانِ باری ہے "اے رسولو! کھاؤ پاکیزہ چیزوں میں سے اور نیک اعمال کرو بے شک میں جانتا ہوں جو کچھ تم کرتے ہو" اور یہ بھی فرمایا ہے کہ "اے ایمان والو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم

نے تمہیں دی ہیں‘‘۔اس کے بعد آپ نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جو طویل سفر طے کر کے آتا ہے، پراگندہ بال ہے، آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر کہتا ہے یا رب، یا رب، لیکن اس کا کھانا حرام ہے، پینا حرام ہے، لباس حرام ہے، اس کے جسم کو حرام سے غذا دی گئی ہے، اس کی دعاء کہاں قبول ہوگی۔‘‘ (صحیح مسلم : ۱۰۱۵)

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات میں سے اپنے لئے صرف پاکیزہ ہی کو پسند فرماتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ خود پاک ہے اس لئے وہ صرف پاک ہی سے محبت کرتا ہے، خواہ کوئی عمل ہو یا کلام یا صدقہ وہ صرف پاک ہی کو قبول کرتا ہے (نظرة النعیم : ۲/۴۸۵) یہی انسانوں کا حال ہے جو پاک اور سعادت مند ہوتا ہے وہ صرف پاک چیز پر ہی راضی ہوتا ہے، اسی سے اس کو سکون واطمینان حاصل ہوتا ہے، اس کی زبان سے ایسا پاکیزہ کلام صادر ہوتا ہے جو بارگاہِ الٰہی میں شرفِ باریابی پاتا ہے ایسے شخص کو فحش گفتگو، جھوٹ، غیبت، چغلی، بہتان اور ہر خبیث کلام سے شدید نفرت ہوتی ہے، وہ صرف ایسے اعمال کی طرف مائل ہوتا ہے جنہیں شریعت، عقل اور فطرت اچھا قرار دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ ایک اللہ کی عبادت کرتا ہے اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا، اس کی رضا کو اپنی خواہش پر ترجیح دیتا ہے، اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت لگا دیتا ہے، اس کی مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے، انہیں تکلیف نہیں دیتا، ان کی عزت وآبرو سے نہیں کھیلتا، ان کی اچھائیوں کو پھیلاتا ہے اور ان کی برائیوں اور کمزوریوں کو چھپاتا ہے، اس کے اخلاق بھی اعلیٰ اور پاکیزہ ہوتے ہیں مثلاً حلم ووقار، صبر وشکر، صدق ووفا، تواضع اور رحمدلی، رحمت وسکینت، عفت وطہارت، جود وسخا، شجاعت اور استغناء، محبت اور مروت و خورونوش کے لئے حلال اور پاک چیزوں کو پسند کرتا ہے، وہ دوستی بھی ایسوں سے لگاتا ہے جو صاف ستھرے ہوتے ہیں، وہ رشتہ بھی وہیں کرتا ہے جہاں کردار وعمل کی پاکیزگی ہوتی

ہے، گویا وہ ہر اعتبار سے پاک ہوتا ہے اس کی روح بھی پاک، بدن بھی پاک، اخلاق بھی پاک، عمل بھی پاک، کلام بھی پاک، کھانا بھی پاک، پینا بھی پاک، لباس بھی پاک، کلام بھی پاک، دوستی بھی پاک، آنا جانا بھی پاک، ٹھہرنا اور لوٹنا بھی پاک، یہ سعادت مند شخص ان لوگوں میں سے ہے جن کے بارے میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ''وہ لوگ جن کی جان فرشتے اس حال میں نکالتے ہیں کہ وہ پاک ہوتے ہیں وہ ان سے کہتے ہیں تم پر سلامتی ہو، تم جنت میں داخل ہو جاؤ ان اعمال کے بدلے جو تم کیا کرتے تھے۔'' (النحل : ۳۲)

طیب اور پاک کی ضد خبیث ہے، جیسے طیب شخص ہر شعبے میں، ہر چیز میں ہر اعتبار سے پاکیزگی پسند ہوتا ہے، اسی طرح خبیث شخص کا ہمہ جہت اور ہمہ وقت میلان خباثت کی طرف ہوتا ہے، دل میں بھی خباثت، زبان پر بھی خباثت اور اعضاء سے بھی خباثت کے جراثیم پائے جاتے ہیں لیکن وہ سچی توبہ کے ذریعے ان جراثیم کو ختم کرنے اور گناہوں سے اپنے آپ کو پاک کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، جب وہ اللہ کے حضور پیش ہوتے ہیں تو ان پر خباثت اور نجاست کا کوئی اثر نہیں ہوتا، ان کے برعکس جو توبہ نہیں کر سکیں گے اور طہارت اور خباثت دونوں مادوں کے ساتھ آخری عدالت میں پیش ہوں گے انہیں گندگی سے پاک کرنے کے لئے دوزخ میں ڈالا جائے گا تاکہ وہ جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو سکیں کیونکہ جنت میں کوئی بھی ناپاک شخص داخل نہیں ہو سکے گا، دوزخ میں انہیں اتنی ہی دیر رکھا جائے گا جتنی دیر میں ان کا خبث دور ہونے میں وقت لگے گا، چونکہ مشرک اور کافر کا عنصر بھی خبیث ہوتا ہے اور خباثت اس کے رگ و ریشہ میں رچی بسی ہوتی ہے اس لئے وہ دوزخ میں رہنے کے باوجود خباثت سے پاک نہیں ہو سکے گا چنانچہ وہ کبھی بھی جنت میں داخل ہونے کا حقدار نہیں ہوگا۔

جیسے کتے کو اگر سمندر میں ڈال کر کئی بار غسل دے دیا جائے تو بھی وہ پاک نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح مشرک پاک نہیں ہوسکتا، البتہ اگر وہ دنیا میں کفروشرک سے توبہ کرلیتا تو اس کا پاک ہونا ممکن تھا، دین سے دوری کی وجہ سے ہمارے ہاں پاک ناپاک اور حلال حرام کا امتیاز اٹھتا جارہا ہے، دولت کی ہوس نے بہت سوں کو اندھا کردیا ہے، وہ صرف دولت کے طلب گار ہیں چاہے وہ کسی بھی راستے سے اور کسی بھی طریقے سے آئے، ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن کا تقویٰ صرف پانی تک محدود ہوکر رہ گیا ہے، اگر پانی میں چڑیا گر کر مرجائے تو انہیں اس کی پاکی ناپاکی کی فکر ہوتی ہے لیکن رزق میں ہاتھی جتنا حرام بھی شامل ہوجائے تو انہیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔

اگر یہ نقطہ ملحوظ رہے کہ خبیث اور ناپاک مال سے کیا گیا نہ توحج اور عمرہ قبول ہوتا ہے، نہ صدقہ خیرات پر کوئی اجروثواب ملتا ہے، نہ مساجد اور مدارس میں چندہ دینے سے وہ پاک ہوسکتا ہے، بلکہ اس کے برعکس اس کے نتائج بڑے خطرناک ہوتے ہیں، دعائیں قبول نہیں ہوتیں، اولاد نافرمان ہوجاتی ہے، گھریلو زندگی تلخیوں سے بھر جاتی ہے، سکون اور اطمینان عنقا ہوجاتا ہے، اس نقطہ کے ملحوظ رکھنے سے ناپاک مال سے بچنا آسان ہوجاتا ہے۔

چند برے اَخلاق

قرآن کریم کی بے شمار آیات میں اچھے اخلاق کی تعریف کے ساتھ برے اخلاق کی مذمت بھی کی گئی ہے، اکثر و بیشتر برے اخلاق کی نسبت یہودیوں اور منافقوں کی طرف کر کے یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمان کی یہ شان نہیں کہ وہ اپنے دامنِ زندگی کو دشمنانِ اسلام والی عادتوں اور صفات کے ساتھ ملوث کرے۔ جھوٹ، وعدہ خلافی، غصہ میں آپے سے باہر ہو جانا، غیبت، حسد، تکبر اور خیانت ان قبیح اخلاق میں سے ہیں جن کی قرآن اور حدیث میں سخت مذمت بیان کی گئی ہے، یہ موقع نہیں کہ ان مذموم اخلاق کے حوالے سے قرآنی آیات ذکر کی جائیں، اس لیے ہم بالترتیب احادیث کے ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

جھوٹ:

جھوٹ وہ اخلاقی بیماری ہے جس نے جسدِ ملت کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے اور بہت کم افراد ہیں جو اس سے بچے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جھوٹ بولنا ایک فیشن اور ہماری ضرورت بن چکا ہے اور یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ جھوٹ کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا، نہ دوستی قائم رکھی جا سکتی ہے، نہ تعلقات خوشگوار ہو سکتے ہیں، نہ تجارت ہو سکتی ہے نہ دکان چل سکتی ہے، نہ سیاست اور حکومت کی جا سکتی ہے، چنانچہ ہر شعبے میں جھوٹ ہی کا چلن دکھائی دیتا ہے حالانکہ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹ کو منافق کی علامتوں میں سے ایک علامت قرار دیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''منافق کی تین نشانیاں ہیں وہ جب بات کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے، جب وعدہ کرتا ہے، وعدہ خلافی

کرتا ہے، اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرتا ہے۔“

(صحیح بخاری : ۱/۳۳، مسلم : ۵۹)

وعدہ خلافی:

وعدہ خلافی بھی جھوٹ ہی کی ایک صورت ہے اور مسلمانوں کے عوام وخواص میں یہ اخلاقی بیماری عام ہو چکی ہے، بڑے بڑے لوگ (یعنی جو لوگوں کی نظر میں بڑے ہوتے ہیں) وعدہ خلافی کرتے ہیں اور اسے کوئی عیب بھی نہیں سمجھتے، قرض لے کر بروقت ادا نہ کرنا، معین وقت پر تقریب کا آغاز نہ کرنا، کسی پروگرام میں شرکت کا وعدہ کر کے نہ پہنچنا، بیع وشراء کا معاہدہ کر کے پھر جانا، یہ سب وعدہ خلافی کی وہ صورتیں ہیں جن میں ابتلاء عام ہے جبکہ ہم اوپر پڑھ چکے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وعدہ خلافی کو بھی منافقت کی علامت قرار دیا ہے۔

مسلمان تو مسلمان ہمارے حضور نے کافر کے ساتھ وعدہ خلافی کو بھی بہت بڑا جرم قرار دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
”جس شخص نے کسی ایسے ذمّی کو قتل کیا جس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ ثابت ہو چکا تھا تو اس نے اللہ کا ذمہ توڑا ہے لہٰذا وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پا سکے گا حالانکہ اس کی خوشبو ستر سال کی مسافت سے محسوس ہو جاتی ہے۔ (جامع ترمذی)

غصہ:

غصہ برا بھی ہوتا ہے اور اچھا بھی ہوتا ہے، اگر اللہ کی رضا کے لیے اور دین اور حق کے معاملے میں غصہ آئے تو قابلِ تعریف ہے اور اگر ناحق غصہ آئے تو قابلِ مذمت ہے، غضب اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے، خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی اللہ کا کوئی حکم ٹوٹتا دیکھتے تھے تو آپ کو شدید غصہ آتا تھا، ایسے موقع پر غصہ آجانا یقیناً ایمان کی علامت ہے لیکن اگر کسی کو نفسانی خواہشات اور اغراض کی وجہ سے غصہ آئے یا غصہ تو حق بات پر ہی آئے مگر حد سے

بڑھ جائے تو وہ قابلِ مذمت ہوگا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن احادیث میں غصہ کی مذمت بیان فرمائی ہے، ان میں اسی قسم کا غصہ مراد ہے۔ حضرت عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''غصہ شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ کو پانی سے بجھایا جاتا ہے، لہٰذا جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اسے چاہئے کہ وہ وضو کرلے۔'' (سنن ابو داوٗد : ٤٧٨٤)

غیبت:

غیبت ایسا گناہ ہے جس کی وجہ سے غیبت کرنے والے کو جہنم میں بدبودار گندگی کھانی پڑے گی، وہ عذابِ قبر میں مبتلا ہوگا، غیبت کی وجہ سے ایمانی انوار ختم ہوجاتے ہیں، صاحبِ غیبت کو اللہ تعالیٰ بھی اس وقت تک معاف نہیں کرے گا جب تک کہ صاحبِ حق معاف نہ کرے، یہ ایک ایسا اجتماعی مرض ہے جس کی وجہ سے باہمی تعلقات خراب ہوتے ہیں اور محبت کا رشتہ ریزہ ریزہ ہوجاتا ہے مگر ان تمام مفاسد کے باوجود مسلمانوں کی اکثریت اس مرض میں مبتلا ہے نہ معلوم کتنے گھرانے اور ادارے اس مرض کی وجہ سے تباہی کا شکار ہوچکے ہیں۔

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم آپس میں خوب محبت اور خندہ روئی سے ملتے تھے اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کی غیبت نہیں کرتے تھے اور اسے سب سے بہتر عمل سمجھتے تھے اور اس کے خلاف کو منافقوں کی عادت سمجھتے تھے۔

(احیاء علوم الدین : ۱۵۲/۳)

حسد:

حسد کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر یہ آرزو کرنا کہ اس کے پاس یہ نعمت نہ رہے، حسد کے گناہ کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

قرآن کریم کی آخری دوسورتوں میں سے پہلی سورت میں حاسد کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے، یہود کو جو خطرناک امراض لاحق تھے ان میں سے ایک حسد بھی تھا اور یہی وہ مرض تھا جس نے انہیں ایمان سے محروم رکھا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی بندہ کے دل میں ایمان اور حسد جمع نہیں ہوسکتے۔

(النسائي: ۲۹۱۲)

تکبر:

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کفر کے چار ارکان ہیں: تکبر، حسد، غضب اور شہوت، تکبر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھے اور سب سے بڑا متکبر وہ ہے جو قبولِ حق سے بھی انکار کردے اور جو شخص فقر کے باوجود تکبر کرے وہ از حد قابلِ مذمت ہے، ایک عالم ربانی فرماتے ہیں کہ یوں تو تواضع سارے ہی انسانوں میں ایک قابلِ تعریف صفت ہے لیکن اغنیاء میں ہو تو بہت ہی زیادہ قابلِ تعریف ہے یونہی تکبر ساری مخلوق میں قبیح ہے مگر فقراء میں زیادہ قبیح ہے۔ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا اللہ اسے چہرے کے بل جہنم میں ڈال دے گا۔'' (مسند احمد: ۲/۲۱۵)

خیانت:

خیانت نفاق کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے، کسی معاشرہ میں خیانت کا عام ہوجانا اس بات کی علامت ہے کہ اب وہ زندگی کی حرارت سے محروم ہوچکا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم خیانت سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ (ابو داوٗد: ۱۵٤۷) اور آپ خائن مرد اور عورت کی گواہی قبول نہیں فرماتے تھے۔ (مسند احمد: ۲/۱۸۱)

اِسلام

اِسلام ''س، ل، م'' کے مادہ سے مأخوذ ہے، اس مادہ سے جتنے بھی الفاظ بنے ہیں وہ سب صحت اور عافیت پر دلالت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''سلامتی'' یہ ہے کہ انسان آفت اور مصیبت سے محفوظ رہے، اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ''سلام'' بھی ہے کیونکہ وہ ان تمام عیوب اور نقائص سے محفوظ ہے جو مخلوق کو لاحق ہوتے ہیں، لغت میں اسلام کا معنی ہے سلامتی میں داخل ہوجانا، شریعت کی اصطلاح میں ''اسلام'' کا معنی یہ ہے کہ اللہ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی دی جائے، نماز قائم کی جائے، زکوٰۃ ادا کی جائے، رمضان کے روزے رکھے جائیں، اگر طاقت ہوتو بیت اللہ کا حج کیا جائے۔ (بحواله نظرة النعيم : ٢/ ٣٢٠، ٣٢١)

امام ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں اسلام پانچ معانی میں استعمال ہوا ہے:

☆ اس دین کے نام کے طور پر جسے نظریۂ حیات کے طور پر قبول کیا جائے۔ سورۂ آل عمران میں ہے: ''بے شک اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہی ہے۔'' (١٩)

☆ توحید کے معنی میں، سورۂ مائدہ میں ہے: ''تورات کے مطابق وہ انبیاء فیصلے کرتے تھے جو عقیدۂ توحید رکھتے تھے۔'' (٤٤)

☆ بمعنی اخلاص، سورۂ بقرہ میں ہے: ''جب ابراہیم کو اس کے رب نے کہا اسلام لے آؤ تو انہوں نے عرض کیا میں رب العٰلمین کے لئے اسلام لا چکا ہوں۔ (یعنی میں خالص اسی کے لئے عبادت کرتا ہوں)'' (١٣١)

☆ اطاعت اور فرمانبرداری کے معنی میں، سورۂ آل عمران میں ہے: ''آسمانوں اور

زمین میں جو کچھ ہے وہ خوشی یا زبردستی سے اللہ کے فرمانبردار ہیں۔"(۸۳)

☆ زبان سے اقرار کے معنی میں، سورۂ حجرات میں ہے:" دیہاتی کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے آپ فرما دیجئے تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے (یعنی صرف زبان سے اقرار کیا ہے دل میں ایمان نہیں اترا۔"(۱۴)

(نزهة الاعين النواظر : ۱۳۶)

بعض حضرات کہتے ہیں کہ زبان سے اقرار اور اعضاء سے عمل کرنے پر بھی اسلام کا اطلاق ہوتا ہے۔ (نضرة النعیم : ۲/۳۲۳)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث جن میں کسی بھی انداز سے "اسلام" کا ذکر آیا ہے، ہم ان میں سے چند احادیث یہاں ذکر کرتے ہیں:

☆ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ کون سا اسلام بہتر ہے (اسلام کے اعمال میں سے کون سا عمل بہتر ہے) تو آپ نے فرمایا:" (بھوکوں کو) کھانا کھلاؤ اور ہر کسی کو سلام کرو خواہ تم اسے جانتے ہو یا نہ جانتے ہو۔" (صحیح بخاری : ۱/۲۱)

☆ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ جب وہ مرض الموت میں مبتلا تھے تو انہوں نے اپنا چہرہ دیوار کی طرف پھیر کر رونا شروع کر دیا، جب وہ بہت دیر روتے رہے تو ان کے بیٹے نے عرض کیا،" کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو فلاں خوشخبری نہیں سنائی تھی؟ حضرت عمرو اپنے بیٹے کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا ہم لوگ جس عمل کو سب سے افضل سمجھتے ہیں وہ ہے اللہ کے سوا کسی کے معبود نہ ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے کی شہادت! (پھر فرمایا کہ) میری زندگی تین احوال سے گزری ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی سے نفرت نہ تھی اور

میری سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ مجھے موقع ملے تو آپ کو (معاذ اللہ!) قتل کردوں، اگر اس حالت میں میرا انتقال ہو جاتا تو میں یقیناً اہلِ جہنم میں سے ہوتا، جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی محبت ڈال دی تو میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا کہ آپ اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایئے میں بیعت کرنا چاہتا ہوں، جب آپ نے اپنا دستِ مبارک آگے بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹالیا، آپ نے دریافت فرمایا اے عمرو! تم نے یوں کیوں کیا ہے؟ تو میں نے عرض کیا کہ میں ایک شرط لگانا چاہتا ہوں، آپ نے شرط کے بارے میں دریافت کیا تو میں نے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے گناہ معاف کردیئے جائیں، آپ نے فرمایا: کیا تم نہیں جانتے کہ اسلام، زمانۂ کفر کے گناہ مٹا دیتا ہے، اسی طرح ہجرت اور حج کی برکت سے بھی سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں (اسلام قبول کرنے کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ) مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی محبوب نہ تھا اور میری نظر میں آپ سے زیادہ کسی کی عظمت نہ تھی، آپ کی عظمت ہی کی وجہ سے مجھے کبھی آپ کو آنکھ بھر کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، اگر مجھ سے آپ کے سراپا کے بارے میں پوچھا جائے تو میں بیان نہیں کرسکوں گا کیونکہ میں نے آپ کو کبھی آنکھ بھر کر دیکھا ہی نہیں، اگر اس حالت میں مجھے موت آگئی تو مجھے امید ہے کہ میں اہلِ جنت میں سے ہوں گا، پھر (میری زندگی کا تیسرا دور وہ تھا جس میں) ہمیں ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا کہ میں ان کے انجام کے بارے میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوگا، پس جب میں انتقال کر جاؤں تو نہ تو میرے جنازے کے ساتھ کوئی رونے والی جائے اور نہ ہی آگ (یعنی آگ میں پکائی گئی اینٹیں وغیرہ) جب تم مجھے دفن کر چکو تو میرے اوپر کچھ مٹی ڈال دو اور مری قبر کے اردگرد اتنی دیر کھڑے رہو جتنی دیر میں اونٹ کو ذبح کیا جاتا ہے اور اس کا گوشت تقسیم کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ میں تم سے مانوس ہو جاؤں اور یہ سوچ سکوں کہ میں اپنے رب کے فرشتوں کو کیا

جواب دوں۔" (صحیح مسلم : ۱۲۱)

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اسلام اپنے ابتدائی دور میں غریب تھا، عنقریب اپنے ابتدائی دور کی طرح وہ دوبارہ غریب ہو جائے گا۔ پس خوشخبری ہے غریبوں کے لئے۔" (صحیح مسلم : ۱٤٥) ۔

عربی زبان میں غریب اجنبی کو کہتے ہیں، اسلام کا جب ظہور ہوا تھا تو وہ غریب اور اجنبی تھا، اس کے ساتھ جان پہچان رکھنے والے اور اسے قبول کرنے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ اجنبیت کا وہ دور اب دوبارہ واپس آ رہا ہے، ایسے لوگ بہت کم ہیں جو پورے کے پورے دین پر عمل کرنے والے ہیں، اور اسلام کی خاطر جذبات و خواہشات اور مفادات اور تعلقات کی قربانی دینے پر آمادہ ہیں۔

صورتحال کچھ ایسی بن گئی ہے کہ اسلام میں پورے پورے داخل ہونے والے مادیت پرست سوسائٹی میں اجنبی بن کر رہ جاتے ہیں، ان پر انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں، ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور انہیں دقیانوسیت اور قدامت پرستی کے طعنے دیئے جاتے ہیں، اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے طعن وتشنیع اور استہزاء کا نشانہ بننے والوں کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رضاءِ الٰہی اور جنت کے حصول کی خوشخبری سنائی ہے۔

☆ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کون سا اسلام (مسلمان) افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ (صحیح بخاری : ۱/۱۱ ، مسلم : ٤٢)

یہ سوال متعدد احادیث میں آیا ہے اور اس کا جواب ہر جگہ مختلف دیا گیا ہے، اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم، حالاتِ زمانہ اور انسانی نفسیات اور طبیعتوں پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے، فقر و فاقہ کے دنوں میں آپ سے جب سوال کیا گیا کہ

اسلام کا کون سا عمل بہتر ہے تو آپ نے فرمایا کہ غرباء اور مساکین کو کھانا کھلانا، اسی طرح اگر آپ نے محسوس فرمایا کہ سائل کے اندر حب مال کی بیماری پائی جاتی ہے تو آپ نے اس کے علاج کے طور پر فرمایا کہ تمہارے لئے بہترین عمل یہ ہے کہ تم اللہ کے بندوں پر خرچ کرو، بھوکوں کو کھلاؤ اور جو لباس کے محتاج ہیں انہیں لباس پہناؤ، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حالات اور اشخاص کے اعتبار سے اعمال کی قدر و قیمت گھٹتی بڑھتی ہے بہترین مسلمان وہ ہے جو ہر دور میں اسلام کے سارے ہی احکام کو زندہ رکھنے کی کوشش کرے۔

بغض وکینہ

باطنی گناہوں میں سے ایک خطرناک گناہ ''کینہ'' بھی ہے، عربی زبان میں اسے "حِقْد" کہا جاتا ہے۔ عربی لغت کے مشہور امام ابن منظور رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حقد'' یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے دل میں نفرت اور عداوت چھپائے رکھے اور انتقام لینے کے لیے کسی مناسب وقت کا انتظار کرتا رہے۔ (لسان العرب: ۱۵۴/۳) علامہ جرجانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اصل میں تو حقد طلبِ انتقام کو کہا جاتا ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی شخص فی الحال انتقام سے عاجز ہونے کی وجہ سے غصے کو دبانے کی کوشش کرتا ہے تو یہ غصہ بتدریج کینہ کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔'' (التعریفات: صـ ۹۵)

امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کینہ، ناجائز غصہ اور حسد تینوں باطن کے کبیرہ گناہوں میں سے ہیں اور ان تینوں کے درمیان ایک خاص ترتیب اور تلازم پایا جاتا ہے کیونکہ باطل غصے کے نتیجے میں کینہ اور کینے کے نتیجے میں حسد پیدا ہوتا ہے۔''

(الزواجر: ۵۲/۱)

جن بدنصیبوں کے دل میں کینے کا مرض پیدا ہو جاتا ہے وہ اس کی آگ میں جلتے رہتے ہیں، وہ جب دیکھتے ہیں کہ جن نعمتوں کی تمنا انہوں نے کی تھی وہ ان کی بجائے دوسروں کو حاصل ہو گئی ہیں، جس عزت اور مرتبے کے وہ امیدوار تھے اس پر کوئی دوسرا فائز ہو گیا ہے تو یہ چیز ان کی اندرونی آگ کو مزید بڑھکا دیتی ہے اور یوں وہ ابلیس کی خلافت اور نیابت کے حقدار بن جاتے ہیں کیونکہ ابلیس نے اپنے دل میں ایک بڑے مقام کی آرزو پال لی تھی اور خود ہی یہ طے کر لیا تھا کہ اس مقام کا مجھ سے زیادہ کوئی بھی استحقاق نہیں رکھتا، لیکن جب یہ مقام اس کی بجائے، خاکی انسان کو دے دیا گیا تو وہ جل بھن گیا اور اس نے قسم اٹھالی کہ میں

انسان سے انتقام لے کر رہوں گا اور جیسے میں ہدایت سے محروم ہوا ہوں انسان کو بھی اس سے محروم رکھنے کی پوری کوشش کروں گا، اس بد بخت نے اللہ تعالیٰ سے زندگی کی مہلت نہ تو توبہ کے لئے مانگی اور نہ ہی اپنی آخرت سنوارنے کے لیے، بلکہ اس نے محض اس لئے مہلت مانگی تا کہ وہ انسانوں کو راہِ راست سے ہٹا سکے، یہی وہ ابلیسی آگ ہے جو ہر کینہ ور کے سینے میں جلتی رہتی ہے، بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہیں کوشش کے باوجود شیطان بتوں کی عبادت میں تو نہیں لگا سکتا لیکن اس نے انہیں خطرناک باطنی گناہوں میں مبتلا کر رکھا ہے، انسانوں کے اس ابتلاءِ عام کو دیکھ کر شیطان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا بالخصوص جب دلوں میں بغض وحسد اور عداوت وکینہ کی آگ شعلہ زن ہوتی ہے تو وہ خوشی سے دیوانہ ہو جاتا ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ یہ آگ ان کے فضائل وکمالات، ان کی باہمی محبت اور برادرانہ تعلقات سمیت ہر چیز کو بھسم کر کے رکھ دے گی، اگر دل میں نفرتوں کی آگ لیے ہوئے کسی کا انتقال ہو گیا تو وہ آتشِ دوزخ کا مستحق ٹھہرے گا۔ مغفرت کے حقدار تو بس وہی ہوں گے جو "سلیم القلب" ہوں گے، جن کے دل نفرت اور عداوت سے پاک ہوں گے، یہ وہ خوش نصیب ہوں گے جو دنیا میں کسی کے پاس کوئی نعمت دیکھتے تھے تو اللہ کی رضا اور قضا پر راضی رہتے تھے اور جب مخلوق میں سے کسی کو تکلیف میں مبتلا دیکھتے تھے تو تڑپ اٹھتے تھے۔

قرآنِ کریم میں ان کینہ وروں کا ذکر آیا ہے جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامِ بلند اور مسلمانوں کی روز افزوں عزت کو دیکھ کر بغض اور کینہ کی بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے۔

سورۃ البقرہ میں ہے: "بعض لوگوں کی دنیاوی غرض کی باتیں آپ کو خوش کر دیتی ہیں اور وہ اپنے دل کی باتوں پر اللہ کو گواہ کرتا ہے حالانکہ دراصل وہ زبردست جھگڑالو ہے، جب وہ لوٹ کر جاتا ہے تو زمین میں فساد پھیلانے کی اور کھیتی اور نسل کی بربادی کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ فساد کو ناپسند کرتا ہے۔" (سورة البقرة : ٢٠٤، ٢٠٥)

☆ احادیث نبویہ میں بھی اس ہلاکت خیز بیماری کی مذمت آئی ہے۔ حضرت ابوثعلبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نصفِ شعبان کی رات بندوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ پس ایمان والوں کی مغفرت فرما دیتا ہے اور کافروں کو مہلت دے دیتا ہے اور کینہ وروں کا معاملہ اس وقت تک مؤخر کر دیتا ہے جب تک کہ وہ کینہ سے باز نہ آجائیں۔'' (الترغيب و الترهيب : ٤٦١/٣)

☆ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جن لوگوں کے اندر تین بیماریاں نہ ہوں، ان میں سے جسے چاہتا ہے اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے:

١- جس شخص کا اس حال میں انتقال ہو جائے کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو۔

٢- وہ ساحر نہ ہو کہ ساحروں کے پیچھے پڑا رہے۔

٣- اپنے مسلمان بھائی سے بغض اور کینہ دل میں نہ رکھتا ہو۔''

(الترغيب و الترهيب : ٤٦١/٣)

☆ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: ''چغل خوری اور کینہ دوزخ میں لے جانے والی ہیں اور یہ کہ مسلمان کے دل میں یہ دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔''

(الترغيب و الترهيب : ٤٩٨،٤٩٧/٣)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے دلوں کو بغض وکینہ سے محفوظ رکھتے تھے اور اسے بہت بڑی نیکی شمار کرتے تھے۔

☆ زید بن اسلم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لیے ان کے پاس گیا، میں نے دیکھا کہ ان کا چہرہ خوشی سے چمک رہا ہے، کسی نے اس

خوشی کی وجہ کے بارے میں سوال کیا تو فرمایا: ''مجھے اللہ کے ہاں اپنے دو اعمال کی قبولیت کی سب سے زیادہ امید ہے ایک تو یہ کہ میں اپنے آپ کو فضول گوئی سے بچا کر رکھتا ہوں، دوسرا یہ کہ میرا دل مسلمانوں کے بارے میں بالکل صاف ہے اور اس میں کسی کے لیے نفرت و عداوت نہیں۔ (نزهة الفضلاء : ۱/ ٤٢)

حقیقت یہ ہے کہ کینہ اپنے دامن میں اتنے دینی اور دنیاوی نقصانات کو لیے ہوئے ہے کہ ایک سمجھدار انسان جب ان نقصانات پر ایک نظر ڈالتا ہے تو اس موذی بیماری سے اپنے آپ کو بچانے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ آیئے ان نقصانات پر ایک نظر ڈال لیں:

۱- کینہ ور کی ساری زندگی حزن والم میں گزرتی ہے، اسے کبھی سکون نصیب نہیں ہوتا۔

۲- کینہ ایسا خطرناک قلبی مرض ہے، جس کی وجہ سے اندیشہ یہ ہے کہ کہیں ایمان ہی دل سے نہ نکل جائے۔

۳- کینہ ایک شیطانی وسوسہ ہے اور اس وسوسہ کو وہی قبول کرتا ہے جو عقل سے پیدل ہوتا ہے۔

۴- کینہ ور، اللہ کے غضب کا مستحق ہو جاتا ہے اور اسے دنیا اور آخرت میں خسارے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۵- کینہ ور ایک گمراہ شخص ہوتا ہے، راہِ راست سے بھٹکا ہوا، تنگ دل، تنگ ذہن، تقدیر سے نابلد۔

٦- کینہ کی وجہ سے باہمی الفت و محبت ختم ہو جاتی ہے، اختلافات جنم لیتے ہیں اور قتل و قتال تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

۷- کینہ انسان کے عیوب کو ظاہر کر دیتا ہے اور اس کی باطنی غلاظت کو کسی نہ کسی انداز میں ظاہر کر دیتا ہے۔ (نضرة النعيم : ١٠/ ٤٤٤٠)

حسد

حسد ایک بدترین بیماری اور مہلک گناہ ہے، جس کی حقیقت یہ ہے کہ کسی کے پاس دین یا دنیا کی نعمت دیکھ کر دل میں جلنا اور یہ آرزو کرنا کہ یہ نعمت اس سے چھن جائے، حسد کرنے والا حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی تقسیم اور تقدیر پر اعتراض کرتا ہے کہ اس نے یہ نعمت فلاں کو کیوں عطا کی مجھے کیوں نہیں دی، سب سے پہلے حسد کا گناہ ابلیس نے کیا تھا جب حضرت آدم علیہ السلام کو خلافت عطا کی گئی، وہ انسان کی یہ عظمت وتوقیر برداشت نہ کرسکا اور جل بھن گیا، یہ حسد ہی کی بیماری تھی جس نے یہود کو ایمان جیسی عظیم دولت اور نعمت سے محروم رکھا، وہ یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ آخری نبی بنی اسرائیل میں مبعوث ہوگا لیکن جب ان کی امید کے برخلاف جناب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسمٰعیل میں پیدا ہوگئے تو وہ حسد میں مبتلا ہوگئے، سورۂ نساء میں ہے "اللہ نے لوگوں کو جو اپنا فضل نبوت عطا کر رکھا ہے، کیا اس پر یہ حسد کرتے ہیں۔" (سورة نساء : ٥٤)

حق واضح ہوجانے کے باوجود وہ خود بھی ایمان سے محروم رہے، اور جو لوگ ایمان قبول کر چکے تھے ان کے بارے میں بھی وہ یہ تمنا کرتے رہے کہ اے کاش! یہ ایمان کے نور سے محروم ہو کر دوبارہ کفر کی تاریکی میں لوٹ آئیں، اس تمنا کی بنیادی وجہ بھی ان کا حسد ہی تھا، گویا ان کی حالت "خود تو ڈوبے ہیں تجھے بھی لے ڈوبیں گے صنم" کا مصداق تھی، سورۂ بقرہ میں ہے: "بہت سے اہلِ کتاب اپنے دل کے حسد کی وجہ سے یہ چاہتے ہیں کہ ایمان لاچکنے کے بعد تم کو پھر کافر بنادیں حالانکہ ان پر حق واضح ہوچکا ہے۔" (سورة البقرة : ١٠٩)

اللہ تعالیٰ کی نظر میں مرضِ حسد کے خوفناک ہونے کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے قرآن کریم کی آخری دو سورتوں میں سے پہلی سورت میں مسلمانوں کو حاسد

کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد احادیث میں حسد کی مذمت اور حسد سے بچنے کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم لوگ حسد سے بچے رہو کیونکہ حسد نیکیوں کو ایسے کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔''

(ابو داؤد)

☆ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگلی امتوں کی مہلک بیماری یعنی بغض وحسد تمہاری طرف چلی آ رہی ہے، یہ بالکل صفایا کر دینے والی اور مونڈ دینے والی ہے (پھر اپنا مقصد واضح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا) میرے اس کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ یہ بالوں کو مونڈ دینے والی ہے بلکہ یہ دین کو مونڈ دیتی ہے اور اس کا بالکل صفایا کر دیتی ہے۔'' (ترمذی: ۲۵۱۰)

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک تفصیلی حدیث کے آخر میں ہے: ''کسی بندے کے دل میں ایمان اور حسد جمع نہیں ہو سکتے۔'' (سنن نسائی: ۲۹۱۲)

☆ حضرت ضمرہ بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگ اس وقت تک خیر میں رہیں گے جب تک کہ آپس میں حسد سے بچے رہیں گے۔'' (المنذري في الترغيب والترهيب: ۳/۵۴۷))

حسد کے بارے میں چند صحابہ کرام، علماء اور حکماء کے اقوال بھی ملاحظہ فرمائیے:

☆ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''برے اخلاق میں سے حسد سے زیادہ عدل والا خلق کوئی نہیں جو کہ محسود تک حسد کے اثرات پہنچنے سے پہلے حاسد کو ختم کر دیتا ہے۔'' (ادب الدنيا والدين: ۱۷۶)

یہ بھی آپ ہی کا قول ہے کہ ''میں حاسد کے سوا ہر شخص کو خوش کر سکتا ہوں، حاسد تو

صرف نعمت کے زوال پر ہی خوش ہوتا ہے۔" (الاحیاء : ۲۰۱/۳)

☆ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے: "اے آدم کے بیٹے! تم اپنے بھائی سے کیوں حسد کرتے ہو، اگر اللہ تعالیٰ نے اس کی کرامت وشرافت کی وجہ سے نعمت عطا کی ہے تو تم ایسے شخص سے کیوں حسد کرتے ہو جسے اللہ نے عزت وکرامت بخشی ہے اور اگر کسی اور وجہ (آزمائش وغیرہ) سے اسے کچھ عطا کیا گیا ہے تو تم ایسے شخص سے کیوں حسد کرتے ہو جس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔" (الاحیاء : ۲۰۱/۳)

☆ سلف میں سے کسی کا قول ہے کہ آسمانوں پر سب سے پہلا جو گناہ ہوا وہ حسد تھا کیونکہ ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام پر حسد کیا اور زمین پر بھی سب سے پہلا گناہ جو ہوا وہ حسد تھا یعنی آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے نے دوسرے پر حسد کیا یہاں تک کہ اسے قتل کردیا۔" (ادب الدنیا والدین : ۱۷۶)

☆ ایک حکیم کا قول ہے کہ جو شخص اللہ کے فیصلے پر راضی ہو اسے کوئی پریشان نہیں کرسکتا اور جو اللہ کی عطا پر قناعت کرے وہ حسد میں مبتلا نہیں ہوسکتا۔

(ادب الدنیا والدین : ۱۷۶)

حسد میں بہت سارے نقصانات ہیں، جن میں سے بعض درج ذیل میں ملاحظہ ہوں:

۱۔ حسد اللہ کو ناراض کرنے کا ذریعے ہے کیونکہ حاسد اللہ تعالیٰ کو عادل نہیں سمجھتا۔

۲۔ حسد سے دل میں حسرتیں پیدا ہوتی ہیں، جسم بیماریوں کا شکار ہوجاتا ہے اور شفا کی بھی کوئی صورت نہیں ہوتی۔

۳۔ حاسد کو لوگ نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں، وہ خود بھی سب کو اپنا دشمن سمجھتا ہے، چنانچہ اس کا کوئی بھی دوست نہیں ہوتا۔

۴۔ حسد، دل میں بغض اور کینہ کی پرورش کرتا ہے۔

۵۔ حسد، اخلاقی گراوٹ اور نفس کی خست اور کمینگی کی دلیل ہے۔

اگر کوئی شخص حسد کی بیماری میں مبتلا ہو جائے تو اس سے شفایابی کے کئی علاج علماء نے بیان کئے ہیں:

۱۔ اللہ کی طرف رجوع کرے، اسلامی تعلیمات پر عمل کرے، محنت اور ریاضت کرتے ہوئے نفس کا تزکیہ کرے۔

۲۔ حسد کے برے نتائج اور نقصانات کے بارے میں غور و فکر کرتا رہے۔

۳۔ بتکلف ہی سہی، محسود کے لئے دعاءِ خیر کا معمول بنالے۔

۴۔ اللہ کی تقدیر پر راضی رہے اور یہ جان لے کہ میں اللہ کے فیصلوں پر کبھی غالب نہیں آسکتا۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حاسد کے شر سے بچنے کے لئے محسود کو چند اسباب اختیار کرنے چاہئیں:

۱۔ حاسد کے شر سے اللہ کی پناہ مانگے اور اس کی طرف متوجہ رہے۔

۲۔ تقویٰ اختیار کرے اور شریعت پر عمل کرنے میں اللہ سے ڈرتا رہے۔ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے، اس کی حفاظت اللہ تعالیٰ خود کرتا ہے۔

۳۔ دشمن کی کمینی حرکتوں کے جواب میں صبر کرے، دشمن کے شر سے بچنے کے لئے صبر سے مؤثر چیز کوئی نہیں۔

۴۔ اللہ پر توکل کرے، جو شخص اللہ پر توکل کرتا ہے، اللہ اسے کافی ہو جاتا ہے۔

۵۔ حاسد کے بارے میں زیادہ غور و فکر نہ کرے، نہ اس سے خوفزدہ ہو اور نہ ہی اسے زیادہ اہمیت دے۔

۶۔ جہاں تک ممکن ہو صدقہ خیرات کرے کیونکہ مصائب و آلام کو دفع کرنے میں صدقہ

بڑی عجیب تاثیر رکھتا ہے۔

۷۔ آخری سبب ہے تو ذرا مشکل، لیکن حاسد کی آتشِ حسد بجھانے اور اللہ کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں بڑا مؤثر ہے، وہ یہ کہ جوں جوں حاسد کے حسد میں اضافہ ہوتا جائے یہ اس کے ساتھ صدقہ اور احسان کا معاملہ بڑھاتا جائے، خود رب کریم نے بھی قرآن کریم میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ سورۂ فصلت میں ہے: ''نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتے، برائی کو بھلائی سے دفع کرو پھر وہی شخص تمہارا قلبی دوست بن جائے گا جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی تھی اور یہ بات انہیں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کریں اور اسے بڑے نصیب والوں کے سوا کوئی نہیں پا سکتا۔''

(فصلت : ٣٤، ٣٥، (نوٹ) حسد کے نقصانات اور اس سے شفایابی کے علاج ماخوذ از نضرۃ النعیم : ١٠/٤٤١٩، ٤٤٢٠، ٤٤٢٩)

حماقت

عقل و دانش، اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، جبکہ اس کے مقابلے میں حماقت اور بیوقوفی ایک وبال ہے، جس کا نقصان خود احمق کو بھی ہوتا ہے اور بسا اوقات دوسرے لوگ بھی اس کے نقصان سے محفوظ نہیں رہتے۔ اہلِ علم نے حماقت کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”حماقت یہ ہے کہ فساد اور خرابی کا علم ہونے کے باوجود کسی چیز کو غیر محل میں رکھنا۔“ (لسان العرب : ۱۰/۶۸)

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”احمق اس شخص کو کہا جائے گا جو قبح اور فساد کا علم ہونے کے باوجود ایسا عمل کرے جو اسے نقصان دے۔“

(صحیح مسلم بشرح النوّوی : ۱۸/۳۶)

مناوی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے: ”عقل میں فساد کو حماقت کہا جاتا ہے۔“

(التوقیف علی مهمات التعاریف : ۱٤۷)

ابن جوزی رحمہ اللہ نے حماقت اور دیوانگی میں فرق یہ کیا ہے کہ ”احمق وہ ہوتا ہے جس کا مقصد صحیح ہوتا ہے مگر وہ اس کے لیے غلط وسیلہ اور طریقہ اختیار کرتا ہے جبکہ دیوانہ اسے کہا جائے گا جس کے اختیار کردہ وسیلہ اور مقصود دونوں میں خلل ہوتا ہے، جیسا کہ مشہور ہے کہ ایک بے وقوف رئیس کا پرندہ اڑ گیا تو اس نے فوری طور پر شہر کے دروازے بند کرنے کا حکم دے دیا (وہ یہ نہ جان سکا کہ پرندہ کو شہر سے باہر نکلنے کے لیے دروازے سے گزرنے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ فضا ہی میں پرواز کرسکتا ہے) اب ان رئیس صاحب کا مقصود تو صحیح تھا کہ وہ پرندہ پکڑنا چاہتے تھے مگر انہوں نے اس کے لیے طریقہ غلط اختیار کیا۔“

(اخبار الحمقی : ۲۷)

قرآن کریم کی وہ تمام آیات جن میں غور وتدبر کرنے اور عقل سے کام لینے کا حکم دیا گیا ہے یا یوں کہا گیا ہے کہ ''اس میں نشانیاں ہیں عقل والے کے لیے'' یا ''عبرتیں ہیں غور وتدبر کرنے والوں کے لیے'' تو یہ آیات عقل ودانائی کی فضیلت اور عظمت پر دلالت کرتی ہیں، اس کے برعکس جن آیات میں ان لوگوں کی مذمت بیان کی گئی ہے جو سوچتے سمجھتے نہیں، تو ان آیات سے بے وقوفی کی قباحت سمجھ میں آتی ہے۔

سورۂ فرقان میں ہے: ''مجھے بتلایئے کہ جس شخص نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے کیا آپ اس پر وکیل ہوں گے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان میں سے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں، نہیں یہ تو بس چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔''

(سورۂ فرقان : ٤٣، ٤٤)

سورۂ اعراف میں ہے: ''اور ہم نے جہنم کے لیے بہت سارے جن اور انسان پیدا کیے ہیں، ان کے دل ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں، وہ تو چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں، یہی نہیں غافل اور بے خبر۔'' (سورۂ اعراف : ١٧٩)

یہ عجیب بات ہے کہ ہر دور کے احمق اپنے آپ کو عقلمند اور اہلِ عقل کو بے وقوف سمجھتے رہتے ہیں، منافقوں ہی کو دیکھ لیجیے! جو دھوکہ اور فراڈ، بزدلی اور مفاد پرستی کو اپنی دور اندیشی بتاتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان واخلاص، ایثار واحسان اور قول وفعل کی یکسانیت کو بے وقوفی بتاتے تھے، سورۂ بقرہ میں ہے: ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لے آؤ جیسے لوگ (صحابہ) ایمان لے آئے تو وہ کہتے ہیں کیا ہم ایمان لے آئیں جیسے بے وقوف ایمان لے آئے؟ (اللہ فرماتے ہیں) سن لو! یہی (منافق) ہی بے وقوف ہیں لیکن وہ جانتے نہیں ہیں۔'' (سورۂ بقرۃ : ١٣)

احادیث کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں بھی حماقت کا ذکر ملتا ہے، مثلاً ترمذی کی ایک روایت میں ہے: ''مجھے دو احمق اور فاجر آوازوں سے منع کیا گیا ہے ایک وہ آواز جو مصیبت کے وقت ہو جس میں چہرے کو نوچا جائے اور گریبان پھاڑ دیا جائے، دوسرے شیطان کی آواز۔'' (ترمذي : ١٠٠٥)

کتاب وسنت کے بعد حماقت کے بارے میں صحابہ کرام اور علماء وصلحاء کے چند اقوال اور آثار کا بھی مطالعہ کر لیجئے:

☆ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے سورۂ انفطار کی وہ آیت پڑھی جس میں اللہ تعالیٰ سوال کرتا ہے: ''اے انسان! تجھے اپنے کریم رب کے بارے میں کس چیز نے دھوکے میں ڈالے رکھا'' تو انہوں نے جواب میں کہا ''الحمق یارب'' (اے رب حماقت نے تیرے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا تھا)

☆ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''ہر شخص کے اندر کچھ نہ کچھ حماقت ہوتی ہے، اسی کے ساتھ وہ زندگی گزارتا ہے۔''

☆ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''احمق شخص کے اندر کوئی دوسری صفت پائی جائے یا نہ پائی جائے مگر دو عادتیں اس میں ضرور ہوں گی: ایک یہ کہ وہ جواب فوراً دیتا ہے (غور وفکر کی ضرورت محسوس نہیں کرتا) دوسری یہ کہ وہ کثرت سے چہرہ پھیرتا ہے۔''

☆ امام اصمعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر تم ایک ہی نشست میں کسی شخص کی عقل کا معیار جاننا چاہو تو اس کے سامنے کوئی ایسی بات بیان کرو جس کی کوئی اصل نہ ہو، اگر تم دیکھو کہ اس نے خوب توجہ سے بات سنی ہے اور اسے قبول بھی کر لیا ہے تو جان لو کہ وہ احمق ہے اور اگر وہ اس پر اعتراض کرے تو اسے عقلمند سمجھو۔''

☆ امام جعفر صادق رحمہ اللہ کا قول ہے: ''احمق کے سامنے تربیت اور ادب کی باتیں

کرنا ایسے ہے جیسے حنظل (ایلوا) کی جڑوں میں پانی دینا، اسے جتنا زیادہ سیراب کیا جائے گا اس کی کڑواہٹ میں مزید اضافہ ہوگا۔''

☆ ابن ابی زیاد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مجھے میرے والد نے نصیحت کی تھی: ''میرے بیٹے! اہلِ عقل سے دوستی لگانا اور ان کی صحبت اختیار کرنا اور احمقوں سے بچ کر رہنا کیونکہ میرا تجربہ یہ ہے کہ میں جب کبھی احمقوں کی مجلسوں میں بیٹھا میں نے اپنی عقل میں کچھ نقصان اور فتور محسوس کیا۔''

☆ ابو حاتم بن حیان رحمہ اللہ کا ارشاد ہے: ''حماقت کی چند علامتیں ہیں، جواب دینے میں سرعت، تحمل، تدبر اور سنجیدگی سے پہلوتہی، بہت زیادہ ہنسنا، کثرت سے منہ پھیرنا، نیک انسانوں کی برائی کرنا، بروں سے میل ملاپ رکھنا، اگر تم احمق سے اعراض کرو تو اس کے ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں اگر تم اس پر توجہ دو تو وہ دھوکے کا شکار ہو جاتا ہے، اگر تم اس کے سامنے بردباری سے کام لو تو وہ تم پر مزید جری ہو جائے گا، اگر تم اس کے ساتھ اچھائی کرو تو وہ برائی کرے گا اگر تم انصاف کرو تو وہ ظلم کرے گا۔''

☆ خلیل بن احمد رحمہ اللہ کا قول ہے: لوگ چار قسم کے ہیں:

ایک وہ شخص جو صاحبِ علم ہے اور اسے اس کی خبر بھی ہے تو یہ عالم ہے اس سے علم حاصل کرو۔

دوسرا وہ جو صاحبِ علم تو ہے مگر اسے اس کی خبر نہیں، یہ شخص نسیان کا شکار ہے اسے یاد دلاؤ۔

تیسرا وہ شخص جو کچھ نہیں جانتا اور اسے احساس ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا تو یہ طالب ہے اسے تعلیم دو۔

چوتھا وہ شخص جو بے علم ہے مگر اسے اپنے بے علم ہونے کا احساس نہیں یہ احمق ہے اسے

اپنے حال پر چھوڑ دو۔

☆ امام ابو اسحاق فرمایا کرتے تھے: ''اگر تمہیں یہ اطلاع ملے کہ کوئی غنی فقیر ہو گیا، یا فقیر غنی ہو گیا ہے یا زندہ انتقال کر گیا ہے تو تم ان سب باتوں کی تصدیق کر دو! لیکن اگر تمہیں یہ بتایا جائے کہ کوئی احمق، عقلمند ہو گیا ہے تو اس اطلاع کی تصدیق نہ کرو۔''

(تمام اقوال نضرة النعيم : ١٠)

☆ ابراہیم نظام رحمہ اللہ سے کسی نے سوال کیا کہ ''حماقت کی حد کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ تم نے ایسی چیز کے بارے میں سوال کیا ہے جس کی کوئی حد نہیں۔''

مختصر یہ کہ حماقت بہت بڑی آفت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنی چاہئے کہ اس کے شر سے بچا کر رکھے، قرآن کریم کی کثرت کے ساتھ تلاوت سے حماقت کے شر سے بچا جا سکتا ہے۔

خیانت

خیانت، امانت کی ضد ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے ایمان والو! اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو اور اپنی امانتوں میں خیانت نہ کرو۔'' (سورۃ انفال : ۲۸)

امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: خیانت اور نفاق دونوں ایک ہی ہیں مگر خیانت کا اطلاق عہد اور امانت کے اعتبار سے کیا جاتا ہے اور نفاق کا اطلاق دین کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ (لصائر ذوی التمیز : ۲/۵۸۲)

قرآن کریم میں خیانت کا لفظ چار معانی میں استعمال ہوا ہے:

۱۔ معصیت، سورۂ بقرہ کی آیت: ۱۸۷ میں ہے: ''اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کرو گے۔'' یعنی اپنے کو معصیت میں مبتلا کرو گے۔

۲۔ عہد شکنی، سورۂ انفال کی آیت ۵۸ میں ہے: ''اگر تمہیں کسی قوم سے خیانت (عہد شکنی) کا اندیشہ ہو تو برابری کی حالت میں ان کا عہدنامہ توڑ دو۔''

۳۔ ترکِ امانت، سورۂ نساء کی آیت ۱۰۵ میں ہے: ''اور تم خیانت کرنے والوں کے حمایتی نہ بنو''۔ یہ آیتِ کریمہ طعمہ بن ابیرۃ کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو منافق تھا اور اس نے خیانت کا ارتکاب کیا تھا۔

۴۔ دین میں مخالفت، سورۂ تحریم کی آیت ۱۰ میں ہے: (حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما اسلام دونوں کی بیویاں) دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں انہوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کی۔ (یعنی دین میں مخالفت کرتے ہوئے ایمان قبول نہ کیا)

(نزھة الاعین النواظر : ۲۸۱، ۲۸۳)

خیانت کبیرہ گناہوں میں سے ایک گناہ ہے اور اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

منافق کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیانت سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے آپ کی مسنون دعاؤں میں سے ایک اہم دعاء ہے جو تمام خواتین وحضرات کو یاد کرلینی چاہئے، یہاں ہم اس کا مفہوم درج کررہے ہیں: ''اے اللہ! میں بھوک سے تیری پناہ مانگتا ہوں کیوں کہ وہ بہت برا ساتھی ہے اور خیانت سے تیری پناہ مانگتا ہوں کیونکہ وہ بہت برا رازدان دوست ہے۔'' (ابو داؤد: ١٥٤٧)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشنگوئی فرمائی تھی کہ بہترین زمانہ ختم ہونے کے بعد خیانت کرنے والوں کی کثرت ہوجائے گی۔ صحیح بخاری میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: ''سب سے بہترین زمانہ میرا ہے پھر ان لوگوں کا جو میرے بعد آئیں گے پھر ان کے بعد والوں کا۔ حضرت عمران کہتے ہیں مجھے یاد نہیں کہ آپ نے اس کے بعد دو زمانوں کا ذکر کیا یا تین کا، آپ نے فرمایا تمہارے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو خائن ہوں گے، اور ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکے گا، وہ خواہ مخواہ گواہی دینے کے لئے تیار ہوجائیں گے حالانکہ ان سے گواہی کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہوگا، وہ نذر مانیں گے مگر اسے پورا نہیں کریں گے اور ان کے اندر موٹاپا ظاہر ہوجائے گا۔'' (بخاري: ٢٦٥١)

اس پیشنگوئی میں بیان کی گئی علامات یوں تو ''خیر القرون'' کے بعد بھی ظاہر ہونا شروع ہوگئی تھیں لیکن جیسے جیسے قیامت قریب آرہی ہے، یہ علامات گھنگور گھٹاؤں کی طرح پورے معاشرے پر چھاتی جارہی ہیں، یوں لگتا ہے کہ کوئی مرد اور عورت بھی ان سے محفوظ نہیں رہے گا، حکومت وسیاست، عدلیہ اور انتظامیہ کے پورے نظام پر نظر ڈالیں تو خیانت کا تسلط اور اثرات دکھائی دیں گے، کوئی بھی تو ایسا نہیں جسے یہ احساس ہو کہ یہ عہدہ واقتدار، کرسی اور منصب میرے پاس امانت ہے اور اس میں خیانت حرام ہے، دفتر میں وقت پر پہنچنے کی پابندی نہیں کی جاتی، جب چاہیں جائیں اور جب چاہیں چھٹی کرلیں، دفتر میں ضروری نہیں

کہ سارا وقت عوام کی خدمت ہی میں صرف کیا جائے بلکہ زیادہ تر وقت گپ شپ، سودے بازی اور رشوت کے لین دین میں ضائع ہو جاتا ہے، اگر کوئی افسر بالا تک پہنچنے میں کامیاب ہو بھی جائے تو ضروری نہیں کہ اس کا کام ہو ہی جائے اکثر کوٹر خادیا جاتا ہے۔ ہاں اگر کوئی رشوت دینے کی سکت رکھتا ہو یا اس کے پاس تگڑی سفارش ہو تو اس کا نہ صرف کام کر دیا جاتا ہے بلکہ اسے چائے بھی پیش کی جاتی ہے۔

تجارت اور کاروباری معاملات کو دیکھیں تو یوں لگتا ہے کہ تاجروں اور دکانداروں نے یہ بات کسی عقیدے کے طور پر ذہن نشین کر لی ہے کہ خیانت کے بغیر کاروبار چل ہی نہیں سکتا، ہر کوئی ڈنڈی مارنے کی کوشش کرتا ہے، کم تولنے، ملاوٹ کرنے، نمبر دو کو نمبر ایک کے نام سے بیچنے کی بیماری عام ہے، جان بچانے والی دوائیوں سے لے کر روزمرہ کے استعمال کی اشیاء تک ہر جگہ خیانت ہوتی ہے، مالک، ملازم سے اور ملازم مالک سے خیانت کرتا ہے۔

اپنے گھروں میں جھانک کر دیکھیں تو یہاں بھی خیانت کی نحوست ڈیرہ ڈالے دکھائی دے گی، شوہر بیوی سے اور بیوی شوہر سے خیانت کر رہی ہے، اس خیانت نے والدین اور اولاد کے مقدس رشتے تک کو نہیں بخشا پھر حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ جو امین ہیں، انہیں خائن کہا جا رہا ہے اور جو خائن ہیں انہیں امین بنا کر پیش کیا جا رہا ہے، ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بھی پیشگوئی فرما دی تھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”عنقریب لوگوں پر ایسا وقت آئے گا جب جھوٹے کو سچا اور سچے کو جھوٹا قرار دیا جائے گا، امانتدار کو خائن اور خائن کو امانتدار سمجھا جائے گا۔“

(ابن ماجہ : ٤٠٣٦)

یہ جو ہم دیکھ رہے ہیں کہ نااہلوں کو عہدوں سے نوازا جاتا ہے اور جو اہل اور حقدار ہیں انہیں محروم رکھا جاتا ہے تو یہ بھی خیانت ہی کی ایک صورت ہے بلکہ کسی بھی محکمہ اور ادارہ میں

خیانت تب عام ہوتی ہے جب وہاں نااہل اور زر پرست مسلط ہو جاتے ہیں۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بھی قیامت کی نشانی بتایا تھا، صحیح بخاری میں ہے کہ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کیا گیا کہ کب آئے گی تو آپ نے فرمایا: ''جب امانت کو ضائع کیا جائے تو تم قیامت کا انتظار کرو''،عرض کیا گیا کہ امانت کو ضائع کرنے کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''جب عہدے نااہلوں کے حوالے کئے جائیں تو قیامت کا انتظار کرو۔'' (بخاري : ٥٩)

ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں سے بھی خیانت کرنے سے باز نہیں آتے جبکہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکوں کے ساتھ بھی خیانت کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے، کہا جاتا ہے کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے، جو شخص جنگ میں بھی اخلاقی اصولوں اور روایات کی پاسداری نہیں کرے گا وہ کیسے جنگ کر سکے گا؟

ہم یورپ خصوصاً امریکی فوج کو دیکھ رہے ہیں جو اخلاقیات کے ٹھیکیدار ہونے کے دعوے کرتے نہیں تھکتے کہ وہ عراق اور افغانستان بلکہ پوری دنیا میں مسلمانوں کے خلاف اخلاقی اقدار کا کیسے خون کر رہی ہے لیکن نبی امّی صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کے اس دور میں جبکہ متمدن قومیں بھی جنگ میں سب کچھ جائز ہونے کا فتوٰی دے رہی تھیں، آپ جب اپنے صحابہ کو جہاد کے لئے روانہ فرماتے تو انہیں خاص طور پر تاکید فرماتے:

" اغزوا و لا تغلّوا و لا تغدروا و لا تمثلوا و لا تقتلوا و ليدا ."

''جاؤ جنگ کرو مگر خیانت نہ کرنا، عہد شکنی نہ کرنا، کسی مقتول کی بے حرمتی نہ کرنا اور بچوں کو قتل نہ کرنا'' (صحيح مسلم : ٢/ ٢٤)

ایک حدیث میں آپ نے فرمایا جو غیر مسلم (ذمی) کے ساتھ خیانت اور عہد شکنی کرے

گا قیامت کے دن میں اس ذمی کی طرف سے وکیل بن کر پیش ہوں گا۔

اللہ اکبر! کہاں یہ مبارک اور پیاری تعلیمات ہیں جو ذمی اور دشمن کے ساتھ بھی خیانت کی اجازت نہیں دیتیں اور کہاں ہم ہیں جو اپنے کلمہ گو بھائی بہنوں بلکہ اللہ اور رسول کے ساتھ بھی خیانت کو روا رکھے ہوئے ہیں، اسی لئے ہر دن کا نیا سورج ہماری ذلت اور رسوائی کی نئی خبر لے کر طلوع ہوتا ہے۔

اَمر بالمعروف ونہی عن المنکر

سورۂ آلِ عمران میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو خیر کی دعوت دے، نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔''

(سورۃ آلِ عمران: ۱۰٤)

سورۂ آلِ عمران ہی میں دوسری جگہ ہے: ''تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے فائدے کے لئے نکالا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔''

(سورۃ آلِ عمران: ۱۱۰)

معروف اور منکر ایک دوسرے کی ضد ہیں، معروف ہر ایسے عمل کو کہا جاتا ہے جسے شریعت، عقل اور عرف کے اعتبار سے انسان اچھا سمجھیں اور منکر ایسا عمل ہوتا ہے جو ان تینوں اعتبار سے قبیح ہو لیکن اگر عقل اور عرف خدانخواستہ، شریعت سے ٹکرائیں تو فیصلہ کن حیثیت شریعت کو حاصل ہوگی، بگڑی ہوئی عقل اور فساد زدہ عرف اور معاشرہ کو یہ حق نہیں دیا جاسکتا کہ وہ معروف کو منکر اور منکر کو معروف قرار دے دے اسی لئے ''لسان العرب'' میں ''معروف'' کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ ''یہ ایک جامع لفظ ہے جس کا اطلاق ہر ایسے عمل پر ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت، اس کے تقرب اور انسانوں کے ساتھ احسان پر مشتمل ہو اور شریعت نے اس کی تعریف کی ہو۔'' اور منکر کا اطلاق ہر ایسے عمل پر ہوتا ہے جس کی شریعت نے قباحت اور حرمت بیان کی ہو اور اس سے منع کیا ہو۔

(لسان العرب: ۵/۲۳۲، ۲۳۳)

☆ امام ابوحامد غزالی رحمہ اللہ نے ''احیاء علوم الدین'' میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو دین کا قطبِ اعظم اور مقصدِ عظیم قرار دیا ہے، جس کی خاطر تمام انبیاء علیہم السلام کو

بھیجا گیا، اگر اس کی بساط لپیٹ دی جائے اور اس کا علم وعمل نہ رہے تو کارِ نبوت معطل ہو جائے گا، دیانت مضمحل ہو جائے گی، ضلالت عام ہو جائے گی، جہالت کا غلبہ ہو جائے گا، ہر طرف فساد پھیل جائے گا، آبادیاں ویران ہو جائیں گی، انسان ہلاک ہو جائیں گے لیکن انہیں اپنی ہلاکت کا علم قیامت سے پہلے نہیں ہو سکے گا۔

اس کے بعد امام غزالی رحمہ اللہ بڑے دکھ کے ساتھ کہتے ہیں کہ افسوس یہ ہے کہ ہمیں جس بات کا اندیشہ تھا وہ رونما ہو چکی ہے، اس قطبِ اعظم کا علم اور عمل ختم ہو کر رہ گیا ہے اس کی حقیقت مٹ گئی ہے، دلوں پر مخلوق کی محبت اور خوف چھا گیا ہے خالق کی طرف توجہ نہیں رہی، لوگ نفسانی خواہشات اور شہوات کی اتباع میں حیوانوں کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں، روئے زمین پر ایسے سچے مومن بہت کم رہ گئے ہیں جو اللہ کے لئے ملامت کرنے والوں کی ملامت خاطر میں نہ لاتے ہوں۔ (احیاء علوم الدین: ۲/۳۰۶)

☆ امام غزالی رحمہ اللہ نے اس دکھ کا اظہار صدیوں پہلے اس وقت کیا تھا جب ایسے لوگ موجود تھے جو حق اور سچ کی خاطر اپنی جان پر کھیل جاتے تھے جن کی حق گوئی کی درخشاں مثالیں مردہ دلوں میں زندگی کی امنگ پیدا کر دیتی تھیں، آج تو صورتحال اس سے کہیں زیادہ ابتر ہے کیونکہ دنیا کا زیادہ سے زیادہ حصول مسلمان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بن کر رہ گیا ہے، کیا چھوٹے اور کیا بڑے سب خواہشات کی غلامی اور شہوات کی بندگی اختیار کر چکے ہیں، مخلوق کو ناراض کرنے کے مقابلے میں اللہ کو ناراض کرنا بہت آسان سمجھا جاتا ہے۔

مروّت، مصلحت، حکمت اور سیاست جیسے خوشنما الفاظ کے پردے میں بد نیتی، ضمیر فروشی اور حق پوشی کا کاروبار پورے زور وشور سے چل رہا ہے، بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھا کر معروف کو منکر اور منکر کو معروف ثابت کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، جب تاویلاتِ فاسدہ کے ذریعے شر کو خیر اور خیر کو شر ثابت کر دیا جائے گا تو نہ امر بالمعروف کی

ضرورت رہے گی اور نہ ہی نہی عن المنکر کی، کورچشموں کو ہر طرف ''سب اچھا'' دکھائی دے گا، سود کا نام پرافٹ ہوگا اور موسیقی روح کی غذا قرار پائے گی، ہر فیشن زمانے کی ضرورت ہوگا اور یہود و ہنود کی دوستی کو مصلحت کہا جائے گا، فلمیں دیکھنا ''حقائق'' جاننے کے لئے ضروری ہوگا اور تھوڑی سی شراب ''جسمانی فٹنس'' کے لئے مفید سمجھی جائے گی، آزادیِ نسواں کے نام پر بے حجابی کو سندِ جواز دے دی جائے گی، تعلیمی، معاشرتی اور دفتری ضروریات کے تحت مرد وزن کا اختلاط ''فقیہِ شہر'' کے خیال میں معیوب نہیں ہوگا گویا نہ بانس رہے گا اور نہ ہی بانسری بجے گی، یہی وہ پرفتن دور ہے جس کے آثار بہت حد تک واضح ہو چکے ہیں اور رہی سہی کسر پوری کرنے کی سرکاری سطح پر بھرپور کوششیں ہو رہی ہیں۔

☆ امام غزالی رحمہ اللہ کی طرح نامور محدث امام نووی رحمہ اللہ کو بھی یہی شکوہ تھا، وہ صحیح مسلم کی شرح میں لکھتے ہیں: ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا اکثر حصہ طویل زمانے سے ضائع ہو چکا ہے اور اس زمانے میں اس کے بہت تھوڑے سے نشانات باقی رہ گئے ہیں حالانکہ یہ شریعت کا عظیم باب ہے اور تمام معاملات کی اصلاح اور درستگی کا مدار اسی پر ہے، جب خباثت کی کثرت ہو جائے گی اللہ کا عذاب صالح اور طالح ہر ایک پر آئے گا، جب لوگ ظالم کا ہاتھ نہیں روکیں گے تو پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''جو لوگ اللہ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں انہیں ڈرنا چاہئے کہ ان پر کوئی فتنہ یا دردناک عذاب آجائے، لہٰذا جو لوگ آخرت کے طالب اور رضا الٰہی کے حصول کے آرزومند ہیں انہیں اس باب کو خصوصی اہمیت دینی چاہئے کیونکہ اس کا نفع بہت زیادہ ہے خاص طور پر اس وقت جب کہ اس کا بڑا حصہ مٹ چکا ہے۔'' (صحیح مسلم بشرح نووی: ۲/۲٤)

امام نووی اور امام غزالی رحمہ اللہ جیسے حضرات ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' پر جو اس قدر زور دیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خود قرآن اور حدیث میں اس پر بڑا زور دیا گیا

ہے اس موضوع سے متعلق دو آیات کا ترجمہ آپ اسی مضمون کے شروع میں پڑھ چکے ہیں، چند احادیث بھی سن لیجیے:

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو، قبل اس کے کہ تم دعائیں کرو لیکن تمہاری دعائیں قبول نہ ہوں۔'' (ابن ماجہ : ٤٠٠٤)

☆ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بنی اسرائیل میں جو پہلی خرابی پیدا ہوئی وہ یہ تھی کہ ایک (نیک) شخص کسی (گناہوں میں مبتلا شخص سے ملتا تو اسے سمجھاتا کہ اللہ سے ڈرو اور جو کچھ کر رہے ہو وہ چھوڑ دو اس لئے کہ یہ تمہارے لئے حلال نہیں ہے، پھر جب دوبارہ اس سے ملتا تو اس کے گناہ اسے اس کے ساتھ خورد ونوش اور اٹھنے بیٹھنے سے مانع نہ ہوتے جب وہ ایسے ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل ایک جیسے کر دیے...... آخر میں آپ نے فرمایا ''اللہ کی قسم! تم نیکی کا حکم دیتے رہنا اور برائی سے منع کرتے رہنا اور ظالم کا ہاتھ روکتے رہنا، اسے حق کی طرف مائل کرتے رہنا اور حق تک محدود رکھنے کی کوشش کرتے رہنا۔ (مسند احمد : ١/٣٩١)

☆ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے، بعض کے ادا کرنے سے باقی کے ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے لیکن اگر کسی نے بھی اسے ادا نہ کیا تو سبھی گناہ گار ہوں گے۔ (صحیح مسلم بشرح النووی : ١/٢٤) ظاہر ہے امام نووی رحمہ اللہ کا مقصد اجتماعی سطح پر اس کے حکم کو بیان کرنا ہے ورنہ گھر اور خاندان کی سطح پر ہم میں سے ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اس فریضہ کو ادا کرے، اس فریضہ کو ادا کر کے ہی ہم اللہ کے عذاب سے بچ سکتے ہیں۔

حکمِ الٰہی سے اِعراض

سورۃ النساء کی آیت/ ۶۰ کا مفہوم ہے: ''کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کا دعویٰ ہے کہ وہ اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو کلام آپ کی طرف نازل کیا گیا اور اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا، وہ چاہتے ہیں کہ (اپنے تنازعات میں فیصلہ کے لیے) شیطان کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں شیطان کے انکار کا حکم دیا گیا ہے اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں دور کی گمراہی میں جاڈالے۔''

امام ابنِ کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس آیتِ کریمہ میں ان لوگوں کی تردید کی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر اور سابق انبیاء پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن جب ان کے درمیان اختلافات اور تنازعات سر اٹھاتے ہیں تو پھر وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو چھوڑ دیتے ہیں اور انسانوں کے خودساختہ قوانین کے مطابق فیصلے کروانا پسند کرتے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ کے شانِ نزول سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ اصل میں ایک انصاری مسلمان (جو کہ حقیقت میں منافق تھا) اور یہودی کے درمیان کسی مسئلہ میں اختلاف ہوگیا یہودی چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدل پروری اور حق پرستی سے آگاہ تھا اس پر اس نے آپ ہی کے سامنے یہ مقدمہ پیش کرنے پر اصرار کیا جبکہ منافق کی رائے یہ تھی یہود کے سردار کعب بن اشرف کے پاس چلتے ہیں، یہودی کے اصرار کو دیکھتے ہوئے وہ منافق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوگیا، آپ نے فریقین کی بات سننے کے بعد یہودی کے حق میں فیصلہ کردیا، منافق نے باہر آکر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جانے کی ضد کی، اس کا خیال ہوگا کہ چونکہ آپ کفر کے معاملے میں بڑے سخت

اور یہود و نصاریٰ کے لیے ننگی تلوار ہیں، اس لئے وہ یقیناً یہودی کے خلاف ہی فیصلہ فرمائیں گے، وہ شاید یہ حقیقت نہیں جانتا تھا کہ حضرت عمر ہوں یا کوئی دوسرے صحابی، کفار کی دشمنی کے باوجود عدل و انصاف ہی کا ساتھ دیتے ہیں اور اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی وہ ظلم اور زیادتی نہیں کرتے، جب سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوکر دونوں نے اپنا اپنا موقف پیش کیا جس کے ضمن میں یہ بھی بتادیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہودی کے حق میں فیصلے فرما چکے ہیں تو آپ نے یہ فرماتے ہوئے تلوار سے منافق کی گردن اڑادی کہ ''جو شخص رسول اللہ کے فیصلے پر راضی نہیں اس کا فیصلہ میں یونہی کروں گا۔''

مسلمان بحیثیتِ مسلمان اس امر کا پابند ہے کہ وہ اپنی مذہبی، معاشرتی، تجارتی، سیاسی، ازدواجی اور خاندانی زندگی کے تمام اختلافات کو کتاب وسنت کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کرے، قبیلوں، خاندانوں، جماعتوں خصوصاً کافروں کے بنائے ہوئے قوانین کو شریعت کے قوانین پر ترجیح دینا ایک مسلمان کی شان نہیں، بعض اوقات ایسا کرنا انسان کو کفر تک پہنچادیتا ہے اور بعض صورتوں میں بندہ اعتقادی کافر تو نہیں ہوتا مگر عملی کفر کا مرتکب ہوجاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حکموں سے اعراض کی وجہ سے اعتقادی کافر ہوجانے کی ذیل کی چند صورتیں ہیں:

۱۔ احکامِ الٰہیہ کے مبنی برحق ہونے سے انکار کردے۔

۲۔ ان کی حقانیت اور صداقت سے تو انکار نہ کرے لیکن اس کا عقیدہ یہ ہو کہ کتاب و سنت کے مقابلے میں انسانوں کے قوانین زیادہ بہتر ہیں۔

۳۔ انسانوں کے قوانین کو بہتر تو نہ سمجھے مگر کتاب وسنت کے برابر خیال کرے۔

۴۔ نہ بہتر سمجھے، نہ برابر سمجھے، لیکن اس کا اعتقاد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ

وسلم کے حکم کے خلاف فیصلہ کرنا جائز ہے۔

عملی کفر کی صورت یہ ہے کہ کتاب و سنت پر ایمان کے باوجود محض شہوات اور خواہشات کی اتباع میں شریعت سے روگردانی کرے، ایسا کرنے کی وجہ سے اگرچہ کوئی شخص ملت اسلامیہ سے تو خارج نہیں ہوتا مگر یہ روگردانی اور اعراض کرنا زنا، شراب نوشی اور چوری ڈاکے کی طرح کبائر میں سے ایک کبیرہ گناہ ہے۔

سورۂ مائدہ کی آیت ۴۴، ۴۵ اور ۴۷ میں ان لوگوں کے بارے میں بڑے سخت الفاظ آئے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، پہلی آیت میں ایسے انسانوں کو کافر، دوسری آیت میں ظالم اور تیسری آیت میں فاسق قرار دیا گیا ہے۔

انگریزی قوانین کو تو رکھئے ایک طرف، اگر کوئی شخص اپنے مذہبی رہنما، شیخ اور پیر کی بھی شارع علیہ السلام کی طرح اتباع کو واجب سمجھنے لگے تو اسے بھی شرک کا مرتکب سمجھا جائے گا۔

جب سورۂ توبہ کی وہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی، جس میں نصاریٰ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کو چھوڑ کر رب بنا رکھا ہے" (سورۂ توبہ: ۳۱) تو حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم اپنے علماء و مشائخ کو رب تو نہیں سمجھتے تھے آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں تھا کہ وہ جس چیز کو حلال کہتے تھے تم بھی اسے حلال اور جسے وہ حرام کہتے تھے تم بھی اسے حرام سمجھنے لگتے تھے، انہوں نے عرض کیا ہاں ایسا تو ہوتا تھا۔ آپ نے فرمایا یہی ہے مشائخ اور علماء کا رب تسلیم کرنا۔

آخر میں ہم اللہ کے حکموں سے اعراض کے چند نقصانات بیان کرتے ہیں:

۱۔ کتاب و سنت کو چھوڑ کر انسانوں کے خود ساختہ قوانین میں زندگی کے مسائل کا حل تلاش کرنے والا اللہ تعالیٰ کے غضب کا مستحق ہو جاتا ہے۔

۲۔ قلق، اضطراب، پریشانیاں اور نفسیاتی بیماریاں ایسے شخص کو چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں۔

۳- وضعی قوانین کی اتباع سے جرائم پرورش پاتے ہیں اور ظلم وزیادتی کی روک تھام مشکل ہوجاتی ہے جبکہ اسلامی نظام کو دستورِ حیات بنانے سے مجرموں اور جرائم کا قلع قمع ہوجاتا ہے۔

۴- انسانی دستور کا دل میں احترام نہ ہونے کی وجہ سے اس کی خلاف ورزی کثرت سے ہوتی ہے، جونہی کسی کا داؤ لگتا ہے وہ اسے پاؤں تلے روند دیتا ہے جبکہ دستورِ اسلامی کا احترام دل میں ہوتا ہے، نہ تنہائی میں اس کی خلاف ورزی کی جاتی ہے اور نہ ہی سرِ عام اس کی بے حرمتی کی جاتی ہے۔

ملکِ عزیز پاکستان کو "لا الٰہ الا اللہ" کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے حاصل کیا گیا تھا اور اس کے لیے لاکھوں انسانوں نے قربانیاں دی تھیں، لیکن اس کے حصول کے مقاصد آج تک حاصل نہیں ہوسکے، حکومت سے عدالت تک ہر جگہ قوانینِ الٰہیہ کی بے حرمتی کا سلسلہ جاری ہے، ہم ایک منافقانہ سی زندگی گزار رہے ہیں، اپنے آپ کو مسلمان ضرور کہتے ہیں، لیکن اپنے اختلافات اور جھگڑوں میں کتاب وسنت کی حکمرانی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، اس حکم عدولی اور اعراض نے ہمیں آدھے ملک سے محروم کردیا ہے جبکہ باقی آدھا ملک بھی چراغِ سولی بنا ہوا ہے۔ حکمرانوں اور سیاستدانوں سے قطع نظر افراد کا بھی یہ حال ہے کہ قرآن کریم کی روزانہ تلاوت اور پھر اس کی عظمت کو تسلیم کرنے کے باوجود ایسے حضرات انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جو بلاچوں وچراں زندگی کے ہر شعبے میں قرآن کریم کی بالادستی تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں۔

خباثت

آج کے درس کے آغاز سے قبل دو باتوں کا جان لینا اس پورے سلسلۂ درس کی اہمیت اور افادیت سمجھنے کے لیے مناسب ہوگا:

☆ پہلی بات یہ کہ تمام مذاہب میں عموماً اور اسلام میں خصوصاً اخلاق کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے، یہاں تک کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاقِ حسنہ کی تعلیم کو اپنی بعثت کا مقصد بتایا ہے، اچھے اخلاق سے اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے، دشمن کو دوست، اجنبی کو اپنا اور کفار کو ایمان کے قریب لانے میں بھی اچھے اخلاق کلیدی کردار ادا کرتے ہیں جبکہ آج مسلمانوں کی عملی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی اکثریت کی عملی زندگی سے اخلاقِ حسنہ خارج ہو کر رہ گئے ہیں اور ان کی جگہ برے اخلاق نے لے لی ہے، جھوٹ، وعدہ خلافی، خیانت، بغض وعداوت، غیبت اور بدگوئی عام ہوگئی ہے۔ اس اخلاقی تنزل اور ابتری کی وجہ سے ''درسِ قرآن وحدیث'' میں زیادہ تر اخلاق ہی کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔

آج کل اخلاقِ قبیحہ کے بارے میں سلسلہ وار درس جاری ہے، جس کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ کسی ایک خلق کو بطورِ عنوان مقرر کیا جاتا ہے اور پھر اس کے بارے میں قرآن کریم کی وہ آیات اور احادیث جن میں اس کا ذکر آیا ہوتا ہے وہ بیان کی جاتی ہیں، اگر صحابہ کرام یا مشہور علماء اور صلحاء نے اس خلق کے بارے میں کچھ فرمایا ہو تو ان کے آثار و اقوال لکھے جاتے ہیں اور ممکن ہو تو آخر میں اس کے نقصانات بھی بتائے جاتے ہیں۔

☆ دوسری بات یہ جان لیں کہ ان دروس کی ترتیب اور تحریر میں سعودیہ سے شائع شدہ اور وہاں کے معتبر علماء کی ایک کمیٹی کی مرتب کتاب سے استفادہ کیا جاتا ہے، بارہ جلدوں میں شائع ہونے والی اس کتاب کا نام " نضرة النعيم في اخلاق الرسول الكريم "

ہے۔کسی دوسری کتاب میں بھی اگر موضوع کی مناسبت سے کوئی مفید بات یا پُر اثر واقعہ نظر آجائے تو اسے بھی لے لیا جاتا ہے۔

ان دو تمہیدی باتوں کے بعد اب آئیے! ہم آج کے عنوان کے بارے میں کچھ گفتگو کرلیں، خبث اور خباثت ہر قسم کی ردی اور ناپسندیدہ چیز کو کہا جاتا ہے، خبیث کا لفظ طیب کی ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے، کفر اور حرام پر بھی خبیث کا اطلاق ہوتا ہے، وہ دعاء تو آپ سب کو یاد ہوگی جو بیت الخلاء میں داخل ہونے سے پہلے پڑھی جاتی ہے:

" اللّٰهم انی أعوذبك من الخبث و الخبائث ."

اس دعاء میں ''خبث'' سے مراد کفر اور ''خبائث'' سے مراد شیاطین ہیں۔

(نضرة النعيم : ۱۰/٤٤٥٩)

ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ''خبث'' دوا کے استعمال سے منع فرمادیا ہے، دوا میں خباثت دو وجہ سے ہوسکتی ہے:

ایک نجاست کی وجہ سے جو کہ حرام ہے، جیسے: شراب، بول و براز اور ہر قسم کی نجاستیں۔

دوسری وجہ کسی دوا کو خبیث کہنے کی اس کا بدمزہ اور بدذائقہ ہونا ہے، اس معنی کے اعتبار سے ''خبیث دوا'' کے استعمال سے منع کرنے کی وجہ یہ ہوگی کہ کڑوی کسیلی اور بدمزہ دوا کا استعمال کرنا بعض طبیعتوں پر بڑا شاق گزرتا ہے، اسی لئے لہسن اور پیاز کھا کر مسجد میں آنے سے منع فرمایا گیا ہے اور انہیں خبیث قرار دیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ دونوں پاک اور حلال ہیں، لیکن ان کی بدبو اور ذائقے کی وجہ سے انہیں خبیث کہا گیا ہے۔

قرآنِ کریم میں خبیث کا لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے:

۱- ردّی اور برے کے معنی میں......سورۂ نساء/ ۲ میں یتیموں کے ورثا سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ''یتیموں کے عمدہ اور پاک مال کو اپنے ردی اور برے مال سے

نہ بدلو۔"

۲۔ حرام کے معنی میں...... سورۂ مائدہ/ ۱۰۰ میں ہے"حرام اور حلال برابر نہیں ہو سکتے، اگر چہ تمہیں حرام کی کثرت اچھی لگے۔"

۳۔ کافر کے معنی میں ...... سورۂ آل عمران/ ۱۷۹ میں ہے"لوگو! جب تک اللہ ناپاک (کافر) کو پاک (مومن) سے الگ نہ کر دے گا مومنوں کو اس حال میں جس میں تم ہو ہرگز نہیں رہنے دے گا۔"

۴۔ کلمہ کفر کے معنی میں...... سورۂ ابراہیم/ ۲۶ میں ہے"ناپاک بات (کلمہ کفر) کی مثال ناپاک درخت کی سی ہے۔" (کہ اس کی نہ جڑ مضبوط ہے نہ شاخیں بلند ہیں)

۵۔ بداصل کے معنی میں...... سورۂ اعراف/ ۵۸ میں ہے"جو زمین پاکیزہ ہے اس میں سے سبزہ بھی پروردگار کے حکم سے نفیس ہی نکلتا ہے اور جو خراب (بداصل) ہے اس میں سے جو کچھ نکلتا ہے ناقص ہوتا ہے۔"

٦۔ نقصان دہ کے معنی میں...... سورۂ اعراف/ ۱۵۷ میں ہے"اللہ تعالیٰ کے نبی ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتے ہیں اور ناپاک"نقصان دہ" چیزوں کو ان پر حرام کرتے ہیں۔" (نضرة النعيم : ١٠/٤٤٦٢، ٤٤٦٣)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے ارشادات میں خبیث کے لفظ کو مختلف معانی میں استعمال فرمایا ہے، لیکن زیادہ تر یہ لفظ گندگی، گناہ، حرام، فساد، خرابی اور میل کچیل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثال کے طور پر صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ آپ سے سوال کیا گیا کہ"کیا صلحاء کی موجودگی کے باوجود ہم اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ہلاک ہو جائیں گے؟ تو آپ نے فرمایا:"ہاں! جب خباثت عام ہو جائے گی۔" (بخاری . ٧٠٥٩)

اس حدیث میں خباثت کا لفظ حرام، گندگی اور گناہ کے معنی میں آیا ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''بخار کو گالی نہ دو کیونکہ یہ انسانوں کے گناہوں کا ازالہ کردیتا ہے جیسے کہ بھٹی لوہے کی خباثت (میل کچیل) کو دور کردیتی ہے۔''

(مسلم: ۲۵۷۵)

اردو زبان میں ''خبیث'' گندے، بدباطن اور شریر انسان کو کہا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اسلامی تعلیمات کے اعتبار سے پلید اور بد باطن ہونا جہنمیوں کی صفت ہے، جنت میں ایسے لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے اس شخص پر جنت کو حرام کردیا ہے جس کے دل میں نجاست اور خباثت پائی جاتی ہے، کوئی خبیث شخص جنت میں داخل نہیں ہوسکتا، جس شخص کی فطرت میں خباثت پائی جاتی ہو جیسے کہ کافر ہے وہ تو کبھی بھی جنت میں داخل نہیں ہوسکتا، لیکن جس کے اندر عارضی طور پر خباثت ہو جیسے کہ گناہ گار مسلمان تو وہ اس خباثت سے پاک ہونے کے بعد دخولِ جنت کا حقدار ٹھہرے گا، پاک ہونے کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ وہ دنیا میں توبہ کرلے، دوسری یہ کہ اسے پاک کرنے کے لیے کچھ عرصہ جہنم میں رکھا جائے پھر بہشت میں داخل کردیا جائے۔'' (اغاثۃ اللّھفان: ۱/۵٦)

آخر میں ایک اہم امر کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ بعض حضرات خصوصاً والدین اور اساتذہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بچوں کو خبیث کہہ دیتے ہیں، یہ عادت بہت بری ہے اور اسے جلد از جلد چھوڑ دینا چاہیے۔

ذِلت

سورۂ آلِ عمران: ۲۳ میں ہے: ''فرمادیجئے اے اللہ! بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے، اور جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کردے، ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے، یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے۔''

ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا ایمان ہے کہ اس کارخانۂ عالم کو چلانے والا اللہ تعالیٰ ہے، اس کے ذرے ذرے میں صرف اسی کا کلمہ چلتا ہے، سب فقیر اور عاجز ہیں، غنی اور قدرت واختیار والا صرف اللہ تعالیٰ ہے، سب کے اقتدار عارضی ہیں، صرف اسی کے اقتدار کو دوام حاصل ہے، ہم ایسے نظارے اکثر دیکھتے ہیں کہ آج کے امیر کل کے فقیر اور کل کے فقیر آج کے امیر ثابت ہوتے ہیں، تخت والے تختہ کے حقدار بن جاتے ہیں اور عزت والے ذلیل وخوار ہونے پر مجبور ہوجاتے ہیں، یہ سب کچھ خود بخود نہیں ہورہا بلکہ کائنات کا ایک مالک اور بادشاہ ہے جس کے حکم پر یہ ساری اکھاڑ پچھاڑ ہورہی ہے مگر نہ تو وہ ظالم ہے نہ ہی بے خبر ہے، اس کا ہر فیصلہ عدل اور حکمت پر مبنی ہوتا ہے، ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی شخص عزت کا مستحق ہو اور وہ اسے ذلیل کردے، یا کوئی ذلت کے سارے اسباب فراہم کرلے مگر رب تعالیٰ اسے عزت کی مسند پر بٹھادے، وہ جسے عزت دیتا ہے وہ واقعی عزت کا مستحق ہوتا ہے اور جسے ذلیل کرتا ہے وہ واقعی ذلت کا سزاوار ہوتا ہے۔

یہود ایک ایسی ہی قوم تھی جس نے ذلت کے سارے اسباب اپنے اندر جمع کرلئے تھے، حب مال، حُب جاہ، ایمان فروشی، حرص وہوس، بخل اور کمینگی، بغض وحسد، دنیا کی زندگی سے شدید محبت، فرقہ واریت اور اختلافات غرضیکہ ذلت کا وہ کونسا سبب تھا جو ان کے اندر موجود نہیں تھا، انہی اسباب کی بناء پر دائمی ذلت ان کا مقدر ٹھہر گئی، سورۂ بقرہ/ ۶۱ میں اللہ

تعالیٰ نے یہود پر ذلت مسلط کئے جانے کے ساتھ بعض اسبابِ ذلت بھی بیان فرمائے ہیں ارشاد ہوتا ہے: ''اور بالآخر ذلت اور محتاجی ان پر مسلط کر دی گئی، وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گئے یہ اس لئے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور اس کے نبیوں کو ناحق قتل کر دیتے تھے اور یہ اس لئے (بھی) کہ وہ نافرمانی کئے جاتے اور حد سے بڑھ جاتے تھے''۔

سورۂ اعراف/ ۱۵۲ میں بچھڑے کو معبود بنانے والوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہونے اور دنیا میں ذلیل وخوار ہونے کا ذکر کرنے کے ساتھ یہ بھی بتادیا گیا ہے کہ جو کوئی بھی ان جیسی حرکت کرے گا اسے یہی سزا دی جائے گی، فرمایا گیا کہ ''بے شک وہ لوگ جنہوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا انہیں ان کے رب کی طرف سے غضب اور دنیا کی زندگی میں ذلت حاصل ہو کر رہے گی اور ہم افتراء کرنے والوں کو اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں''۔

یہود ابتداء ہی سے ذلیل نہ تھے، وہ تو اپنے حقیقی عروج کے زمانے میں دنیا کی سب سے معزز اور افضل قوم تھے، اقوامِ عالم میں سے کوئی قوم بھی ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی تھی، سورۂ بقرہ/ ۴۷ میں اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے اس احسان کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اے بنی اسرائیل! میرے وہ احسانات یاد کرو جو میں نے تم پر کئے تھے اور یہ کہ میں نے تمہیں جہان کے لوگوں پر فضیلت بخشی تھی۔''

جب تک عزت وفضیلت کے اسباب ان کے اندر موجود رہے وہ مکرم ومشرف بن کر زندگی گزارتے رہے لیکن جب انہوں نے ذلت کے اسباب اختیار کر لئے تو پھر انبیاء کی اولاد ہونا اور بڑے بڑے دعوے ان کے کام نہ آسکے، مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے ایک وقت تھا کہ یہ دنیا کی سب سے معزز اور محترم قوم تھے، بڑی بڑی سپر طاقتوں کو انہوں نے اپنے قدموں تلے روند ڈالا تھا، اقوامِ عالم تہذیب وثقافت اور علوم واخلاق سیکھنے کے لئے ان کی طرف رجوع کرتی تھیں، صنعت وحرفت میں بھی ان کا کوئی ثانی نہ تھا، ان کے حسنِ

کردار کی مثالیں دی جاتی تھیں، ان کے اندازِ جہاں بانی اور طرزِ حکمرانی کو غیر مسلم اپنانے کی کوشش کرتے تھے، ان کے معاملات اور ان کی تجارت جھوٹ اور دھوکہ فریب سے پاک ہوتی تھی لیکن رفتہ رفتہ ان کی مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور تجارتی زندگی میں بھی یہود جیسی کمزوریوں نے راہ پالی اور ان کے ذہنوں میں بھی یہ بات بیٹھ گئی کہ کردار و عمل کے بغیر محض کھوکھلے نعروں اور دعوؤں سے ہم اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے مستحق رہیں گے، وہ ذلت کے سارے اسباب اختیار کر لینے کے باوجود عزت کو اپنے گھر کی لونڈی اور جاہ واقتدار کو زرخرید غلام سمجھنے لگے۔

ان کی تاریخ میں چونکہ نامور فاتح، مایۂ ناز حکمران اور سرمایۂ انسانیت علماء اور حکماء گزرے تھے اس لئے عرصۂ دراز تک وہ اپنے آباء کے سہارے زندگی گزارتے رہے اور ان کے نام لے لے کر اپنے مخالفین کو ڈراتے رہے لیکن ظاہر ہے یہ کھوکھلے نعرے ہمیشہ تو کام نہیں آسکتے تھے، بتدریج دشمنوں کے قلوب سے ان کی ہیبت اٹھ گئی اور وہ ان کی نظر میں سیلابی خس و خاشاک کی مانند ہو گئے اور آج کی حالت دیکھ کر تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے کبھی عزت کے دن دیکھے ہی نہیں، اقوامِ عالم پر غلبہ واقتدار انہیں کبھی حاصل ہی نہیں رہا۔

سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ ہی میں اس کی پیشگوئی فرمادی تھی، ابو داؤد کی روایت ہے آپ نے فرمایا "جب تم ناجائز خرید و فروخت کرنے لگو گے، بیل کی دم پکڑ لو گے، کھیتی باڑی پر قناعت کر لو گے، جہاد چھوڑ دو گے تو اللہ تم پر ایسی ذلت مسلط کر دے گا جس سے تم دین کی طرف رجوع کئے بغیر نجات نہیں پا سکو گے۔"

(ابو داؤد: ٣٤٦٢)

اس مبارک فرمان کا حاصل یہی ہے کہ جب مسلمان دنیا کو اپنا مقصدِ زندگی بنالیں گے،

حلال اور حرام کا امتیاز مٹادیں گے، اور اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے قربانی کا جذبہ ان کے اندر باقی نہیں رہے گا تو ان پر ذلت اور خواری مسلط کردی جائے گی۔

آیئے ہم سب مل کر ذلت سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگیں۔ کیونکہ ہمارے آقا بھی ذلت سے پناہ مانگا کرتے تھے، ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعاء مانگا کرتے تھے: ''اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں، فقر سے، قلت اور ذلت سے، اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں کسی پر ظلم کروں یا مجھ پر کوئی ظلم کرے۔''

سود خوری کے نقصانات

☆ جو لوگ مال کی محبت میں اس قدر اندھے ہو چکے ہیں کہ حلال حرام کی بھی پرواہ نہیں کرتے اور حرمت کا اعلان سن لینے کے باوجود سود خوری سے باز نہیں آتے وہ قیامت کے دن جب اپنی قبروں سے نکل کر کھڑے ہوں گے تو اپنی ہیئت کذائی سے دور ہی سے پہچانے جائیں گے، ان سے مجنونانہ حرکتیں سرزد ہوں گی جیسے اس شخص سے سرزد ہوتی ہیں جسے شیطان نے اپنی چھوت چھات سے پاگل بنادیا ہو۔

سورۂ بقرہ/۲۷۵ میں ہے: ''جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت کے دن قبروں سے اس شخص کی طرح کھڑے ہوں گے جسے شیطان نے چھوکر خبطی بنادیا ہو، انہیں یہ سزا اس لیے دی جائے گی کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام فرمایا ہے۔''

☆ سود خور کے ساتھ آخرت میں تو یہ معاملہ جب ہوگا سو ہوگا، دنیا میں بھی اس کا حال خبطیوں جیسا ہوتا ہے، ذہنی بے چینی، قلبی اضطراب اور کاروباری پریشانیاں اس پر رات کی نیند اور دن کا سکون حرام کردیتی ہیں، نہ حقوق اللہ کی ادائیگی کی فکر نہ حقوق العباد کا خیال، بسا اوقات وہ خود اپنی ذات کو بھی بھول جاتا ہے۔ دیوانگی اور خبطیت کا یہ منظر ہمیں ہر اس معاشرے میں دکھائی دیتا ہے جس معاشرے میں سود کی لعنت رچ بس جاتی ہے، ایسے معاشرہ میں رہنے والے انسانوں کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں۔ ایمان تباہ ہوجاتا ہے اور سکون غارت ہوکر رہ جاتا ہے، ایسے لوگ مالی خوشحالی کے باوجود بے چین رہتے ہیں، وہ اپنی بے چینی کو جنسی آوارگی، لہو ولعب اور گانے بجانے میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ان کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوتی۔

☆ قرآن کریم کے علاوہ احادیث مبارکہ میں بھی سود خور کی دیوانگی اور جنون کا ذکر ملتا ہے۔ حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم ان گناہوں سے بچو جن کی قیامت کے دن مغفرت نہیں ہوگی، ان میں سے ایک تو خیانت ہے، جس نے خیانت کی ہوگی وہ اسے قیامت کے دن لے کر آئے گا، دوسرا گناہ سود خوری ہے، جو سود کھائے گا اسے قیامت کے دن دیوانہ اٹھایا جائے گا وہ خبطیوں جیسی حرکتیں کر رہا ہوگا۔'' (الترغیب والترهیب: ۳/۱۰)

☆ سود کی وجہ سے بظاہر پیسہ بڑھتا ہے، لیکن حقیقت میں گھٹتا ہے، یہ گھٹنا کئی اعتبار سے ہوتا ہے،

+ سود خور کی تجوری اور اکاؤنٹ میں بے شمار سرمایہ جمع ہوگا، لیکن ظاہری آنکھیں بند ہوتے ہی وہ دیکھ لے گا کہ اس کا آخرت کا اکاؤنٹ بالکل خالی ہے وہاں نیکی تو کوئی نہیں البتہ گناہوں کا انبار لگا ہوا ہے، نفع بالکل نہیں نقصان ہی نقصان ہے۔

+ سود خور کے پاس پیسہ تو بہت ہوتا ہے، لیکن اس میں برکت نہیں ہوتی، نہ حقیقی خوشی نہ سکون، نہ راحت نہ سکھ کی نیند، گھر میں فساد، بیوی نافرمان، اولاد سرکش، وہ خود بہت ساری اخلاقی، نفسیاتی اور اعصابی بیماریوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کا بھی مبغوض ہوتا ہے اور انسان بھی اس سے نفرت کرتے ہیں۔

سود کا مال بظاہر بڑھتا ضرور ہے، لیکن اس کی بڑھوتری پائیدار نہیں ہوتی۔ کبھی نہ کبھی اس پر آفت آ کر رہتی ہے۔ حضرت معمر رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ سود خور پر چالیس سال گزرنے نہیں پاتے کہ اس کے مال پر گھاٹا اور وبال آجاتا ہے۔

☆ کسی دوسرے کبیرہ گناہ کے ارتکاب پر اللہ تعالیٰ نے ویسی وعید نہیں سنائی جیسی وعید سود خور کو سنائی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تم سود سے باز نہ آئے تو پھر تمہارے

لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔" (سورة البقرة : ۲۸۸)

☆ یہ جنگ تیر وتفنگ اور گولہ بارود کی جنگ نہیں ہے، بلکہ اس جنگ کا دائرہ اعصاب سے دلوں تک اور اخلاق سے نسلوں تک وسیع ہے، آج جبکہ سودی نظام نے پوری دنیا کو اپنے خونخوار شکنجوں میں جکڑ لیا ہے، اس جنگ کے شعلے دن بدن بلند ہوتے جارہے ہیں۔ اب سود کسی ایک قبیلے اور شہر کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ ایک بین الاقوامی مسئلہ بن چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے جنگ کے اثرات معیشت، اخلاق، اعصاب، دلوں، گھروں، بازاروں، شہروں اور ملکوں...... ہر جگہ محسوس ہورہے ہیں۔ اب بھی اس جنگ کی آگ کو بجھایا جاسکتا ہے، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ سودی نظام کو چھوڑ کر اسلام کے باہمی تعاون، تکافل اور رحم دلی کے نظام کو اپنایا جائے۔

☆ سود ایک اجتماعی جرم ہے، جب وہ کسی سوسائٹی میں عام ہوجاتا ہے تو اس کی بنیادوں کو ہلا دیتا ہے اور اسے تباہی کے کنارے تک پہنچا دیتا ہے۔

☆ سود کی ترویج میں جو لوگ بھی حصہ دار بنتے ہیں خواہ وہ دینے والا ہو یا لینے والا، کاتب ہو یا کہ گواہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے نزدیک گناہ گار شمار ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم رہتے ہیں جیسا کہ الترغیب والترہیب میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔

☆ متعدد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود اور زنا کو اکٹھے ذکر فرمایا ہے کیونکہ یہ دونوں اجتماعی گناہ ہیں اور معاشرے پر منفی اثرات مرتب ہونے میں ان دونوں میں بہت زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص سود کا ایک درہم جان بوجھ کر کھاتا ہے اسے چھتیس بار زنا سے زیادہ گناہ ہوتا

ہے۔" (المنذري في الترغيب : ١/٥٦)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سود کے ستر ابواب ہیں جن میں سب سے ہلکا ایسے ہے جیسے کوئی اپنی والدہ سے زنا کرے۔" (المستدرك : ٢/٣٧)

☆ سود، دلوں میں بغض وکینہ کی کاشت کرتا ہے اور ان سے محبت اور رحمت سلب کرلیتا ہے، اخوتِ اسلامیہ ختم ہوجاتی ہے، یوں اجتماعیت کی بنیاد ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوجاتی ہے۔

☆ سود کا لین دین سود خور کی خباثت، کمینگی، شدید قسم کی حرص وطمع اور مادیت پرستی کی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر اس کا خاتمہ، خیر پر نہیں ہوتا۔

(نضرة النعيم : ١٠/٤٥٣١)

رِشوت

رِشوت ایک لعنت ہے اور آج یہ لعنت ہماری سوسائٹی اور ہماری زندگی میں رچ بس چکی ہے، رشوت کسے کہتے ہیں؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے بارے میں یوں تو اہلِ علم کے مختلف اقوال ہیں، لیکن ان سب کے حاصل اور خلاصہ میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔

ملا جرجانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رشوت اس چیز کو کہتے جو حق کو باطل اور باطل کو حق ثابت کرنے کے لیے کسی کو دی جائے۔ (التعریفات للجرجانی : ١١٦)

علامہ محمد اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، رشوت کی چار صورتیں ہیں:

۱- قاضی یا جج کو اپنے حق میں فیصلہ کروانے کے لئے رشوت دی جائے...... اس رشوت کا لینا بھی حرام ہے اور دینا بھی حرام ہے۔

۲- اپنی جان یا مال کی حفاظت کے لیے کسی کو کچھ دیا جائے، اس کا لینا تو حرام ہے مگر دینا حرام نہیں، یونہی اگر کوئی ظالم شخص کسی کے مال پر حریصانہ نظر رکھتا ہو اور وہ اس کے شر سے بچنے کے لیے اسے کچھ دے دے یا کسی شاعر اور صحافی کی بدگوئی سے بچنے کے لیے اسے کچھ پیش کر دیا جائے تو لینے والا گناہ گار ہوگا مگر دینے والے کو گناہ نہیں ہوگا۔

۳- حاکم یا قاضی کو معاملہ درست رکھنے اور حق پر قائم رہنے کے لیے جو کچھ دیا جائے اس کا لینا حرام ہے مگر دینا حلال ہے۔

۴- جانبین آپس میں محبت و الفت بڑھانے کے لیے جو ہدیہ وغیرہ دیتے ہیں اس پر بھی رشوت کا اطلاق کر دیا جاتا ہے مگر یہ رشوت نہیں اور دونوں فریق کے لیے حلال ہے۔

(کشاف اصطلاحات العنون : ٣/٦٨)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو حاجت برآری

یا امیر کے تقرّب کے حصول یا اس کے پاس کوئی خدمت یا ملازمت کا موقع تلاش کرنے کے لیے اسے ہدیہ پیش کرتا ہے تو اسے رشوت سمجھا جائے گا یا نہیں؟ جبکہ صورت یہ ہے کہ انہیں اگر ہدیہ دیں تو کام ہو جاتا ہے اور اگر نہ دیں تو وہ کام کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے؟ یونہی جس شخص کی بات امیر کے ہاں سنی جاتی ہو اسے ہدیہ پیش کرنے کا کیا حکم ہے جبکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر میں یہ ہدیہ پیش کرتا ہوں تو دینے والے کی دل شکنی ہوگی؟

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ان دو صورتوں کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ سنن ابی داؤد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: ''جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے حق میں سفارش کرتا ہے پھر وہ اسے کوئی ہدیہ پیش کرتا ہے تو اگر اس نے اس کا ہدیہ قبول کر لیا تو ربا (سود اور حرام) کے ابواب میں سے ایک باب کا اس نے ارتکاب کیا۔''

(سنن ابي داؤد : ٦)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ''سحت'' (جس کا قرآن کریم میں یہود کے حوالے سے ذکر آیا ہے) کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ''سحت'' (حرام) یہ ہے کہ تم کسی معاملے میں اپنے مسلمان بھائی کی سفارش کرو، اس پر وہ تمہیں ہدیہ پیش کرے اور تم اسے قبول کر لو' سائل نے پوچھا اگر یہ ہدیہ کسی باطل اور ناجائز کام کے سلسلہ میں ہو تو پھر کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا یہ تو کفر ہے، جیسا کہ سورۂ مائدہ میں ہے ''اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔'' اس لئے علماء کرام کہتے ہیں کہ جو شخص کسی صاحبِ منصب اور ذمہ دار کو ناجائز کام کروانے کے لیے ہدیہ پیش کرتا ہے تو اس کا دینا اور لینا دونوں حرام ہیں اور یہی وہ رشوت ہے جس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ''اللہ رشوت دینے اور لینے والے دونوں پر لعنت کرتا ہے۔''

(نضرة النعيم : ١٠/٤٥٤٤)

☆ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یوں تو صورت کے اعتبار سے ہدیہ اور رشوت میں اشتباہ پایا جاتا ہے، لیکن ان دونوں میں اصل فرق نیت اور ارادے کا ہے. اگر رشوت دینے والے کا مقصد حق کا ابطال اور باطل کا اثبات ہو تو ایسے شخص پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے اور اگر وہ محض دفعِ ظلم کے لیے کچھ دیتا ہے تو اس پر لعنت نہیں ہوگی مگر لینے والے پر لعنت ضرور ہوگی، جبکہ ہدیہ دینے والے کا مقصد محبت اور احسان ہوتا ہے اگر اسے ہدیہ دیا گیا تھا اور اب وہ اس کا بدلہ دینا چاہتا ہے تو اس کے جواز میں کوئی شک نہیں اور اگر وہ چھوٹا ہدیہ دے کر کسی بڑے ہدیے کا طلبگار ہے تو اسے ہم زیادتی کا حریص کہہ سکتے ہیں۔'' (نظرة النعيم : ۱۰/٤٥٤٦)

☆ جن آیات سے رشوت کی حرمت پر استدلال کیا گیا ہے، اس میں سے ایک آیت یہ بھی ہے ''اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ اور نہ اسے حکّام تک پہنچاؤ کہ جس سے لوگوں کے مال کا ایک حصہ تم گناہ سے کھا جاؤ درانحالیکہ تم جان رہے ہو (کہ تم ناحق اور زیادتی پر ہو) (البقرة : ۱۸۸)

☆ رشوت کی مذمت اور وعیدوں کے بارے میں احادیث بھی متعدد ہیں، جن میں سے ایک حدیث کا ترجمہ تو ہم اوپر دے چکے ہیں، علاوہ ازیں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''رشوت دینے اور لینے والا دونوں دوزخ میں ہوں گے۔'' (ترمذي : ۱۳۳۷)

☆ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''جس قوم میں ربا عام ہو جائے گا انہیں قحط سالی میں مبتلا کر دیا جائے گا اور جس قوم میں رشوت عام ہو جائے گی اس پر رعب اور خوف مسلط کر دیا جائے گا۔'' (مسند أحمد : ٤/٢٠٥)

رشوت کا لین دین بہت سارے مادی اور روحانی نقصانات کا مجموعہ ہے، جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ رشوت کا لین دین، رب تعالیٰ کے غضب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی مخالفت اور دنیوی اور اخروی عذاب کے استحقاق کا سبب بنتا ہے۔

۲۔ دنیا اور آخرت میں ہلاکت اور خسارے کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے۔

۳۔ حکام اور رعایا دونوں کے اخلاق اور عادات میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔

۴۔ کمزوروں، مظلوموں اور بے کسوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں اور ظلم عام ہو جاتا ہے۔

۵۔ رشوت لینے والے، دینے والے اور دلال سب پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے۔

۶۔ رشوت لینے والے کے بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ کے ساتھ باندھ کر قیامت کے دن دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

۷۔ عدل وانصاف کی بنیادیں کمزور ہو جاتی ہیں، جس کی وجہ سے عام لوگوں کا اعتماد، اپنے بادشاہوں، وزیروں، عدلیہ اور انتظامیہ سے اٹھ جاتا ہے۔

(نضرة النعيم : ۱۰/ ٤٥٤٨)

ریا

علامہ محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ نے ریا کی تعریف یہ کی ہے: ''دکھاوے کے لیے کوئی نیک کام کرنا۔'' (نظرة النعيم : ١٠/٤٥٥٢)

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''انسانوں کے دلوں میں عزت ومنزلت پیدا کرنے کے لیے دکھاوے کے طور پر نیک خصلتیں اختیار کرنا۔'' (احياء علوم الدين : ٣/٢٩٧)

چونکہ دکھاوے کے لیے حدیث میں دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں یعنی ریا اور سُمعۃ، اس لیے علماء نے ان دونوں میں فرق کیا ہے، وہ یہ کہ ریا کا تعلق فعل سے اور سمعۃ کا تعلق قول سے ہے یعنی محض دوسروں کو سنانے کے لیے اچھی باتیں کرنا۔

ریا کار لوگ انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور ان کے قلوب میں اپنی عظمت، پارسائی اور زہد وتقویٰ کا سکہ جمانے کے لیے جو کچھ کرتے ہیں امام غزالی رحمہ اللہ نے اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے ریا کی پانچ قسمیں لکھی ہیں:

۱- ریا بالبدن ...... بعض ریا کار اپنے بدن کو لاغر اور دبلا کر لیتے ہیں اور عوام کے سامنے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم دین کے غم خوار اور خوفِ آخرت کے غلبہ کی وجہ سے کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔

۲- ریا بالھیئۃ ...... اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مادی مفادات کے طلب گار بالوں کو پراگندہ رکھتے ہیں، ماتھے پر سجدے کا نشان بنا لیتے ہیں، فقیرانہ لباس پہنتے ہیں اور ایسی ہیئت اور شکل وصورت بنا لیتے ہیں کہ دیکھنے والے انہیں اللہ والے سمجھیں جبکہ وہ ایسے ہوتے نہیں۔

۳- ریا بالقول ..... ریا کی یہ قسم اہلِ دین میں عام طور پر پائی جاتی ہے، وہ وعظ و

تذکیر قائم کرتے ہیں، حکیمانہ اور عالمانہ گفتگو کرتے ہیں، علمی گہرائی اور گیرائی کا نقش قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کتابوں کے حوالے دے کر اور ثقیل الفاظ بول کر سامعین کو مرعوب کرتے ہیں، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے ہیں حالانکہ وہ خود نہ تو معروف پر عمل کرتے ہیں اور نہ ہی منکر سے اجتناب کرتے ہیں، ان میں سے بعض ذکر وفکر میں ہمہ وقتی مشغولیت کا تأثر دیتے ہیں۔

۴- ریا بالعمل...... دکھاوے کے لیے خشوع خضوع کے ساتھ نماز پڑھنا، صدقہ خیرات کرنا اور حج اور عمرے کرنا ''ریا بالعمل'' میں شامل ہے۔

۵- ریا بالشیوخ...... اس بیماری میں جو لوگ مبتلا ہوتے ہیں وہ علماء ومشائخ کو حیلے بہانے سے اپنے پاس آنے کی دعوت دیتے ہیں اور پھر پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ ہمارے پاس فلاں فلاں شیوخ آتے ہیں یونہی یہ مشاہیر کا اکثر تذکرہ کرتے ہیں تا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ ان کے تعلقات بڑے بڑے لوگوں سے ہیں۔ (نظرة النعيم : ۱۰/۲۰۵۳)

کتاب وسنت میں ریاکاروں کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ سورۂ نساء میں ہے: ''اے ایمان والو! بے شک منافق اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں اور وہ انہیں ان کے دھوکے کی سزا دے گا اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو کاہلی سے کھڑے ہوتے ہیں، لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔'' (النسآء : ۱٤۲)

سورۂ ماعون میں ہے: ''پس ان نمازیوں کے لیے ہلاکت ہے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں جو ریاکاری کرتے ہیں اور ضرورت کی چیز دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔''

(الماعون : ٤-٧)

آیات کے بعد چند احادیث ملاحظہ فرمالیجئے:

☆ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا ”جو سنانا چاہتا ہے اللہ اس کے بارے میں سنوا دیتا ہے اور جو دکھانا چاہتا ہے اللہ اس کے بارے میں دکھا دیتا ہے۔“ (بخاري : ٦٤٩٩)

اس حدیث کا ایک مطلب تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ جس شخص کا مقصد محض لوگوں کو سنوانا اور دکھانا ہوتا ہے تا کہ اس کی عزت وعظمت میں اضافہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کا یہ مقصد پورا کر لیتے ہیں، اسے شہرت بھی حاصل ہو جاتی ہے اور عزت بھی، لیکن آخرت میں ایسا شخص ثواب سے محروم رہے گا۔

دوسرا مطلب امام خطابی رحمہ اللہ نے یہ بیان کیا ہے کہ اس کے غلط مقاصد زیادہ دیر تک چھپے نہیں رہتے بلکہ بالآخر ظاہر ہو جاتے ہیں، یوں رب تعالیٰ اسے نظروں سے گرا دیتے ہیں اور ذلیل ورسوا کر دیتے ہیں۔

☆ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی نے بارگاہِ نبوت میں حاضر ہو کر سوال کیا کہ یا رسول اللہ! ایک شخص جہاد میں مالِ غنیمت کے لیے، دوسرا شہرت کے لئے اور تیسرا اپنی شجاعت کی دھاک بٹھانے کے لئے لڑتا ہے، ان میں سے کس کو اللہ کے لیے جہاد کرنے والا سمجھا جائے گا، آپ نے فرمایا جو شخص کلمۃ اللہ کی بلندی کے لیے جنگ کرے صرف وہی اللہ کے لیے جہاد کرنے والا شمار ہوگا۔“

(بخاري : ٢٨١٠ ، مسلم : ١٩٠٤)

☆ حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مجھے تمہارے بارے میں جس چیز کا سب سے زیادہ ڈر ہے وہ شرکِ اصغر ہے، سوال کیا گیا یا رسول اللہ! شرکِ اصغر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ”ریا! جس دن اللہ تعالیٰ بندوں کو ان کے اعمال کی جزا دے گا تو ریا کاروں سے کہا جائے گا کہ تم دنیا میں جن لوگوں کو دکھانے کے لیے اعمال کیا کرتے تھے، انہی کے پاس جاؤ اور دیکھو تمہیں ان کے ہاں سے

پکھ ملتا ہے یا نہیں؟'' (مسند أحمد : ٥/٤٢٩)

قیامت کے دن سچ اور جھوٹ، اصل اور کھوٹ، خالص اور ردی سب کچھ نکھر کر سامنے آجائے گا، وہی اعمال کام آئیں گے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کیے گئے ہوں گے باقی سارے اعمال گردوغبار بن کر اڑ جائیں گے، ان پر اجر تو کیا ملے گا الٹا ان پر عذاب ہوگا کیونکہ ایسے اعمال اللہ تعالیٰ کے ہاں شرک شمار ہوں گے اور شرک سے بڑا گناہ کوئی نہیں خواہ شرکِ اصغر ریا ہی کیوں نہ ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے بارے میں اس شرک کا اندیشہ تھا۔

☆ حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''مجھے اپنی امت کے بارے میں شرک اور خفیہ شہوت کا ڈر ہے، شداد کہتے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا آپ کے بعد آپ کی امت شرک کرے گی؟ آپ نے فرمایا ہاں اگر چہ وہ شمس وقمر، پتھروں اور بتوں کی عبادت تو نہیں کریں گے لیکن وہ اپنے اعمال میں ریا کاری کریں گے۔'' (اور یہی ان کا شرک ہوگا)

(مسند أحمد : ٤/١٢٤)

ریا کے نقصانات پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے:

۱- ریا سے اعمال باطل ہو جاتے ہیں اور ان کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے۔

۲- ریا کار اللہ تعالیٰ کی نظر میں ملعون اور مردود ہوتا ہے۔

۳- ریا دل کی سرزمین میں موجود ایک بد بودار درخت کی ٹہنی ہے جس کا پھل دنیا میں خوف، غم اور قلبی ظلمت کی صورت میں اور آخرت میں زقوم اور دائمی عذاب کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

۴- ریا کار کو قیامت کے دن سرِ عام رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

۵- ریا، نیک عمل کو گناہ میں بدل دیتی ہے اور اس کے صاحب کو ثواب کی بجائے گناہ ہوتا ہے۔

٦- ریاکار، دنیا میں بھی بالآخر رسوا ہوجاتا ہے کیونکہ اس کی حقیقت اہلِ دنیا پر آشکارا ہوجاتی ہے۔ (نضرة النعيم : ١٠/٤٥٦٧)

محترم قارئین وقاریات! ریا کے نقصانات پر ایک نظر ڈالتے ہوئے یہ بھی دیکھتے جایئے کہ آج ہماری زندگی کا کونسا شعبہ ریا سے آلودہ نہیں ہے؟ شادی بیاہ کی تقریب سے ایصال ثواب کی مختلف رسموں تک، صدقہ وخیرات، حج وعمرہ، ختم قرآن اور محفل افطار سے مساجد، مدارس اور رفاہی ہسپتالوں کی تعمیر تک ہر جگہ ریا کے کرشمے دکھائی دیتے ہیں، بس اللہ تعالیٰ کے چند مخصوص بندے ہیں جو اس مہلک بیماری سے محفوظ ہیں، کاش! اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان مخصوص بندوں پر شامل ہونے کی توفیق مرحمت فرمادے۔

زِنا

امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کسی شرعی عقد کے بغیر عورت کے ساتھ جماع کرنے کو زنا کہتے ہیں۔'' (المفردات : ۲۲۰)

امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس پر تو علماء کا اجماع ہے کہ زنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے، لیکن اس بارے میں اختلاف ہے کہ قتل اور زنا میں سے کون سا گناہ زیادہ قبیح اور قابلِ مذمّت ہے؟ صحیح بات یہ ہے کہ کبائر میں شرک کے بعد قتل اور قتل کے بعد زنا کا درجہ ہے۔'' (الکبائر : ۵۸، ۵۹)

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے: ''یوں تو سارے ہی گناہ قابلِ نفرت اور نجاست آلودہ ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں تین گناہوں پر نجاست اور خباثت کا اطلاق کیا ہے، شرک، زنا اور لواطت، کیونکہ یہ تینوں دل میں فساد پیدا کرتے ہیں اور عقیدۂ توحید کو کمزور کردیتے ہیں، اسی لئے عام طور پر مشرکین زنا اور لواطت میں زیادہ ملوث ہوتے ہیں اور جو شخص عقیدہ توحید میں جتنا زیادہ مضبوط ہوتا ہے اور اخلاص میں کامل ہوتا ہے وہ اتنا ہی ان دونوں گناہوں سے اجتناب کرتا ہے، جتنے بھی گناہ ہیں ان میں سے کوئی گناہ بندے کو اللہ تعالیٰ سے دور کرنے، دل میں وحشت پیدا کرنے اور تدین میں فساد پیدا کرنے میں اتنا مؤثر ثابت نہیں ہوتا جتنے یہ دو گناہ مؤثر ثابت ہوتے ہیں، جس بندے کا دل ان دو گناہوں کی نجاست میں رنگ جاتا ہے وہ ناپاک، اللہ تعالیٰ سے دور ہوجاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ صرف پاک اعمال ہی کو قبول کرتا ہے۔'' (اغاثۃ اللّھفان : ۷۸۔۸۲ بتصرف)

زِنا کے بارے میں چند آیات اور احادیث کا بھی مطالعہ فرمالیں:

☆ سورۂ اسراء میں ہے: ''زنا کے قریب نہ جاؤ کیونکہ یہ بے حیائی والا عمل اور برا

راستہ ہے۔'' (الاسراء : ۳۲)

☆ سورۂ فرقان میں رحمٰن کے مخصوص بندوں کی صفات ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ''اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور جس جاندار کو مارنا اللہ نے حرام کیا ہے اسے ناحق قتل نہیں کرتے اور زنا نہیں کرتے اور جو یہ کام کرے گا سخت گناہ میں مبتلا ہوگا، قیامت کے دن اسے دگنا عذاب ہوگا اور وہ ذلت وخواری سے ہمیشہ اس میں رہے گا۔''

(سورة الفرقان : ٦٨)

☆ زانیوں اور زانیات سے رب تعالیٰ کی نفرت کا یہ عالم ہے کہ سورۂ نور میں ارشاد ہوتا ہے: ''زانی مرد، زانی یا مشرکہ عورت کے سوا نکاح نہیں کرتا اور زانی عورت کو بھی زانی یا مشرک مرد کے سوا اور کوئی نکاح میں نہیں لاتا اور یہ مومنوں پر حرام ہے۔''

(سورة النور : ٣)

گویا زنا کی وجہ سے فطرت ایسی مسخ ہو جاتی ہے اور مزاج ایسا بگڑ جاتا ہے کہ بدکار مرد اور عورتیں زندگی کے ہم سفر کے طور پر بدکاروں اور مشرکوں ہی کو پسند کرتے ہیں، کسی عفیف اور پاکدامن انسان کی طرف ان کا میلان نہیں ہوتا، چونکہ اسلامی شریعت، عبادات و معاملات اور اخلاق جیسے شعبوں میں تکمیل کے لیے آئی ہے، اس لیے اسلام میں صرف زنا ہی کو نہیں بلکہ زنا کے اسباب کو بھی حرام کیا گیا ہے۔ غیر محرم کی طرف دیکھنا، مرد و زن کا بے حجابانہ اختلاط، خلوت میں میل ملاپ، چھونا اور مصافحہ کرنا، بے پردگی اور حسن کی نمائش کے ہر انداز کو بھی شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔

☆ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو عورت خوشبو لگا کر مردوں کی کسی جماعت کے قریب سے اس نیت سے گزری کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوں اور خوشبو محسوس کریں تو وہ بھی زانیہ ہے۔''

(النسائي : ١٥٣ ، ابو داؤد : ٤١٧٣)

عورت کو خوشبو استعمال کرنے کی اجازت تو ہے مگر نامحرم مردوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور ان کے شہوانی جذبات کو بھڑکانے کے لیے خوشبو کے استعمال کی اجازت نہیں۔

☆ آج جو ہم بدکاری اور فحاشی کی کثرت دیکھتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ قیامت بہت قریب آگئی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدکاری کی کثرت کو قیامت کی نشانی قرار دیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ علم اٹھالیا جائے گا، جہالت غالب آجائے گی، شرابیں پی جائیں گی اور زنا عام ہوجائے گا۔''

(بخاري : ٨٠ ، مسلم : ٢٦٧١)

☆ ابھی جو اسبابِ زنا کی بات ہورہی تھی تو اس کی مزید وضاحت کے لیے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی وہ حدیث بھی پیشِ نظر رکھیں جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ ''انسان پر زنا میں اس کا حصہ لکھ دیا گیا ہے جسے وہ لامحالہ حاصل کرکے رہے گا، آنکھوں کا زنا دیکھنا، کانوں کا زنا سننا، زبان کا بات چیت کرنا، ہاتھوں کا زنا پکڑنا اور پیروں کا زنا چل کر جانا ہے، دل خواہش اور آرزو کرتا ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔''

(بخاري : ٦٦١٢ ، مسلم : ٢٦٥٧)

یوں تو زنا جس حال میں بھی ہو، کبیرہ گناہ ہے، لیکن زنا کی بعض صورتیں ایسی ہیں جن میں زیادہ قباحت پائی جاتی ہے اور احادیث میں ان پر سخت وعید آئی ہے، مثلاً کسی محرم کے ساتھ یا پڑوسی کی بیوی کے ساتھ زنا یا رمضان کے مہینے میں یا بلدِ حرام میں زنا، اسی طرح بڑھاپے میں بدکاری بھی بہت بڑا جرم ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تین آدمیوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ تو بات کرے گا، نہ انہیں پاک کرے گا اور نہ ہی ان کی طرف (نظرِ شفقت سے) دیکھے گا، بوڑھا زانی، جھوٹا بادشاہ اور متکبر فقیر۔'' (مسلم : ۱۰۷)

پڑوسی کے حقوق کی اہمیت کی وجہ سے اس کی عزت وناموس کی پامالی کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے پوچھا ''تم لوگ زنا کے بارے میں کیا کہتے ہو انہوں نے عرض کیا کہ حرام ہے اسے اللہ اور اس کے رسول نے قیامت تک کے لیے حرام کیا ہے، آپ نے فرمایا یاد رکھو! دس عورتوں سے بدکاری کرنا پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کے مقابلے میں آسان اور چھوٹا گناہ ہے۔'' (مسند أحمد : ٧/٦)

آخر میں زنا کے مفاسد پر بھی نظر ڈال لیجیے:

۱۔ زنا، زانی میں پائے جانے والی متعدد خرابیوں کی نشاندہی کرتا ہے مثلاً دینداری کی قلت، تقویٰ اور ورع کا فقدان، مروت کا فساد اور غیرت کی کمی۔

۲۔ زانی کے چہرے پر ایک خاص قسم کی ظلمت اور نحوست چھا جاتی ہے جسے دیکھنے والے ایک نظر میں محسوس کر لیتے ہیں۔

۳۔ زنا کی وجہ سے دل تاریک ہو جاتا ہے اور اس کا نور بجھ جاتا ہے۔

۴۔ زانی، حرمت اور احترام سے محروم ہو جاتا ہے، وہ دنیا میں حد اور سزا کا اور آخرت میں دردناک عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے۔

۵۔ زانی اچھی صفات اور ناموں یعنی عفت وعصمت اور امانت سے محروم ہو جاتا ہے اور ان کی بجائے فاسق وفاجر اور زانی اور خائن جیسے ناموں کا حقدار ہو جاتا ہے۔

٦۔ زنا، زانی کو پاکیزگی کے وصف سے دور کر دیتا ہے اور پاکیزگی کی بجائے اس کے

اندر نجاست اور خباثت بھر دیتا ہے اور یہ حقیقت تو ہر کسی کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر خبیث پر جنت کو حرام کیا ہے۔

٧- زنا کی وجہ سے نسب مشتبہ ہو جاتا ہے، رزق میں تنگی اور شہروں میں فساد واقع ہو جاتا ہے اور ایک ہی سوسائٹی کے ابناء کے درمیان وحشت عام ہو جاتی ہے۔

٨- زنا کی وجہ سے ایسی بیماریاں پھیل جاتی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا جیسا کہ آج کل بدکاری میں ملوث ملکوں اور شہروں میں ایڈز کی بیماری پھیل رہی ہے۔ (نضرة النعيم : ١٠/٤٥٨٤)

سحر

لغت میں سحر، دھوکہ دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سحر'' ایسے منتر کو کہا جاتا ہے جسے بول کر یا لکھ کر یا اس کا عمل کر کے کسی کے بدن یا دل یا عقل کو متاثر کیا جائے۔ (مقاییس اللغة : ۱۳۸/۳)

امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سحر کی تین قسمیں ہیں:

☆ پہلی قسم نظر بندی اور شعبدہ بازی ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، کوئی بھی شاطر اور عیار انسان ہاتھ کی صفائی اور چالاکی سے ایسا کام کر جاتا ہے جسے سمجھنے یا دیکھنے سے عام لوگوں کی عقل اور نظر قاصر رہتی ہے، مسمریزم کے ماہرین اپنے معمول کے دماغ پر جو اثر ڈالتے ہیں وہ بھی اسی قسم میں شامل ہے۔

سورۂ اعراف میں ساحرانِ مصر کے بارے میں ہے: ''انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا۔'' سورۂ طٰہٰ میں ہے: ''ان کے سحر سے موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں یہ آنے لگا کہ یہ رسیوں کے سانپ دوڑ رہے ہیں''

گویا ساحروں نے جو رسیاں اور لاٹھیاں ڈالی تھیں وہ حقیقت میں نہ تو سانپ بنی تھیں اور نہ ہی انہوں نے کوئی حرکت کی تھی بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوتِ خیالیہ ان کے عمل سے متاثر ہو کر ان کو حرکت کرنے اور دوڑنے والے سانپ سمجھنے لگی تھی۔

☆ دوسری قسم اس نظر بندی کی ہے جس میں شیاطین سے مدد لی جاتی ہے اور مختلف عملیات کے ذریعے ان کا قرب حاصل کیا جاتا ہے، سورۂ بقرہ میں ہے: ''بلکہ شیاطین نے کفر کیا جو لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔''

☆ جادو کی تیسری قسم وہ ہے جس کے بارے میں جادوگروں کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم اس

کے زور پر کسی چیز کی حقیقت ہی کو بدل سکتے ہیں یہاں تک کہ انسان کو گدھا بنا سکتے ہیں، لیکن محقق اور ماہر علماء کے نزدیک اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ (المفردات : ۲۲٦)

ان تین قسموں سے قطع نظر عرفِ عام میں ایسے عملیات کو جادو کہا جاتا ہے جن میں شریعت سے ہٹ کر شیاطین کی مدد سے کسی پر اثر انداز ہوا جاتا ہے، شیاطین کی مدد حاصل کرنے کیلئے جادوگر شرعی حدود اور احکام پامال کر جاتے ہیں، نجاست اور غلاظت میں ملوث رہتے ہیں، نیکی اور بدی، حلال اور حرام، جائز اور ناجائز کا امتیاز اٹھا دیتے ہیں، ضرورت پڑے تو غیر اللہ کی پرستش بھی کرتے ہیں، معصوم بچوں تک کا خون بہانے سے دریغ نہیں کرتے۔

سحر اور جادو کی تعلیم و تعلم کے ذرائع میں پائی جانے والی خرابیوں کے علاوہ ان مقاصد میں بے پناہ مفاسد پائے جاتے ہیں جن مقاصد کے لیے اسے استعمال کیا جاتا ہے، ملے ہوئے دلوں کو توڑنے، الفت و محبت کو نفرت اور عداوت میں بدلنے، بسے بسائے گھروں کو اجاڑنے، میاں بیوی میں تفریق پیدا کرنے اور مخالفین کو مالی، جانی اور بدنی نقصان پہنچانے کے لئے جادو کا استعمال بے دریغ کیا جاتا ہے، سحر میں پائے جانے والی اعتقادی اور عملی خرابیوں کی وجہ سے اس کے سیکھنے، سکھانے اور اس پر عمل کرنے کو حرام کہا گیا ہے بلکہ اس کی بعض صورتیں ایسی بھی ہیں جن کے ارتکاب سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔

☆ متعدد احادیث میں سحر سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سات مہلک چیزوں سے بچو، عرض کیا گیا یا رسول اللہ! وہ کونسی ہیں، فرمایا اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، سحر اور جادو، جس انسان کے قتل کو اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے اسے قتل کرنا، یتیم کا مال کھانا، سود خوری، جنگ کے دن پیٹھ پھیر کر بھاگ جانا، پاکدامن بھولی بھالی مومن خواتین پر تہمت لگانا'' (بخاري : ٥٧٦٤، مسلم : ٨٩)

☆ بخاری اور مسلم ہی میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''جو شخص نجومی یا جادوگر یا کاہن کی لغویات پر یقین رکھتے ہوئے ان کے پاس گیا اس نے اس کلام کے ساتھ کفر کیا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا ہے۔''

(الترغيب و الترهيب : ٤/٣٦)

☆ ابوداؤد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''جس شخص نے علمِ نجوم سیکھا اس نے سحر ہی کا ایک شعبہ سیکھا ہے، اب اس کی مرضی ہے کہ وہ جتنا سیکھنا چاہتا ہے سیکھ لے۔'' (ابو داؤد : ۳۹۰۵)

☆ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سحر میں بڑے عجائب پائے جاتے ہیں، چونکہ اس میں مہارت کا مدار کفریہ اور شیطانی اعمال پر ہوتا ہے اس لیے جو شخص کفر و شرک، نجاست و خباثت اور اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور اہلِ ایمان کی دشمنی میں جتنا زیادہ سخت ہوتا ہے، اس کا سحر اتنا ہی زیادہ قوی اور مؤثر ہوتا ہے، چنانچہ بت پرستوں کا سحر، اہلِ کتاب کے سحر سے اور یہود کا سحر، مدعیانِ اسلام کے سحر سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے اور کچھ ایسے ہی لوگ تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کیا تھا۔'' (التفسير القيم : ٥٨١)

☆ علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ نے اپنے مقدمہ میں بڑی جامع اور مختصر بات فرمائی ہے، فرماتے ہیں: ''ساحر سے خیر کا صدور ہو ہی نہیں سکتا اور نہ ہی وہ سحر کو اسبابِ خیر میں استعمال کرتا ہے۔'' (مقدمة ابن خلدون : ٦٣٠)

کتاب و سنت کے نصوص اور اہلِ علم کے اقوال کے مطالعہ کے بعد اس بارے میں تو کوئی شک ہی نہیں رہ جاتا کہ سحر، کفر و شرک اور حرام ہے، اس کی تعلیم و تعلم، اللہ تعالیٰ کے غضب کا سبب ہے، اس میں دنیا اور آخرت کا خسارہ ہے، لیکن ان ساری حقیقتوں کو جاننے کے باوجود بے شمار مسلمان (خصوصاً خواتین) ساحروں کے پاس جاتے ہیں، ان سے اپنے

مذموم مقاصد کے لیے عملیات کرواتے ہیں، ان کی تاثیر پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کی خدمت میں نذرانے پیش کرتے ہیں، ان کے کہنے پر انسانی خون بہاتے اور ہر ناجائز عمل کرتے ہیں، ان کی چوکھٹ پر عزت وآبرو، ایمان ودین اور مال ومتاع لٹاتے ہیں، اپنے شہر کی دیواروں اور اخباروں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ بنگالی بابا اور تارا مسیح جیسے جادوگروں کا جادو مسلمانوں کے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔

ان سطور کے مطالعہ کے بعد ہوسکتا ہے کہ بعض حضرات وخواتین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ مخالفین اور حاسد اگر ہم پر جادو کریں تو اس سے بچاؤ اور دفاع کے لیے کیا کیا جائے؟ تو گزارش یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہمیں درجِ ذیل تجاویز پر عمل کرنا چاہئے:

۱۔ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگی جائے، جسے اللہ پناہ دے دے اسے کوئی بھی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ (معوذتین (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) کا ورد اس سلسلے میں بڑا موثر ثابت ہوتا ہے)

۲۔ اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کی حفاظت، جو شخص ان کی حفاظت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کرتا ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ پر توکل اور اعتماد، رب تعالیٰ توکل کرنے والوں کے لیے کافی ہوجاتا ہے۔

۴۔ گناہوں سے سچی توبہ، کیونکہ بہت سی مصیبتیں گناہوں کی وجہ سے ہم پر مسلط ہوجاتی ہیں۔

۵۔ صدقہ اور احسان...... مصائب، پریشانیوں، سحر اور حسد کے اثرات کے خاتمہ میں صدقہ اور احسان بڑے موثر ثابت ہوتے ہیں۔

۶۔ قرآن کریم کی تلاوت اور مسنون دعاؤں کے ورد کی کثرت۔

۷۔ ان جائز دواؤں، تدبیروں اور طریقوں کا استعمال جو مستند اطباء اور اہلِ علم تجویز کریں۔ (نضرة النعيم)

تمسخر

''س، خ، را'' کا جو مادّہ ہے، اس کے اندر ''احتقار اور استذلال'' کا معنی پایا جاتا ہے یعنی دوسرے کو حقیر اور ذلیل سمجھنا، جو شخص کسی کے ساتھ تمسخر کرتا اور اس کا مذاق اڑاتا ہے اس کے نہاں خانہ دل میں اپنی بڑائی اور دوسرے کی حقارت اور ذلّت کا تصوّر بیٹھا ہوتا ہے، وہ اپنے آپ کو بہتر اور دوسرے کو کمتر سمجھتا ہے۔

مشرکین اور کفار کی تاریخ یہ رہی ہے کہ وہ انبیاء کرام اور غریب مسلمانوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے، سورۂ بقرہ میں ہے: ''کافروں کے لیے دنیاوی زندگی مزین کی گئی ہے اور وہ ایمان والوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔'' (سورة البقرة : ۲۱۲)

چونکہ انہیں اپنی خوشحالی اور فارغ البالی پر گھمنڈ تھا اس لیے وہ انبیاء اور ان کے ماننے والے غریب مسلمانوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے، جبکہ فخر و غرور میں مبتلاء ہو کر دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھنا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

سورۂ حجرات میں ہے: ''اے ایمان والو! نہ تو مردوں کو مردوں کا مذاق اڑانا چاہئے، ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتوں کو عورتوں کا مذاق اڑانا چاہئے ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔'' (سورة الحجرات : ۱۱)

قرآنِ کریم کا عمومی اسلوب یہ ہے کہ وہ عورتوں کو الگ ذکر نہیں کرتا، بلکہ مَردوں کے ضمن میں وہ خود بخود شامل ہو جاتی ہیں، لیکن تمسخر کی ممانعت کا اس قدر اہتمام فرمایا کہ مردوں کو الگ خطاب فرمایا اور عورتوں کو الگ، دونوں میں یہ بات خاص طور پر فرمائی کہ جو مرد اور عورت کسی کو حقیر سمجھ کر اس کا مذاق اڑا رہے ہیں انہیں کیا خبر کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان سے بہتر ہو، اس لیے اللہ کے ہاں کسی کے بہتر ہونے کا فیصلہ اس کے مال و دولت اور

حسن و جمال کی بناء پر نہیں کیا جاتا بلکہ قلب و عمل کی بناء پر کیا جاتا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور اموال کو نہیں دیکھتا بلکہ دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے۔'' ہوسکتا ہے ہم جس شخص کے ظاہر کو دیکھ کر اسے عزت کی نظر سے دیکھ رہے ہوں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پرِ کاہ کی حیثیت بھی نہ رکھتا ہو اور جسے ہم خاکِ راہ سمجھ رہے ہوں وہ اپنی باطنی کیفیات، ایمانی صفات اور حسنِ اعمال کی بناء پر اللہ تعالیٰ کے ہاں عزت و منزلت کے اعلیٰ مقام کا مستحق ہو۔

حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ ظاہری حسن و جمال اور اعلیٰ حسب نسب سے محروم ہونے کے ساتھ تہی دست بھی تھے جبکہ ان کے مقابلے میں ابولہب کو عزت و سرفرازی کے ساتھ ظاہری اسباب بھی حاصل تھے مگر چونکہ اس کا دل کفر و شرک کی غلاظت سے بھرا ہوا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک صاحبِ ایمان حبشی کا مقام لاکھوں کروڑوں بولہبوں سے بلند تر تھا، عام طور پر ایک شخص دوسرے کے عیوب کا مذاق اس وقت اڑاتا ہے جب اپنے عیوب پر اس کی نظر نہیں ہوتی اگر وہ اپنے عیوب پر نگاہ رکھے تو اسے کسی کے ساتھ تمسخر کی جرأت نہیں ہوگی، بقول ظفر ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر
رہے دیکھتے لوگوں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر
تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ازواجِ مطہرات اور صحابہ کرام کے اخلاق و اعمال پر نظر رکھتے تھے اور اگر آپ کو کوئی کمزوری دکھائی دیتی تھی تو آپ اس کی نشاندہی اور اصلاح فرماتے

تھے، ایک موقع پر سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے چھوٹے قد کا گویا مذاق اڑاتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے فرمایا کہ وہ تو بس اتنی سی ہیں، آپ نے فرمایا اے عائشہ! تم نے ایسی بات کہی ہے کہ اگر اسے سمندر کے پانی میں ملا دیا جائے تو اسے متأثر کر کے رکھ دے۔ (ابو داوٗد: ٤٨٧٥)

تجربے اور مشاہدے سے یہ ثابت ہے کہ جو کسی پر ہنستا ہے، دوسرے لوگ اس پر ہنستے ہیں اور جو کسی کی کمزوری کا مذاق اڑاتا ہے، خود اسے اس کمزوری میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے ہمارے اسلاف اس بارے میں بہت احتیاط فرماتے تھے۔

حضرت عمرو بن شرحبیل کا قول ہے کہ اگر میں کسی شخص کو بکری کے تھنوں سے منہ لگا کر دودھ پیتے دیکھوں اور اس پر مجھے ہنسی آجائے تو میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میں بھی ایسا نہ ہو جاؤں۔ (قرطبي: ٣٢٦/١٦)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر میں کسی کتے کے ساتھ بھی استہزاء کروں تو مجھے ڈر ہوتا ہے کہ میں خود کتا نہ بنا دیا جاؤں۔

(نزهة الفضلاء: ٨٥/١)

یہاں یہ جان لینا بھی مناسب ہے کہ دائرۂ شریعت میں رہتے ہوئے مذاق اور دل لگی نہ صرف یہ کہ جائز بلکہ مستحب ہے خود سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب اور ازواج سے دل لگی فرمایا کرتے تھے، جبکہ استہزاء اور سخریہ متعدد مفاسد پر مشتمل ہونے کی وجہ سے حرام ہے، ان مفاسد میں سے چند ایک ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

١- سخریہ: اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کی مخالفت اور اس کے غضب اور عذاب کا موجب ہے۔

٢- سخریہ: اجتماعیت کو پاش پاش کر دیتا ہے اور نفرت کے بیج دلوں میں بو دیتا ہے۔

٣- جن قوموں پر عذابِ الٰہی نازل ہوا وہ تمسخر کی بیماری میں مبتلا تھیں، جس کا نشانہ وہ

انبیاء اور اہلِ ایمان کو بناتی تھیں۔

۴- جو شخص اس بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ وقار اور سنجیدگی سے محروم ہو جاتا ہے۔

۵- استہزاء کرنے والا ان لوگوں کو حقیر سمجھتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے عزت عطا کی ہوتی ہے، یوں وہ اپنے اوپر ہی ظلم کرتا ہے۔

٦- تحریہ: انسانی حقوق کی صریح خلاف ورزی اور تکریمِ انسانی کے تقاضوں کے خلاف ہے۔

۷- تمسخر سے دل مر جاتا ہے اور اس میں اپنے عیوب سے غفلت پیدا ہو جاتی ہے۔

۸- جو لوگ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کا مذاق اڑائے گا اور انہیں اس کی سزا دے گا۔

۹- تحریہ: جاہلیت کی بیماریوں میں سے ایک بیماری ہے، جس سے بچنا مسلمان پر واجب ہے۔

۱۰- تحریہ: انسان کو اپنے رب کے ذکر سے غافل کر دیتا ہے۔

۱۱- استہزاء کرنے والے کو ڈرنا چاہئے کہ کہیں اللہ تعالیٰ اسے بھی ویسے ہی عیب اور نقص میں مبتلا نہ کر دے جس عیب اور نقص کی وجہ سے وہ دوسرے کا مذاق اڑا رہا ہے کیونکہ حالات بدلتے دیر نہیں لگتی، کسی نے خوب کہا ہے ۔

ہم نے دیکھے ہیں زمانے میں بہت انقلاب
اہلِ دولت سے کہو اتنا نہ اترایا کریں

(نضرة النعیم : ۱۰/٤٦١٤)

چوری

امام ذہبی رحمہ اللہ نے ''الکبائر'' کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس میں سرقہ (چوری) کو تینتیسویں ۳۳ نمبر پر شمار کیا ہے۔

امام ابن حجر رحمہ اللہ اپنی کتاب ''الزواجر'' میں فرماتے ہیں کہ سرقہ کے کبیرہ گناہ ہونے پر تمام علماء کا اتفاق ہے، (الزواجر: ٥٦٤) قرآن کریم میں سرقہ کی سزا قطع ید (ہاتھ کاٹنا) بیان کی گئی ہے، اس سزا کو بیان کرتے ہوئے مرد اور عورت دونوں کا صراحۃً ذکر کیا گیا ہے ورنہ قرآن کا عام انداز یہ ہے کہ مردوں کو خطاب کرتے ہوئے کوئی حکم بیان کردیا جاتا ہے اور عورتیں، مردوں کے ضمن میں خود بخود شامل ہوجاتی ہیں، سورۂ مائدہ میں ہے:

''چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کے ہاتھ کاٹ ڈالو، یہ ان کے فعلوں کی سزا اور اللہ کی طرف سے عبرت ہے اور اللہ زبردست اور حکمت والا ہے۔''

(سورة المائدة: ٣٨)

بظاہر ہاتھ کاٹنے کی سزا بڑی سخت معلوم ہوتی ہے اور اس لئے خوفِ خدا سے عاری بعض لوگ اسے معاذ اللہ! وحشیانہ سزا قرار دینے سے بھی باز نہیں آتے لیکن جو لوگ اسلامی سزاؤں کی حکمت اور فلسفہ سمجھتے ہیں اور ان کے فوائد اور برکات کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرچکے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ سزائیں وحشیانہ نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ وحشی اور جاہل ہیں جو ان سزاؤں کو وحشیانہ قرار دیتے ہیں اور چوروں، ڈاکوؤں، سماج دشمنوں اور دہشت گردوں کی پشت پناہی کرتے ہیں۔

اعتراض کرنے والوں کو قرآنی حدود اور سزاؤں کی شدت تو دکھائی دیتی ہے لیکن انہیں ان سنگدل درندوں کے جرائم کی ہولناکی اور خوفناک اثرات دکھائی نہیں دیتے جن میں سے

بعض ایسے دیدہ دلیر ہیں کہ زندگی بھر کے لئے ان کا ذریعۂ معاش ہی چوری چکاری بن چکا ہے، ان کے باقاعدہ جتھے اور گروہ ہوتے ہیں جو شب و روز شریف اور پُر امن انسانوں کو ان کے خون پسینے کی کمائی سے محروم کرنے کے لئے منصوبہ بندی کرتے رہتے ہیں۔ یہ چور اور ڈاکو انتہائی پر تعیش زندگی گزارتے ہیں، مہنگے ترین علاقوں میں ان کی رہائش ہوتی ہے، قیمتی گاڑیوں پر سفر کرتے ہیں، باڈی گارڈ کے جلو میں تقریبات میں شریک ہوتے ہیں، پیسے کے بل بوتے پر انتظامیہ سے عدلیہ تک ہر جگہ اثر انداز ہوتے ہیں، اگر وہ پکڑے بھی جائیں تو جیل میں شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے ہیں، شراب سے شباب تک ہر چیز انہیں وہاں مہیا کی جاتی ہے۔

عبرتناک سزائیں نہ ملنے کی وجہ سے بے شمار بیروزگار نوجوان ہیں جنہوں نے سرقہ ہی کے شعبہ میں گویا ''ملازمت'' اختیار کر لی ہے، ان معترضین کو وہ مظلوم اور ستم رسیدہ بھی دکھائی نہیں دیتی جنہیں چور اچکے نانِ شبینہ تک کا محتاج کر دیتے ہیں، اگر دو چار بڑے بڑے مجرموں کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں تو امید ہے کہ ملک کے باسیوں کو امن اور تحفظ حاصل ہو جائے گا اور انہیں میٹھی نیند نصیب ہو گی۔

ہم نے یہاں خاص طور پر ''بڑے مجرموں'' کا ذکر اس لئے کیا ہے کیونکہ ہمارے ہاں کچھ ایسی ریت پڑ گئی ہے کہ چھوٹے مجرموں کو تو پکڑا جاتا ہے مگر بڑے مجرموں پر کوئی بھی ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کرتا، اگر کوئی جرأت کر ہی لے تو ایسے تگڑے اور صاحبِ حیثیت سفارشی اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ اس ''بیچارے'' کو اپنی جان، عزت اور ملازمت کے لالے پڑ جاتے ہیں، جبکہ ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حدود اور قیامِ عدل کے معاملے میں سفارش سے بچنے کی تلقین کی تھی، وہ واقعہ تو ہر مسلمان کو یاد ہو گا جو صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالے سے منقول ہے آپ فرماتی ہیں:

قریش کو مخزومی قبیلہ کی اس عورت کے معاملے نے پریشان کر دیا جس نے چوری کی تھی، انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کس کو سفارشی بنا کر بھیجا جائے؟ آخر میں یہ طے پایا کہ اسامہ سے زیادہ اس کام کے لئے کوئی موزوں نہیں کیونکہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ہیں چنانچہ وہ آپ کی خدمت میں سفارشی بن کر حاضر ہوئے آپ نے فرمایا: کیا تم حدود اللہ میں سے ایک حد کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟ پھر آپ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا جس میں فرمایا: ''اے لوگو! تم سے پہلے لوگ اس لئے گمراہ ہو گئے کہ جب ان کا کوئی معزز اور طاقت ور آدمی چوری کرتا تھا تو وہ اسے چھوڑ دیتے تھے اور اگر کمزور چوری کرتا تھا تو اس پر حد جاری کرتے تھے۔ اللہ کی قسم! اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو محمد اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔''

(بخاري : ٦٧٨٨، مسلم : ١٦٨٨)

آج ہمارے ہاں یہی ہو رہا ہے، چند سو کی چوری کرنے والا تو گرفتار ہو کر جیل میں گلتا سڑتا رہتا ہے جبکہ ملکی خزانے سے اور دوسرے طریقوں سے کروڑوں اور اربوں چوری کرنے والے نہ صرف دندناتے پھرتے ہیں بلکہ ''معززین'' میں شمار ہوتے ہیں۔

ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم تو مسلموں اور اپنے اصحاب اور صحابیات سے جن باتوں پر بیعت لیا کرتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ تم چوری نہیں کرو گے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے فرمایا: ''میں تم سے اس پر بیعت لیتا ہوں کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے، کسی نفس کو ناحق قتل نہیں کرو گے، زنا نہیں کرو گے، چوری نہیں کرو گے، نشہ آور چیز نہیں پیو گے، جس شخص نے ان میں سے کسی جرم کا ارتکاب کیا پھر اس پر حد لگائی گئی تو اس کے لئے یہ کفارہ ہو گی اور جس پر اللہ نے پردہ ڈال دیا تو اس کا حساب اللہ عز و جل کے ذمہ ہے اور جس نے

ان میں سے کوئی گناہ بھی نہ کیا میں اسے اللہ کی طرف سے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔"

(ذكره الهيثمي في المجمع : ٤، ١٠٤، ١٠٥)

سرقہ ان گناہوں میں سے ہے جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ کوئی مؤمن، حالتِ ایمان میں اس کا ارتکاب کر ہی نہیں سکتا۔ صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "زانی زنا نہیں کر سکتا جس وقت کہ وہ زنا کرتا ہے اس حال میں کہ وہ مومن ہو، شراب نہیں پی سکتا جس وقت کہ وہ شراب پیتا ہے اس حال میں کہ وہ مومن ہو، چوری نہیں کر سکتا جس وقت کہ وہ چوری کرتا ہے اس حال میں کہ وہ مومن ہو، لوٹ مار نہیں کر سکتا کہ اس کی طرف لوگوں کی نظریں اٹھی ہوئی ہوں اس حال میں کہ وہ مومن ہو۔" (بخاري : ٦٧٧٢، مسلم : ٥٧) ان میں سے کون سا گناہ ہے جو آج کا مسلمان نہیں کر رہا بلکہ ان سے بھی بڑے بڑے گناہوں میں مبتلا ہے بایں ہمہ اس کا خیال ہے کہ میرے ایمان میں کوئی فرق نہیں آتا۔

چوری چکاری کی روک تھام میں والدین عموماً اور مائیں خصوصاً اہم کردار ادا کر سکتی ہیں، کیونکہ اگر وہ اپنے بچوں کی تربیت اسی انداز سے کریں کہ انہیں سچ بولنے، حلال کھانے، دوسروں کے جسمانی اور مالی حقوق کی حفاظت کرنے اور امانت و دیانت سے زندگی گزارنے کی عادت پڑ جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ جوانی بلکہ پوری زندگی انہی اوصاف کے ساتھ نہ گزاریں مگر ہوتا یہ ہے کہ والدین کی ذاتی کمزوریاں اور چشم پوشی اولاد کو غلط راستے پر ڈال دیتی ہے۔

ایک حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چور پر لعنت فرمائی ہے جس کا ہاتھ انڈے کی چوری کی وجہ سے کاٹا جاتا ہے، (بخاري : ٦٧٨٣، ١٦٨٧) اس حدیث کے بارے میں اشکال ہوتا ہے کہ انڈے کی تو اتنی قیمت نہیں ہوتی کہ اس کی وجہ سے کسی کا ہاتھ کاٹا جائے تو پھر اس فرمان کا کیا مطلب ہے، محدثین اس کا جواب دیتے ہیں کہ جس چور

کا کسی بڑی رقم یا قیمتی چیز چوری کرنے کی وجہ سے ہاتھ کاٹا گیا اس نے چوری کا آغاز اپنے بچپن میں انڈے جیسی معمولی اور کم قیمت چیزوں ہی سے کیا ہوگا بتدریج وہ آگے بڑھتا گیا یہاں تک کہ وہ بڑے بڑے ہاتھ مارنے لگا اور بالآخر اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا، اگر بچپن ہی میں تنبیہ اور تربیت کی جاتی اور حکمت اور درد سے اسے سمجھایا جاتا تو شاید یہاں تک نوبت نہ پہنچتی۔

سخط

عربی زبان میں ’’سخط‘‘ کا لفظ غضب اور ناراضگی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کی ایسی سخت ناراضگی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، جس کی وجہ سے بندہ عذاب کا مستحق ہوجاتا ہے، (التوقيف على مهمات التعاريف : ١٩٨) سخط اور غضب میں یہ فرق کیا گیا ہے کہ سخط صرف بڑوں کی طرف سے ہوتا ہے جبکہ غضب چھوٹوں اور بڑوں دونوں کی طرف سے ہوسکتا ہے۔ (الكليات : ٥١٥) قرآن کریم میں چند مقامات پر سخط کا لفظ مختلف صیغوں میں استعمال ہوا ہے، سورۂ آلِ عمران میں ہے ’’کیا جس شخص نے اللہ کی رضا کی پیروی کی وہ اس کی طرح ہوسکتا ہے جو اللہ کی ناراضگی (سخط) کا مستحق ہو، اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ لوٹنے کی بہت بری جگہ ہے۔‘‘

(سورة آلِ عمران : ١٦٢)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم محبوبیت اور تقرب کے بلند ترین مقام پر فائز ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے پناہ مانگا کرتے تھے، صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک شب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہ پا کر اِدھر اُدھر تلاش کیا تو میرا ہاتھ آپ کے قدموں پر پڑا جو کہ اٹھے ہوئے تھے اور آپ سجدہ میں یہ دعاء مانگ رہے تھے: ’’اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں تیری رضا کے ساتھ، تیری ناراضگی سے، تیری عافیت کے ساتھ، تیرے عذاب سے اور تیری ذات کے ساتھ تجھی سے، میں ویسے تیری تعریف نہیں کرسکتا جیسے تو نے اپنی تعریف خود کی ہے۔‘‘ (مسلم : ٤٨٦)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعاء مانگا کرتے تھے: ’’اے اللہ! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں تیری نعمت کے زوال

سے، تیری عافیت کے بدل جانے سے، تیری اچانک پکڑ سے اور تیری ہر قسم کی ناراضگی سے۔'' (مسلم: ۲۷۳۹)

ان دونوں دعاؤں میں ہم نے جہاں ناراضگی کے لفظ کے ساتھ ترجمہ کیا ہے وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''سخط'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ایک سچے مسلمان کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل ہے اور سب سے زیادہ مہلک اور خطرناک چیز اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہے،اس کی نظر میں اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے کے مقابلے میں ساری دنیا کو ناراض کرنا آسان ہے،خواہ اس کے قلبی دوست،قریبی رشتہ دار اور صاحبِ اختیار حکمران اور وڈیرے ہی کیوں نہ ہوں،ایسے شخص کے مسائل اللہ تعالیٰ خود حل فرماتا ہے اور اسے انسانوں کا محتاج ہونے اور ان کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچالیتا ہے، جب اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کا ارادہ فرمالیتا ہے تو کسی بڑے سے بڑے کی ناراضگی اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتی، اس کے برعکس جو شخص ہر وقت انسانوں کو راضی کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔یہاں تک کہ انسانوں کو خوش کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنا پڑے تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کرتا، ایسا شخص ہر وقت پریشان رہتا ہے،اس کی ساری کوشش کے باوجود انسان بھی اس سے خوش نہیں ہوتے دوسری جانب اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوجاتا ہے۔جامع ترمذی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''جو شخص انسانوں کی ناراضگی کے باوجود اللہ کی رضا کا طلب گار ہوگا،اسے اللہ انسانوں کا محتاج ہونے سے بچالے گا اور جو شخص اللہ کو ناراض کر کے انسانوں کو راضی کرنے کی کوشش کرے گا اسے اللہ انسانوں کے حوالے کر دے گا۔'' (ترمذي: ۲٤۱٤)

یوں تو اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے والے اعمال بہت سارے ہیں،لیکن ان میں سے چند اعمال کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر ''سخط'' کے عنوان سے کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رب کی رضا والد کی رضا میں اور رب کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں ہے۔'' یعنی جو شخص کسی شرعی وجہ کے بغیر والد کو ناراض کرے گا، اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہو جائے گا۔

(ترمذي : ١٨٩٩)

ابن ماجہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص ظلم وستم میں مدد کرے گا وہ مسلسل اللہ کے غضب میں رہے گا جب تک کہ اس سے باز نہ آجائے۔'' (ابن ماجه : ٢٣٢٠)

بندگانِ خدا پر ظلم بہت بڑا گناہ ہے، جو لوگ ظلم کا ارتکاب کرتے ہیں یا ظالموں کے معاون ثابت ہوتے ہیں وہ سب غضبِ الٰہی کا نشانہ بنتے ہیں۔

اسی سے ملتی جلتی ایک روایت صحیح مسلم میں بھی ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر طویل زمانہ گزر گیا تو ممکن ہے تم ایسے لوگوں کو دیکھو جن کے ہاتھوں میں گائے کی دم جیسی چیزیں ہوں گی، ان کی صبح بھی اللہ کے غضب میں اور شام بھی اللہ کے غضب میں گزرے گی۔'' (مسلم : ٢٨٥٧)

اس حدیث میں ان ظالم حکمرانوں اور ان کے کارندوں کی طرف اشارہ ہے، جن کے ہاتھوں میں کوڑے ہوں گے اور وہ محض اپنی ہیبت اور دبدبہ رعایا پر بٹھانے کے لیے ان کی پیٹھوں پر برسائیں گے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر انہیں سخت سزائیں دیں گے۔

اعمال وافعال کے علاوہ بسا اوقات انسان کی زبان سے ایسے اقوال بھی نکل جاتے ہیں، جو اسے اللہ تعالیٰ کے غضب اور دوزخ کا مستحق بنا دیتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بندہ اپنی زبان سے اللہ تعالیٰ کی رضا کا کوئی ایسا کلمہ بول دیتا ہے، جس کی عظمت سے وہ بے خبر ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اس کے

ذریعے اس کے درجات کو بلند کردیتا ہے، اس کے برعکس وہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بننے والی کوئی بات کہہ دیتا ہے، جس کی مضرت کی طرف اس کا دھیان نہیں جاتا، مگر وہی بات اسے دوزخ میں لے جانے کا سبب بن جاتی ہے۔" (بخاری: ٦٤٧٨)

کفر وشرک کا کلمہ، دل دکھانے والی بات، اجتماعیت اور اتحاد کو انتشار اور فساد میں تبدیل کرنے والا کلام، احکامِ الٰہیہ اور ارشاداتِ نبویہ کا استہزاء یہ سب ایسی باتیں ہیں جو رب کے غضب کو دعوت دینے والی ہیں جبکہ کلمہ طیبہ، ذکر واستغفار، عیادت اور تعزیت، صلح اور محبت کے لیے ہونے والی بات چیت انسان کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مستحق بنادیتی ہے۔

یہاں ایک آخری نکتہ یہ ملحوظ رکھنے کا ہے کہ انسان کے اعمال خواہ کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں اسے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اس سے کوئی ایسی حرکت، کوئی ایسا عمل، کوئی ایسی بات سرزد نہ ہوجائے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بن جائے کیونکہ بے شمار لوگ ایسے ہیں جو صراطِ مستقیم پر چلتے چلتے ہٹ جاتے ہیں، ہدایت کی شاہراہ چھوڑ کر ضلالت کی پگڈنڈیوں پر چلنے لگتے ہیں، رضا کی بلندی پر چڑھتے چڑھتے غضب کی پستی میں جا گرتے ہیں، لیکن ایک دن آئے گا جب سچے مؤمن کا یہ اندیشہ اور وسوسہ ختم ہوجائے گا۔ وہ دن اس کے لیے بے پناہ مسرت کا دن ہوگا، وہ مسرت کی اس خبر کے مقابلے میں جنت کی ساری نعمتوں کو بھی ہیچ سمجھے گا۔

بخاری اور مسلم میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب جنتیوں کو جنت کی نعمتیں عطا کردی جائیں گی تو اللہ تعالیٰ ان سے کہے گا کہ میرے پاس تمہارے لیے ان نعمتوں سے بھی ایک افضل چیز ہے، وہ سوال کریں گے کہ ان نعمتوں سے بہتر چیز کون سی ہے؟ اللہ فرمائے گا میری رضا! آج کے بعد میں کبھی بھی تم سے ناراض نہیں ہوں گا۔ (بخاری: ٧٤٣٩)

اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی کونین کی یہ عظیم ترین نعمت عطا فرمائے۔

سفاہت

اردو میں سفاہت اور حماقت دونوں بے وقوفی کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ عربی میں سفاہت کا لفظ جہالت واضطراب، جسمانی کمزوری، ہلکا پن اور حلم و بردباری کی ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ (مقاییس اللغة : ۳/۷۹، ۸۰)

امام جاحظ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سفاہت حلم کے اُلٹ ہے، غصے کی تیزی، چھوٹی سی بات پر بھڑک اٹھنے، سزا دینے میں حد سے تجاوز کرنے، انتقام لینے میں جلدی کرنے، تھوڑی سی تکلیف پر ہائے واویلا کرنے اور فحش گالی گلوچ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔''

(تہذیب الاخلاق : ۲۹)

امام جرجانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سفاہت اس بیوقوفی اور ہلکے پن کو کہتے ہیں جو خوشی اور غضب کی وجہ سے انسان پر طاری ہو جاتا ہے اور وہ انسان کو ایسے عمل پر آمادہ کر دیتا ہے جو عقل اور شریعت کے تقاضوں کے خلاف ہوتا ہے۔'' (التعریفات : ۱۲۵)

سفاہت سے سفیہ بنا ہے جس کا معنی ہے بیوقوف، سفیہ کی ضد سفہاء ہے۔ قرآن کریم میں دو قسم کے لوگوں پر ''سفہاء'' کا اطلاق کیا گیا ہے:

۱۔ جو دنیاوی معاملات میں حماقت اور بے عقلی کا مظاہرہ کریں جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت ۵ میں یتیموں کے سرپرستوں اور وارثوں کو حکم دیا گیا ہے: ''اپنے اموال بے وقوفوں کے حوالے نہ کرو۔''

ظاہر ہے کہ یتیم کا جو موروثی مال و متاع ہے وہ ایک نہ ایک دن اس کے حوالے کیا جائے گا، یہ اس پر احسان نہیں بلکہ اس کا حق ہے، لیکن ناتجربہ کاری اور بے سمجھی ہی کے زمانے میں اگر روپیہ پیسہ، زمین اور جائیداد اس کے حوالے کر دی گئی تو اندیشہ ہے کہ وہ اسے

عیش وعشرت میں اڑا دے گا، اس لیے حکم دیا گیا ہے کہ جب تک اس کے اندر دنیاوی معاملات میں سوجھ بوجھ اور عقلی پختگی کے آثار ظاہر نہ ہوں، اس وقت تک میراث میں جو اس کا حصہ بنتا ہے وہ اس کے حوالے نہ کیا جائے، اس وضاحت سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ فضول خرچی اور ناجائز مصرف پر مال اڑانے والا انسان بھی شریعت کی نظر میں بے وقوف شمار ہوتا ہے۔

۲۔ جو لوگ دینی اور اخروی معاملات میں ناسمجھی کا مظاہرہ کرتے ہیں، قرآن کریم میں انہیں بھی ''سفہاء'' (بے وقوف) کہا گیا ہے، سورۂ بقرہ کی آیت ۱۳ میں ہے: ''جب ان (منافقوں) سے کہا جاتا ہے ایمان لے آؤ تو وہ کہتے ہیں کیا ہم ایمان لے آئیں جیسے بے وقوف ایمان لے آئے، سن لو! وہی ہیں بے وقوف لیکن وہ جانتے نہیں ہیں۔''

(المفردات: ۲۳۵)

یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ منافقین، ایمان والوں کو اس وجہ سے بے وقوف کہتے تھے کہ انہوں نے ایمان کی خاطر مادی مفادات تج دیئے تھے اور ایمانی رشتے پر سارے رشتوں اور تعلقات کو قربان کر دیا تھا، لیکن قرآن نے جو منافقوں کو بے وقوف قرار دیا تو اس لیے کہ انہوں نے دنیا کو آخرت پر، عارضی زندگی کو حقیقی زندگی پر اور مادی مفادات کو ایمانی تقاضوں پر ترجیح دی۔

اس میں شک ہی کیا ہے کہ حقیقی بے وقوف وہی ہے جو دین اور آخرت کے معاملات میں ناسمجھی اور غیر سنجیدہ پن کا مظاہرہ کرتا ہے، دنیا کے امور میں بے وقوفی کا مظاہرہ کرنے سے تھوڑے سے روپے پیسے یا عارضی منافع کا نقصان ہوتا ہے جبکہ دین کے بارے میں سفاہت انسان کی دائمی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے، اس حوالے سے جتنی بڑی غلطی کا ارتکاب کیا جائے گا اتنا ہی زیادہ نقصان ہوگا، مثال کے طور پر یوں تو چھوٹے سے چھوٹا گناہ

بھی حماقت ہے، لیکن کفر وشرک اتنی بڑی حماقت ہے کہ اگر اسی پر انسان کا خاتمہ ہوگیا تو اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں اور ایسے شخص کو تباہی و بربادی سے کوئی نہیں بچاسکتا۔

کسی ادیب کا قول ہے کہ "ہر شخص کو اپنی عقل اور دوسرے کی دولت زیادہ دکھائی دیتی ہے۔" اس قول کی سچائی کا عملی مشاہدہ ہم اس وقت کرتے ہیں جب ہم بڑے بڑے احمقوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ عظیم ترین انسانوں اور عقل وخرد کی چلتی پھرتی تصویروں پر حماقت کی پھبتیاں کستے ہیں، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے بڑا عقلمند اور مشرکوں سے بڑا بے وقوف دنیا میں کون ہوسکتا ہے؟ مگر یہ نامی گرامی بے وقوف اللہ تعالیٰ کے رسولوں کو بے وقوف تک کہنے سے باز نہیں آتے تھے، سورۂ اعراف میں ہے کہ قومِ عاد نے حضرت ہود علیہ السلام سے کہا "ہم تجھے سفاہت میں مبتلا دیکھتے ہیں اور ہم تجھے جھوٹوں میں سے سمجھتے ہیں" اللہ تعالیٰ کے نبی نے کمالِ حلم وعقل سے کام لیتے ہوئے جواب دیا "اے میری قوم! میں کسی قسم کی سفاہت میں مبتلا نہیں ہوں بلکہ میں تو رب العالمین کا رسول ہوں۔"

(سورۂ اعراف : ٦٦، ٦٧)

سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیثِ مبارکہ میں ان حکمرانوں کو بھی "سفہاء" قرار دیا ہے جو شریعت سے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے دور ہوں گے اور گمراہ فرقوں کے ان بانیوں اور قائدین کو بھی "سفہاء" (بے وقوف) فرمایا ہے جو پرلے درجے کے مکار اور ریاکار ہوں گے اور دین کے نام پر لوگوں کو بے وقوف بنائیں گے۔

اس حوالے سے دو حدیثوں کا مطالعہ قارئین اور قاریات کے لیے مفید ثابت ہوگا:

۱۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "اللہ تعالیٰ تجھے بے وقوفوں کی حکومت وامارت سے بچائے، انہوں نے سوال کیا کہ بے وقوفوں کی امارت سے کیا مراد

ہے؟ آپ نے فرمایا: میرے بعد ایسے امراء ہوں گے جو میری سیرت کی اقتداء نہیں کریں گے اور میری سنت پر عمل نہیں کریں گے جو لوگ ان کے جھوٹ کو سچ کہیں گے اور ظلم میں ان کی مدد کریں گے۔ ان کا میرے ساتھ اور میرا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی وہ حوض کوثر پر آسکیں گے، لیکن جو لوگ ان کے جھوٹ کو سچ قرار نہیں دیں گے اور ظلم میں ان کے مددگار ثابت نہیں ہوں گے، وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں اور انہیں حوض کوثر پر میرے حضور پیش ہونے کی سعادت حاصل ہوگی۔" (النسائی : ١٦٠)

اس حدیث میں مسلمانوں کے ان حکمرانوں کو بے وقوف کہا گیا ہے جو سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور سیرت کو چھوڑ کر اغیار کو اپنا آئیڈیل بنائیں گے اور ان کے طور طریقوں کو اپنائیں گے، اسی طرح ان خوشامدیوں کی بھی مذمت کی گئی ہے جو ایسے گمراہ اور ظالم حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں، ان کے جھوٹ کو سچ اور ظلم کو عدل ثابت کرنے کے لئے دور کی کوڑی لاتے اور حقائق کو مسخ کرتے ہیں۔ دیکھا جائے تو آج عالمِ اسلام میں ایسے حکمرانوں کی بھی کمی نہیں جن کی زندگی میں سیرتِ نبویہ کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی اور ایسے درباریوں اور ضمیر فروشوں کی بھی کمی نہیں جو انہیں مسلمانوں کے حقوق غصب کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔

۲۔ دوسری حدیث جس میں چرب زبان، شہرت پسند، دولت پرست اور عیار و مکار لیڈروں اور خطیبوں کو بے وقوف قرار دیا گیا ہے، وہ صحیح بخاری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: "میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "آخری زمانے میں کچھ نو عمر لوگ سامنے آئیں گے جو عقل کے کچے اور بے وقوف ہوں گے، یوں تو وہ اللہ اور رسول کی باتیں کریں گے، لیکن ان کا ایمان ان کے حلق سے تجاوز نہیں کرے گا، تم انہیں جہاں بھی پاؤ انہیں مار ڈالو کیونکہ انہیں مار ڈالنے والے کو قیامت کے دن

اجر وثواب عطا کیا جائے گا۔" (بخاري: ٥٠٥٧، مسلم: ١٠٦٦)

اتفاق سے ہمارے زمانے میں اس قسم کے بے وقوف بھی بے شمار ہیں جو اپنے لیکچر اور بیان میں حوالوں کے طور پر قرآنی آیات بکثرت پڑھتے ہیں، احادیث کے بھی حوالے دیتے ہیں، لیکن وہ ذہنی اعتبار سے مغرب سے از حد مرعوب اور فکری گمراہیوں میں مبتلا ہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ ساری قوم کو اسی گمراہی میں مبتلا کر دیں، وہ اپنی خواہشات اور ترجیحات کو کتاب وسنت کے تابع نہیں کرنا چاہتے بلکہ کتاب وسنت کو اپنی خواہشات کے تابع کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یقیناً ایسے لوگوں سے بڑا وقوف کوئی نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ اپنے آپ کو عقلمند ہی سمجھتے رہیں۔

بدخلقی

اللہ تعالیٰ کے کسی نیک بندے نے بداخلاق انسان کی علامات یہ بتائی ہیں: ''وہ قلیل الحیاء ہوتا ہے، ہر کسی کو اذیت دیتا ہے، اس میں صلاح اور درستگی کی کمی ہو جاتی ہے، زبان کا جھوٹا اور فضولیات کا عادی ہوتا ہے، عمل کم اور باتیں زیادہ کرتا ہے، اس سے اکثر لغزشیں سرزد ہوتی ہیں، اس کے اندر نہ نیکی کا شوق، نہ صلہ رحمی کا جذبہ، نہ وقار، نہ صبر، نہ شکر، نہ حلم و بردباری، نہ شفقت ومحبت اور نہ عفت وعصمت پائی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کے فیصلوں اور تقدیر پر راضی نہیں ہوتا، وہ گالی گلوچ، لعن طعن، غیبت اور چغلی، بغض وحسد، غیظ وغضب اور جلد بازی میں مبتلا ہوتا ہے، وہ اپنی شہوات وخواہشات میں مگن رہتا ہے اور انہی کی پرستش کی وجہ سے وہ دوسروں سے ناراض ہوتا ہے۔'' (احیاءِ علوم: ۳/۷۶، ۷۷)

ضروری نہیں کہ بداخلاقی کا لیبل چسپاں کرنے کے لیے ان ساری علامات کے وجود کو ضروری قرار دیا جائے، جس بدنصیب کے اندر یہ ساری علامتیں پائی جائیں وہ گویا کہ بہت بڑا بداخلاق ہوگا اور جس کے اندر ان میں سے بعض پائی جائیں اس کے بدخلق ہونے کا درجہ اسی اعتبار سے متعین ہوگا۔

☆ امام غزالی رحمہ اللہ نے خوش خلقی کو ایمان اور بدخلقی کو نفاق قرار دیا ہے، یہ بھی انہی کا قول ہے کہ ''برے اخلاق ایسا زہرِ قاتل، ایسا سامانِ ہلاکت وذلت اور ایسے واضح رذائل اور خباثتیں ہیں جو انسان کو رب العالمین کے قرب سے دور کر دیتے ہیں اور اسے شیاطین کی لڑی میں پرو دیتے ہیں اور اخلاقِ بد، اللہ تعالیٰ کی جلائی اس آگ کی طرف کھلنے والے وہ دروازے ہیں جو دلوں پر چڑھ جائے گی۔'' (الاحیاء: ۳/۵۳)

☆ حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ اپنے متعلقین کو بداخلاق کی صحبت سے بچنے کی

تلقین فرمایا کرتے تھے کیونکہ وہ صرف شر ہی کی دعوت دیتا ہے، (مساوئ الاخلاق ومذمومھا: ۲٤) نیز یہ بھی فرماتے تھے کہ ایسا فاسق وفاجر شخص جس کے اخلاق اچھے ہوں وہ مجھے زیادہ پسند ہے اس عبادت گزار سے جس کے اخلاق برے ہوں۔"

(الاحیاء: ۳/ ۵۷)

☆ حضرت ابوحازم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "بداخلاق شخص کی بدخلقی سے سب سے زیادہ تکلیف خود اسے ہوتی ہے، پھر اس کی اہلیہ اور اولاد کو پریشانی ہوتی ہے، وہ جب گھر میں داخل ہوتا ہے تو سب خوش وخرم ہوتے ہیں، لیکن اس کی آواز سنتے ہیں تو خوف کے مارے سب اِدھر اُدھر ہوجاتے ہیں یہاں تک کہ اس کے جانور بھی اس سے بدکتے ہیں کہ کہیں ہمیں یہ پتھر اور لاٹھی نہ مار دے، اس کا کتا اور بلی بھی ڈر کی وجہ سے بھاگ کر دیوار پر چڑھ جاتے ہیں۔" (مساوئ الاخلاق ومذمومھا: ۲٦)

☆ قرآنِ کریم کی دسیوں آیات میں برے اخلاق کی مذمت بیان کی گئی ہے، کہیں جھوٹوں اور ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت کا ذکر ہے، کہیں تندخو، سخت مزاج اور جفا پیشہ انسانوں پر رب کا عذاب نازل ہونے کی صراحت ہے، کہیں بدگمانی، بغض وحسد، غیبت اور چغلی سے بچنے کی تلقین ہے۔ کہیں ایسی اقوام کا تذکرہ ہے جنہیں اخلاقِ بد میں ملوّث ہونے کی وجہ سے تباہ کردیا گیا۔ سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں بھی برے اخلاق کی باربار مذمت کی گئی ہے۔

☆ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایک بندہ، عبادت میں کمزوری کے باوجود اپنے اچھے اخلاق کی بدولت آخرت کے بلند درجات حاصل کرلے گا اور دوسرا بندہ برے اخلاق کی وجہ سے دوزخ کے سب سے نچلے درجے کا حقدار ہوجائے گا۔" (احیاء علوم الدین: ۳/ ۵۲)

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! فلاں عورت، کثرت سے نماز، صدقہ اور روزوں کا اہتمام کرتی ہے مگر وہ اپنی زبان سے پڑوسیوں کو تکلیف دیتی ہے، آپ نے فرمایا وہ دوزخ میں جائے گی۔''

(الترغیب و الترھیب : ۳/۳۵٦)

☆ ابوداؤد میں حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ایسا شخص جو شیخی باز متکبر اور سخت مزاج ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔'' (ابو داؤد : ٤٨٠١)

بعض قارئین اور قاریات کو ممکن ہے تعجب ہو کہ خوش اخلاقی کی اتنی فضیلت اور بداخلاقی کی اس قدر مذمت کیوں ہے؟ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا تعلق براہِ راست ایمان کے ساتھ ہے تو ہمارا تعجب دور ہو جاتا ہے، جس شخص کے اندر کامل درجے کا ایمان پایا جاتا ہے اس کے اخلاق بھی اعلیٰ ہوں گے اور جو ایمانی اعتبار سے کمزور ہوگا اس کے اخلاق میں بھی ضعف اور کجی ہوگی۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اچھے اخلاق کی بنیاد درجِ ذیل چند عناصر پر ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ کے خالق، رازق اور مالک ہونے پر ایمان۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی ایسی معرفت جو دل میں یہ یقین پختہ کر دے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی عبادت کا مستحق ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی ایسی محبت جو بندے کے تمام احساسات و جذبات پر غالب آ جائے اور اسے یقین آ جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی محبوب نہیں۔

۴۔ اس محبت کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ بندے کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد رضاءِ الٰہی کا حصول بن جائے گا اور وہ زندگی کے ہر عمل اور شعبہ میں اس کی رضا کا متلاشی ہوگا۔

۵- جب اس کے اندرونی جذبات ایسے بن جائیں گے تو اب اس کے اخلاق میں پاکیزگی اور بلندی پیدا ہو جائے گی اور وہ خواہشات کی پرستش سے اوپر اٹھ جائے گا، لیکن اگر یہ عناصر نہ پائے گئے تو اسے اخلاقی بلندی نصیب نہیں ہوگی، گویا بداخلاقی اس بات کی علامت ہے کہ بندے کے دل میں ابھی تک ایمان راسخ نہیں ہوا۔

(النظرية الخلقيه عنه ابن تيميه : ٥٨)

ممکن ہے کسی کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہو کہ بعض غیر مسلموں کے اخلاق بھی بہت اچھے ہوتے ہیں، لیکن اگر غور کیا جائے تو بندۂ مؤمن اور بندۂ کافر کے اخلاق میں بہت فرق ہوتا ہے، کافر کے اخلاق، اس کا تبسم، اس کا رکھ رکھاؤ، اس کی محبت اور چاہت محض دکھاوے اور کاروباری انداز کی ہوتی ہے، اسی لیے بسا اوقات وہی شخص جو ہمیں بڑا خوش اخلاق معلوم ہوتا ہے وہ بعض دوسرے مواقع پر ایسا درندہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے مقابلے میں درندوں کی درندگی ہیچ ثابت ہوتی ہے۔

دورِ حاضر کے سارے کفار خصوصاً امریکیوں کو دیکھ لیجیے جن کی خوش اخلاقی کا بڑا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے لیکن وہ عالمِ اسلام کے لیے کیسے سنگدل ثابت ہو رہے ہیں، کابل سے بغداد تک ان کی بداخلاقی اور خباثت و درندگی کے ان مٹ نقوش ثبت ہو چکے ہیں، جبکہ بندۂ مؤمن کی خوش اخلاقی صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہوتی ہے، اسے دعاء دی جائے یا کہ گالی، صلہ ملنے کی امید ہو یا نہ ہو وہ ہر حال میں اخلاقی پستیوں کا شکار نہیں ہوتا اور اخلاقی برتری قائم رکھتا ہے۔

آخر میں امام ابن قیم رحمہ اللہ کا انتہائی قیمتی ارشاد نقل کر کے بات کو ختم کیا جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ''سارے گھٹیا اخلاق کی بنیاد چار چیزوں پر ہے جہالت، ظلم، شہوت اور غضب۔'' (نضرة النعيم : ١٠/٤٦٤٦)

باری تعالیٰ ہمیں ان چاروں کے شر سے بچائے۔ آمین

بدگمانی

سورۂ حجرات کی آیت ۱۲ میں ہے: ''اے ایمان والو! بہت گمان کرنے سے احتراز کرو کیونکہ بعض گمان گناہ ہیں۔''

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر مسلمان کے بارے میں اچھا گمان رکھا جائے اور خواہ مخواہ بدگمانی کو دل میں جگہ نہ دی جائے، جیسا کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ہر کسی کے بارے میں بدگمانی کا شکار رہتے ہیں، جب یہ بیماری بڑھ جاتی ہے تو وہ اپنے اہل وعیال، عزیز واقارب یہاں تک کہ والدین کے بارے میں بھی بری سوچ رکھنے لگتے ہیں۔

عام طور پر بدگمانی کے مرض میں وہ شخص مبتلا ہوتا ہے، جس کی فطرت میں کجی اور باطن میں خباثت ہوتی ہے، اس کے دل میں چونکہ گندگی ہوتی ہے اس لئے وہ جس طرف بھی نظر اٹھاتا ہے اسے گندگی ہی دکھائی دیتی ہے، اس کے برعکس جس کے دل میں ایمان کا نور اور نیکی کی محبت ہوتی ہے وہ ہر ایک کو نیک اور اپنے سے اچھا سمجھتا ہے، آپ نے ایسے اللہ والوں کے حالات اور واقعات پڑھے ہوں گے جو چوروں، ڈاکوؤں اور زانیوں کے بارے میں بھی اچھا گمان رکھتے تھے اور انہیں نفرت کا نشانہ نہیں بناتے تھے، ایسے ہی حضرات تھے جن کی نظرِ محبت نے بڑے بڑے گناہ گاروں کو توبہ اور نیکی کی راہ پر ڈال دیا اور جو بدگمانی رکھنے والے ہوتے ہیں وہ اچھوں کو بھی اچھائی کی راہ سے ہٹا کر برائی کی راہ پر لگا دیا کرتے ہیں، ان کے اندر کی جو گندگی ہوتی ہے وہ ان کی نظروں سے، ان کے چہرے سے، ان کی زبان سے غرضیکہ ہر عضو سے ظاہر ہوتی ہے، بدگمانی کی بیماری کی وجہ سے وہ مسلمان کو حقیر بھی سمجھتے ہیں، اس کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی بھی کرتے ہیں، اس کی عزت سے بھی کھیلتے ہیں اور غیبت سے لے کر بہتان تراشی تک ہر کبیرہ گناہ کا ارتکاب بھی کرتے ہیں بلکہ ایسی

مثالیں بھی سامنے آئی ہیں کہ محض بدگمانی کی بناء پر دوسرے مسلمان کے خون سے ہاتھ رنگ لیئے گئے اور جب تحقیق کی گئی تو پتا چلا کہ مقتول کا اس کے سوا کوئی گناہ نہ تھا کہ قاتل کے دل میں اس کے لئے بدگمانی تھی، اس نے حقیقت تک پہنچنے کی کوئی کوشش نہ کی اور اپنی بدگمانی ہی کو حقیقت سمجھ کر قتل جیسے عظیم گناہ کا ارتکاب کرلیا۔

بدگمانی کے بہت سارے نقصانات ہی کی وجہ سے اہلِ علم تلقین کیا کرتے ہیں کہ کسی مسلمان کے بارے میں اس وقت تک برا گمان رکھنا جائز نہیں جب تک کہ اس کی کوئی ایسی واضح حرکت سامنے نہ آجائے جس کی تاویل نہ کی جاسکتی ہو، اگر کوئی ثقہ اور قابلِ اعتماد انسان خبر دے جس کی تصدیق پر ہم اپنے آپ کو مجبور پائیں تب ہم معذور ہوں گے کیونکہ اگر ہم اس خبر کو جھٹلائیں تو گویا اس ثقہ کو جھوٹا سمجھنے کی بدگمانی میں مبتلا ہوجائیں گے، البتہ اس صورت میں ہمیں خبر کی تصدیق کرنے سے پہلے یہ تحقیق ضرور کرلینی چاہئے کہ کہیں ان دونوں میں حسد اور عداوت تو نہیں، جس کی وجہ سے یہ صاحب ان کے بارے میں ایسی خبریں پھیلا رہے ہیں۔

بدگمانی کی بیماری سے بچنے کا ایک مؤثر علاج یہ ہے کہ جس شخص کے بارے میں دل میں کوئی برا خیال پیدا ہو اس کے ساتھ حسنِ سلوک اور اس کے لئے دعاءِ خیر میں اضافہ کردیا جائے، یہ رویہ شیطان کو غیظ وغضب میں مبتلا کردے گا اور وہ آئندہ برے گمان پیدا کرنے سے باز آجائے گا اس لئے کہ جب وہ دیکھے گا کہ میری ساری کوشش رائیگاں گئی ہے اور یہ شخص تجسس، غیبت اور چغلی میں مبتلا ہونے کے بجائے دعاءِ خیر اور حسنِ سلوک میں مزید ترقی کرگیا ہے تو وہ اپنی لاحاصل سعی کو ترک کردے گا۔

بعض ایسے سیاہ بخت بھی ہوتے ہیں جو انسانوں کے علاوہ خود باری تعالیٰ کے بارے میں بھی بدگمانی میں مبتلا ہوجاتے ہیں، مثال کے طور پر جب وہ دوسروں کو صحت، فراغت،

خوشحالی اور نیک اولاد جیسی نعمتوں سے شاداں وفرحاں اور اپنے آپ کو ابتلاؤں کا ہدف بنا دیکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں کہ وہ فلاں کے ساتھ اچھا اور (معاذ اللہ!) میرے ساتھ برا سلوک کیوں کر رہا ہے۔

بدگمانی کے بے پناہ مفاسد کی وجہ سے قرآن کریم کے علاوہ احادیث نبویہ میں اس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم بدگمانی سے بچ کر رہو کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، تم دوسروں کے عیوب کی ٹوہ میں نہ رہا کرو، نہ ایک دوسرے پر بڑھنے کی بے جا ہوس کرو، نہ آپس میں حسد رکھو، نہ بغض رکھو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو، اے اللہ کے بندو! جیسا اللہ نے فرمایا ہے، آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ۔''

(بخاري : ٦٠٦٤ ، مسلم : ٢٥٦٣)

اگر کوئی شخص ایسی حالت میں ہو جس سے دوسرے کو بدگمانی کا موقع ملے تو اسے چاہئے کہ وہ اس کی بدگمانی دور کر دے تاکہ وہ بدگمانی کا شکار ہو کر گناہ میں نہ پڑے، اس کی مثال خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہمیں مل جاتی ہے، ایک دفعہ آپ اعتکاف میں بیٹھے تھے، رات کو ازواج مطہرات میں سے کوئی آپ سے ملنے آئیں، آپ ان کو واپس پہنچانے چلے کہ اتفاقاً راستے میں دو انصاری سامنے آ گئے وہ آپ کو کسی عورت کے ساتھ دیکھ کر اپنے آنے کو بے موقع سمجھے اور واپس پھرنے لگے، آپ نے فوراً آواز دی اور فرمایا یہ میری فلاں بیوی ہیں، انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ! اگر ہمیں کسی کے ساتھ بدگمانی کرنی ہوتی تو آپ کے ساتھ کرتے؟ آپ نے فرمایا شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑ جاتا ہے۔

شیطان کیسے انسان پر غالب آ جاتا ہے؟ اس کی واضح مثال ام المؤمنین سیدہ عائشہ

صدیقہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ ہے، ان سے زیادہ پاکدامن کون ہوسکتا ہے؟ لیکن شیطان نے بہت سے منافقین کے علاوہ بعض مخلص ایمان والوں کو بھی بدگمانی میں مبتلا کردیا اور وہ بھی سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ کے بارے میں وہی کچھ کہنے لگے جو کچھ منافقین کہہ رہے تھے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: ''جب تم نے وہ بات سنی تھی تو مومن مردوں اور عورتوں نے کیوں اپنے دلوں میں نیک گمان نہ کیا اور کیوں نہ کہا کہ یہ صریح بہتان ہے۔'' (النور: ۱۲)

ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ بدگمانی کئی گناہوں کی بنیاد بنتی ہے، اس کا انجام بہرحال اچھا نہیں ہوتا، یہ منافقوں کی صفت اور پہچان ہے، اس کی وجہ سے بندہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا مستحق ہوجاتا ہے، بدگمانی سے گھرانے اور ادارے تباہ ہوجاتے ہیں، بدگمانی فطرت کی کجی اور باطن کے فساد کی دلیل ہے، یہ انسانوں کے درمیان نفرت اور عداوت کی فصل کاشت کرتی ہے۔

حرص وطمع

عربی زبان بڑی وسیع وفصیح زبان ہے، اس میں بے شمار الفاظ ایسے ہیں جن کا اردو میں ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا، آپ ''شح'' کے لفظ کو ہی لے لیجئے! عام طور پر اس کا ترجمہ بخل کے ساتھ کردیا جاتا ہے حالانکہ شح اور بخل میں فرق ہے۔ طاؤس رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بخل اس چیز کے بارے میں ہوتا ہے جو انسان کے قبضے میں ہو اور شح اس چیز کے بارے میں ہوتا ہے جو دوسروں کے پاس ہو اور انسان یہ چاہے کہ یہ چیز، حلال یا حرام کسی بھی طریقے سے میرے پاس آجائے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کسی چیز کی شدید قسم کی حرص، اس کی طلب میں مبالغہ اور اس کے حصول میں حد درجہ طمع کرنے پر ''شح'' کا اطلاق ہوتا ہے اور اسے پالینے کے بعد خرچ کرنے سے اپنے آپ کو روکے رکھنے اور اس چیز سے شدید محبت پر بخل کا اطلاق ہوتا ہے گویا یہ شخص، حصول سے پہلے ''شحیح'' اور حصول کے بعد ''بخیل'' تھا۔

بخل، شح کا ثمرہ اور نتیجہ ہے، شح، انسان کے دل میں چھپا ہوتا ہے اور اسے بخل پر آمادہ کرتا ہے، جو شخص بخل کرتا ہے وہ شح کی اطاعت کرتا ہے اور جو بخل نہیں کرتا وہ شح کی نافرمانی کرتا ہے اور کامیاب ہے، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں سورۂ حشر میں فرمایا گیا ہے: ''اور جنہیں اپنے نفس کے بخل سے بچالیا گیا وہ کامیاب ہیں'' اگرچہ اردو میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو شح کا مفہوم پوری طرح ادا کرسکے، لیکن پھر بھی کسی حد تک ''حرص وطمع'' سے ہم اس کی ترجمانی کرسکتے ہیں۔ (الوابل الصیب: ۵۳)

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر شح کا ذکر آیا ہے، سورۂ نساء میں ہے: ''انسانی طبیعت میں بخل رکھا گیا ہے۔'' (النسآء: ۱۲۸)

اس آیتِ کریمہ میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ انسان کی فطرت میں مال کی محبت، حرص اور بخل پایا جاتا ہے، یہ چیز اگر ایک حد تک ہو تو نقصان دہ نہیں ہے کیونکہ انسان کی فطرت میں مال کی طرف جو میلان پایا جاتا ہے اس سے تو بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا اور سچی بات تو یہ ہے کہ حرص و طمع اور بخل کے تقاضوں پر عمل پیرا ہونے سے بچنے کی وجہ سے جو اجر و ثواب ملتا ہے وہ تو تبھی ملے گا جب انسان کے اندر یہ چیزیں ہوں گی، جیسے شہوت کے ناجائز تقاضوں سے بچنے کی وجہ سے انسان، اللہ تعالیٰ کا محبوب بنتا ہے اگر اس کے اندر سرے سے شہوت ہی نہ ہوتی تو وہ بچتا کیسے اور محبوبِ خدا کیسے بنتا؟ لیکن جب یہ حرص و طمع اور بخل حد سے تجاوز کر جاتا ہے اور انسان اس کا غلام بن کر حلال و حرام کو بھول جاتا ہے تو اس کے لئے تباہی کا دروازہ کھل جاتا ہے، مال کی محبت اور حرص اسے رشتوں کی پامالی اور قتل و قتال پر آمادہ کر دیتی ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ظلم سے بچو کیونکہ ظلم قیامت کے دن ظلمات (کئی اندھیرے) بن جائے گا اور حرص (شحّ) سے بچو کیونکہ شح نے تم سے پہلی قوموں کو تباہ کر دیا، حرص ہی نے ان کو اپنوں کا خون بہانے اور حرام کو حلال سمجھنے پر آمادہ کیا۔" (مسلم: ۲۵۷۸)

جب کسی شخص پر مال کی محبت غالب آجاتی ہے اور وہ حرص و طمع کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے تو پھر حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے لگتا ہے، نہ دین کی اشاعت پر خرچ کرتا ہے نہ کفر کے توڑ اور دفاع پر، نہ عزیز و اقارب پر خرچ کرتا ہے اور نہ ہی اہل و عیال پر، جس کی وجہ سے گھر کی زندگی تلخ ہو کر رہ جاتی ہے اور اشاعتِ خیر کا سلسلہ رک جاتا ہے، ظاہر ہے جب ایسا ہوگا تو ہلاکت اور تباہی یقینی ہے۔

نسائی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا: ”سات مہلک چیزوں سے بچ کر رہو، عرض کیا گیا یارسول ﷺ! وہ کون سی سات چیزیں ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک اور حرص وطمع (شح) اس جاندار کا ناحق قتل جس کے قتل کو اللہ نے حرام کیا ہے، سود خوری، یتیم کا مال کھانا، میدانِ جنگ سے پیٹھ پھیر جانا اور پاکدامن، سیدھی سادی، صاحبِ ایمان خواتین پر تہمت لگانا۔“

(نسائی : ۲۵۷)

ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”انسان میں سب سے بری بات کڑھانے والی حرص اور گھبرادینے والی نامردی ہے۔“ (ابو داؤد : ۲۵۱۱)

حریص اور لالچی انسان ہر وقت اسی غم میں کڑھتا رہتا ہے کہ فلاں کے پاس یہ ہے اور میرے پاس نہیں ہے، ایسا نہیں کہ وہ تہی دست اور بھوکا ننگا ہوتا ہے، بعض اوقات اس کی جیب بھری ہوتی ہے اور اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بھرمار ہوتی ہے مگر حرص کی بیماری اسے ہر وقت پریشان رکھتی ہے، وہ سب کچھ سمیٹ لینا چاہتا ہے اور جب ایسا نہیں کر پاتا تو پریشان ہو جاتا ہے اور اگر بالفرض وہ سب کچھ سمیٹنے میں کامیاب ہو بھی جائے تو بھی اسے قلبی اطمینان اور سکون نصیب نہیں ہوگا، اگر کسی مسلمان کو کڑھانے والی حرص میں مبتلا دیکھیں تو جان لیں کہ اسے ایمان کی حقیقت ارزانی نہیں ہوئی، اگر اسے ایمان کی حقیقت ملی ہوتی تو وہ مال کی خاطر اتنا پریشان نہ ہوتا، جبکہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ”شح (حرص وطمع) اور ایمان ایک بندے کے دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔“

(النسائي : ۱۳)

ایسے بخیل اور حریص کے حق میں فرشتے بھی بددعاء کرتے ہیں، بخاری اور مسلم میں روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہر صبح دو فرشتے اترتے ہیں ان میں سے

ایک (دعا کرتا ہے) اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کا بدل عطا فرما (دوسرا بددعاء کرتا ہے) اے اللہ! بخیل کے مال کو ہلاک فرما۔" (بخاري : ٤٢٢ ، مسلم : ١٠١٠)

ایک سچا مومن، حریص ہونے کی بجائے قناعت پسند اور بخیل کی بجائے صاحبِ ایثار ہوتا ہے، یہ قناعت اور ایثار معاشرے میں بھی محبت کے پھول کھلاتے ہیں اور اس کے دل کو بھی سکون واطمینان کی دولت سے مالا مال کرتے ہیں۔

شراب نوشی

وہ سوسائٹیاں اور ممالک جہاں شراب پانی کی طرح استعمال ہوتی ہے، وہاں کے ڈاکٹر، سائنسدان اور عام سماجی کارکن شراب نوشی اور اس کے بڑھتے ہوئے مہلک نتائج اور نقصانات پر پریشان ہیں، کثرت سے پیش آنے والے جنسی جبر کے واقعات اور ڈرائیونگ کے حادثات نے انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اگر وہ اسی نہج پر چلتے رہے تو ہولناک نتائج سے بچنا ممکن نہیں ہوگا، وہاں کے ڈاکٹر طویل تحقیقات کے بعد تسلیم کر رہے ہیں کہ شراب کے زیادہ استعمال سے معدہ کی جھلی متورم ہو جاتی ہے اور سوزش بڑھ جاتی ہے، جگر کے افعال میں کمزوری آ جاتی ہے، حرکتِ قلب میں اضافہ ہو جاتا ہے، خون کی نالیوں کا پھیلاؤ زیادہ ہو جاتا ہے، کبھی کبھی بول و براز اعصابی کنٹرول سے بے قابو ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے شرابی مستانے بعض اوقات شلوار اور پتلون ہی میں فارغ ہو جاتے ہیں، شراب نوشی کی وجہ سے پھیپھڑے اور زبان کا سرطان لاحق ہو جاتا ہے۔

یہ سارے نقصانات برسوں کی تحقیق کے بعد آج تسلیم کیے جا رہے ہیں، لیکن قرآن پاک نے شراب کی حرمت اور قطعی بندش کا اس وقت اعلان کیا جب نہ تو ڈاکٹروں کی جماعت نے اس کے نقصانات پر بحث کی تھی، نہ سائنسدانوں نے اس کے مہلک اجزاء کی تعیین کی تھی اور نہ سماجی کارکنوں نے بڑھتے ہوئے حوادث اور سانحات دیکھ کر اس پر پابندی لگانے کی آواز اٹھائی تھی بلکہ اس کے برعکس صورت یہ تھی کہ تقریباً پوری دنیا ہی شراب کی مستی میں ڈوبی ہوئی تھی، بالخصوص عربوں کی کوئی اہم محفل شراب نوشی سے خالی نہیں ہوتی تھی، انہیں بازار سے خریدنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی تھی، کیونکہ گھر گھر میں شراب تیار ہوتی تھی ان کی حالت یہ تھی کہ اگر کسی دشمن سے بدلہ لینے کا تہیہ کر لیتے تو یوں قسم اٹھاتے تھے: ”قسم ہے! میں

شراب کو اس وقت تک ہاتھ نہ لگاؤں گا جب تک دشمن سے انتقام نہ لے لوں۔"

شراب نوشی کے اس عمومی ماحول میں قرآن پاک نے بڑے حکیمانہ انداز میں ان کے دلوں میں شراب کی نفرت بٹھائی، ظاہر ہے کہ جو قوم نسلاً بعد نسلٍ اس لت میں مبتلا تھی، اسے یکا یک تو شراب سے منع نہیں کیا جا سکتا تھا، اسلام نے تدریج کا طریقہ اختیار کیا، شراب کے بارے میں جو آیت سب سے پہلے نازل ہوئی وہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۹ تھی، جس کا مفہوم ہے: "لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے ہیں، لیکن ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے زیادہ بڑا ہے۔"

اس آیت کے ذریعے ذہنوں کو شراب کی حرمت کا حکم سننے کے لیے تیار کر لیا گیا بلکہ بعض لوگوں نے تو یہ آیت سنتے ہی شراب نوشی سے توبہ کر لی تھی۔ اس کے بعد سورۂ نساء کی آیت ۴۳ نازل ہوئی، جس میں کہا گیا: "اے ایمان والو! نماز کے قریب اس حالت میں مت جاؤ کہ تم نشے میں ہو۔"

جب نشہ کی حالت میں نماز کے قریب جانے کی ممانعت کر دی گئی تو اب لوگوں نے دن میں تو شراب پینے کا سلسلہ بالکل موقوف کر دیا کیونکہ شراب پینے کے بعد نماز کے وقت ہوش میں آجانا مشکل تھا البتہ عشاء کے بعد اتنی سی مقدار اپی لیتے تھے کہ فجر ہونے سے پہلے نشہ ختم ہو جائے، اس آیت میں ضمناً گویا یہ بات بھی بتا دی گئی تھی کہ جو شخص نشے میں ہو وہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے اور مناجات کرنے کے قابل ہی نہیں۔

اس آیت کے نزول کے بعد اکثریت نے شراب سے توبہ کر لی اور جو چند ایک پی رہے تھے وہ بھی ذہنی طور پر بادہ گل گوں ترک کرنے کے لئے تیار ہو گئے، چنانچہ اب سورۂ مائدہ میں واضح طور پر اعلان کر دیا گیا "اے ایمان والو! شراب اور جوا اور پانسے یہ سب ناپاک

کام، شیطان کے اعمال میں سے ہیں سو ان سے بچتے رہنا تا کہ تم نجات پاؤ۔"

(سورة المائدة : ٩٠)

احادیث میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اطاعت کے اس قسم کے واقعات بھی ملتے ہیں کہ محفل عروج پر تھی، بادہ وساغر کا اہتمام تھا، جام لنڈھائے جانے والے تھے کہ اچانک منادی کی آواز کان میں پڑ گئی جو شراب کی قطعی حرمت کا اعلان کر رہا تھا، انہوں نے اعلان سنتے ہی ہاتھ کھینچ لیے، مٹکے توڑ دیے، مشکیزے بہادیے اور شراب نوشی سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی۔

قرآنی آیات کے علاوہ شراب کی حرمت ونجاست کے بارے میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بھی کثرت سے وارد ہیں اور ناممکن ہے کہ ایک حقیقی مسلمان ان احادیث کا مطالعہ کرے اور پھر بھی شراب نوشی پر اڑا رہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"اللہ لعنت کرتا ہے شراب پر، اس کے پینے والے، پلانے والے، بیچنے والے، خریدنے والے، بنانے والے، بنوانے والے، اٹھا کر لیجانے والے اور جس کیلئے لے جائی جائے ان سب پر۔" (اللہ کی لعنت ہوتی ہے) (ابو داوٗد : ٣٦٧٤ ، ابن ماجه : ٣٣٨٠)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے زنا کیا یا شراب پی تو اللہ تعالیٰ اس کا ایمان اس طرح چھین لیتا ہے جس طرح کسی سے اس کے کپڑے اتروا لیے جائیں۔" (مستدرك حاكم : ٢٢/١)

اس حدیث کا یا تو مطلب یہ ہے کہ جس وقت کوئی شخص زنا اور شراب نوشی میں مصروف ہوتا ہے اس وقت ایمان کا نور اس سے دور ہو جاتا ہے اور اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان گناہوں میں مسلسل مصروف رہنے کی وجہ سے بعید نہیں کہ وہ شخص ایمان ہی سے

محروم ہو جائے۔

ابتداء میں یوں ہوتا تھا کہ جب کسی شخص سے شراب نوشی کا جرم سرزد ہو جاتا تو جوتوں، چھڑیوں اور ہاتھوں سے اس کی پٹائی کی جاتی اور زبان سے اسے لعن طعن کی جاتی تھی، پھر اس کے بعد کے لئے باقاعدہ ایک سزا مقرر کردی گئی، اگر اس سزا کو عملی طور پر نافذ کر دیا جائے تو آج بھی شراب خانے بند ہو سکتے ہیں اور گناہوں کی اس ماں سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے جس کے بارے میں ایک مشہور ڈاکٹر کا قول ہے کہ اگر شراب نہ ہوتی تو دنیا کے نصف گناہ اور بیماریاں ہمیں معلوم تک نہ ہوتیں۔

ڈاکٹر تو طویل تحقیقات کے بعد اس کے طبی نقصانات معلوم کر پائے جبکہ ہمارے اُمّی آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے سینکڑوں سال قبل شراب کو بیماری قرار دیا تھا۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو شراب نوشی سے منع فرمایا تو انہوں نے عرض کیا کہ میں اسے دوا کے طور پر استعمال کرتا ہوں تو زبانِ نبوت نے فرمایا "وہ تو خود بیماری ہے دوا نہیں ہے۔" (مسلم : ۱۹۸٤)

شرک

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شرک کی دو قسمیں ہیں: اکبر اور اصغر، شرکِ اصغر ریا اور دکھاوے کو کہتے ہیں، شرکِ اکبر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا جائے اور اس سے ویسے ہی محبت کی جائے جیسے اللہ تعالیٰ سے محبت کی جاتی ہے۔

(نضرة النعيم : ١٠/٤٧١٠)

مشرکین جب دوزخ میں جائیں گے تو اسی قسم کے شرک کا اعتراف کریں گے، سورۂ شعراء میں ہے وہ کہیں گے: ''اللہ کی قسم! ہم کھلی ہوئی گمراہی میں تھے جب ہم تمہیں رب العالمین کے برابر ٹھہراتے تھے۔'' (الشعراء : ٩٧، ٩٨) حالانکہ یہ وہ لوگ تھے جو اللہ تعالیٰ کے خالق، مالک اور رب ہونے کا اقرار کرتے تھے اور یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ ان کے معبود نہ پیدا کر سکتے ہیں، نہ رزق دے سکتے ہیں، نہ زندگی اور موت دے سکتے ہیں، یہ برابری جو تھی وہ صرف محبت، تعظیم اور عبادت میں تھی۔

جیسا کہ دنیا بھر کے اکثر مشرکین کا یہی حال ہے کہ وہ اپنے معبودوں کی محبت اور تعظیم میں بے حد مبالغہ کرتے ہیں بعض اوقات یہ محبت اور تعظیم اللہ تعالیٰ کی محبت اور تعظیم سے بھی بڑھ جاتی ہے، وہ ایسے غالی ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر پر انہیں اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنی خوشی معبودانِ باطلہ کے ذکر پر ہوتی ہے، اگر ان کے معبودوں کی بے حرمتی کی جائے تو وہ بھوکے شیر کی طرح غضبناک ہو جاتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑا جائے اور حرمتوں کو پامال کیا جائے تو وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے بلکہ اگر انہیں حرمتوں کے پامال کرنے والے انسانوں سے کچھ ملنے ملانے کی امید ہو تو وہ کسی قسم کی خفگی کی بجائے خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔

ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جن کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم غیراللہ سے نہ تو اللہ تعالیٰ جیسی محبت کرتے ہیں اور نہ ہی ہم انہیں اللہ تعالیٰ کے برابر ٹھہراتے ہیں، لیکن ان کا عمل ان کے دعوے کی تردید کرتا ہے وہ ان کے سامنے رکوع وسجود کرتے ہیں، بیماریوں میں ان سے شفاء کے اور مصائب وآلام میں دستگیری کے امیدوار ہوتے ہیں، ان کی دوستی اور دشمنی کی بنیاد بھی یہی قرار پاتے ہیں، وہ ان سے رزق اور اولاد کے طلبگار ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے عقیدہ توحید پر کوئی اثر نہیں پڑتا، حالانکہ حقیقی موحد صرف وہ ہے جس کی محبت اور خوف، دعاء اور التجا، عبادت وانابت، توکل اور استعانت صرف اللہ تعالیٰ کیلئے ہو۔

قرآن کریم میں عقیدہ توحید پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ قرآن کریم کا کوئی ورق توحیدِ الٰہی کے دلائل اور شرک کی تردید سے خالی نہیں ہے، شرک وہ عظیم گناہ ہے کہ اگر بالفرض اللہ تعالیٰ کے کسی نبی سے بھی سرزد ہوجاتا تو اس کے سارے اعمال باطل ہوجاتے، ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کے کسی نبی سے شرک کا ارتکاب محالات میں سے ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے دوسرے انسانوں کو خبردار کرنے کے لئے تمام انبیاء بلکہ سید الانبیاء کی طرف بھی بذریعہ وحی یہ پیغام بھیجا جو سورۂ زمر کی آیت ۶۵ میں ہے: ”(اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کی طرف اور آپ سے پہلے نبیوں کی طرف وحی کی گئی تھی کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے اعمال ضائع ہوجائیں گے اور تم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوجاؤ گے۔“

شرک کرنے والے پر اللہ تعالیٰ جنت حرام کردیتا ہے اور اس کا ٹھکانہ دوزخ قرار پاتا ہے، حضرت مسیح علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: ”اے بنی اسرائیل! اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی ہے جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے گا اللہ اس پر جنت کو حرام کردے گا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا۔“

(سورۂ مائدہ : ۷۲)

صغیرہ اور کبیرہ جتنے بھی گناہ ہیں خواہ وہ شراب نوشی اور زناکاری ہی کیوں نہ ہوں، ان کی مغفرت کی کوئی صورت ہو سکتی ہے، لیکن گناہوں کی طویل فہرست میں شرک وہ واحد گناہ ہے جس کی مغفرت کی کوئی صورت نہیں، سورۂ نساء میں ہے ''اللہ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا جس گناہ کو چاہے گا بخش دے گا اور جس نے اللہ کے ساتھ شریک بنایا وہ راستے سے دور جا پڑا۔'' (النسآء : ٤٨)

حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کی دعوت کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس میں سب سے زیادہ زور توحید کے اثبات اور شرک کی تردید میں ہی ملتا ہے۔ تاریخِ عالم میں ایسے لوگ بہت کم گزرے ہیں جنہوں نے سرے سے وجودِ باری تعالیٰ ہی کا انکار کر دیا ہوا، البتہ ایسے لوگ کل بھی بے شمار تھے اور آج بھی ان کی کمی نہیں جن کا تصورِ الٰہ درست نہ ہو اور جو شرک کے مرتکب ہوئے ہیں، مشرکینِ مکہ ہی کو دیکھ لیجئے وہ اللہ تعالیٰ کے وجود سے تو انکار نہیں کرتے تھے بلکہ وہ وجودِ باری کا اقرار کرتے ہوئے دوسروں کو اس کا شریک ٹھہراتے تھے بلکہ ان کا دعویٰ تو یہ بھی تھا کہ ہم اصل میں تو صرف اللہ تعالیٰ کا قرب چاہتے ہیں اور بتوں کی عبادت صرف اسی لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیتے ہیں، اپنی حماقت کی بناء پر وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ اللہ کا قرب حاصل کرنے اور اس کی بارگاہ تک اپنی درخواست پہنچانے کے لئے کسی واسطے کی ضرورت نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو نہ صرف شرک سے بلکہ مشرکین سے بھی جدا رہنے کا حکم دیا ہے۔

نسائی میں حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیعتِ اسلام کی نیت سے حاضر ہوا۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! اپنا ہاتھ آگے بڑھائیے تاکہ میں بیعت کی سعادت حاصل کرلوں اور چونکہ آپ زیادہ جانتے ہیں اسلئے مجھے (مسلمان ہونے کے اعمال و) شرائط بھی بتائیے آپ نے فرمایا: میں

تم سے اس پر بیعت لیتا ہوں کہ تم اللہ کی عبادت کرو گے، نماز قائم کرو گے، زکوٰۃ ادا کرو گے، مسلمانوں کی خیر خواہی کرو گے اور مشرکوں سے جدا رہو گے۔'' (النسائي : ۱٤۸)

شرک کی مختلف صورتیں ہیں، جن میں سے بدترین صورت یہ ہے کہ ملائکہ، انبیاء، اولیاء یا کسی اور سے مافوق الاسباب اولاد، رزق، صحت، زندگی، عزت اور عہدہ کا سوال کیا جائے۔ شاید بعض قارئین اور قاریات کے لئے ''مافوق الاسباب'' کا لفظ نامانوس ہو اس لئے عرض کیا جارہا ہے کہ بیماری میں دوا لینا، بانجھ پن کا علاج کرانا، مجبوری میں قرض کا حصول، عہدہ و منصب کے لئے ظاہری اسباب کا اختیار کرنا یہ ساری صورتیں ماتحت الاسباب آتی ہیں جنہیں انسان اس عالمِ اسباب میں اختیار کرنے پر مجبور ہے جبکہ ظاہری اسباب کے بغیر کسی سے یہ سب کچھ مانگنا مافوق الاسباب کے زمرہ میں آتا ہے اور شرک ہے۔

اسی طرح غیر اللہ کے لئے جانور ذبح کرنا اور اس کے نام کی نذر ماننا، قسم اٹھانا، اس کے سامنے عبادت کے اعمال میں سے کسی عمل کا بجالانا (مثلاً رکوع وسجود کرنا) اس پر توکل اور اعتماد رکھنا، اس سے ویسے خوف کھانا اور ویسی ہی تعظیم کرنا جیسے خوف اور تعظیم کا اللہ تعالیٰ کے لئے حکم دیا گیا ہے۔ یہ ساری صورتیں شرک میں داخل ہیں، کس قدر دکھ کا مقام ہے کہ مسلمان، جسے دنیا میں توحید کا علم بلند کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا وہ بھی شرک کی نجاست سے آلودہ ہو چکا ہے، ہم سب کی بات نہیں کررہے مگر کبھی مزاروں اور آستانوں پر جھکنے، سجدہ کرنے، نذریں اور مرادیں مانگنے والوں کو دیکھئے، جبکہ ان کا دعویٰ ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور ایسے خواتین وحضرات کا تو شمار ہی نہیں جو شرک اصغر یعنی ریا اور دکھاوے میں مبتلا ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو ہر قسم کے شرک سے بچا رکھا ہے اسی لئے تو قرآن بھی کہتا ہے ''اور یہ اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے مگر اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔''

(سورۂ یوسف : ۱۰٦)

جھوٹی گواہی

جھوٹی گواہی بڑا گناہ ہے، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاں بتوں کی پرستش سے بچنے کا حکم دیا ہے وہیں جھوٹی گواہی سے بھی بچنے کا حکم دیا ہے۔ سورۃ الحج میں ہے: ''پس تم گندگی سے بچو جو کہ بت ہیں اور جھوٹی گواہی سے بچو۔''

امام ذہبی رحمہ اللہ جنہوں نے کبیرہ گناہوں کے بارے میں ''الکبائر'' کے نام سے کتاب لکھی ہے، جس میں کتاب وسنت کی روشنی میں کبائر کی قباحت اور عقل ونقل کے اعتبار سے ان کے مفاسد اور نقصانات بیان کیے ہیں، وہ ''شہادتِ زور'' یعنی جھوٹی گواہی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جھوٹی گواہی دینے والا شخص ایک وقت میں متعدد بڑے گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے:

١۔ وہ جھوٹ اور افتراء کا مرتکب ہوتا ہے۔

٢۔ وہ جس کے خلاف جھوٹی گواہی دیتا ہے اس پر ظلم کرتا ہے کہ اپنی گواہی کی بناء پر اسے مال، عزت یہاں تک کہ بعض اوقات جان سے بھی محروم کر دیتا ہے۔

٣۔ جس کے حق میں وہ جھوٹی گواہی دیتا ہے اس پر بھی وہ ظلم کرتا ہے کیونکہ اسے مال، زمین یا مکان وغیرہ جو کچھ عدالت کی طرف سے ملتا ہے وہ اسی جھوٹی گواہی کی بناء پر ملتا ہے اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث صادق آتی ہے جس میں آپ فرماتے ہیں کہ ''(جھوٹی گواہی کی وجہ سے) میں نے جس شخص کے لئے ناحق اس کے بھائی کے مال میں سے کچھ کا فیصلہ کر دیا اسے چاہئے کہ وہ خود ہی لینے سے انکار کر دے کیونکہ میں نے اس کے لئے آگ کے ایک ٹکڑے کا فیصلہ کیا ہے۔''

۴۔ جھوٹا گواہ ایسی چیز کو مباح کرنے کا جرم کرتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے۔

(الکبائر للذھبی : ٧٩)

ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جھوٹی گواہی کو بہت بڑا گناہ قرار دیا ہے اور اس کی قباحت بیان کرنے کے لئے آپ نے ایسا پیرایۂ بیان اختیار فرمایا جو دل میں اتر جانے والا اور انتہائی مؤثر ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا میں تمہیں کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑے کبیرہ کے بارے میں نہ بتاؤں؟ صحابہ نے عرض کیا ''یارسول اللہ! ضرور بتایئے، آپ نے فرمایا: ''اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا (یہ فرماتے ہوئے آپ ٹیک لگائے ہوئے تھے پھر آپ سیدھے ہوکر بیٹھ گئے اور آپ نے فرمایا) سن لو! اور جھوٹی گواہی دینا، آپ یہ الفاظ بار بار دہراتے رہے یہاں تک کہ ہم (آپ کی تکلیف کو دیکھتے ہوئے) سوچنے لگے کہ کاش آپ خاموش ہوجاتے۔'' (بخاري : ٢٦٥٤)

اندازہ کیجئے! کہ یوں تو آپ نے شرک اور والدین کی نافرمانی کو بھی کبیرہ گناہوں میں سے شمار کیا، مگر جس گناہ کی آپ نے سب سے زیادہ مذمت فرمائی وہ گناہ، جھوٹی گواہی تھا۔

بخاری اور مسلم میں ایک دوسری روایت بھی ہے، جس میں آپ نے اس گناہ کو شرک کے ساتھ ذکر فرمایا ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کبائر کے بارے میں سوال کیا گیا کہ کون کون سے ہیں تو آپ نے فرمایا: ''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، کسی جان کو ناحق قتل کرنا اور جھوٹی گواہی دینا۔'' (بخاري : ٢٦٥٣ ، مسلم : ٨٨)

جن لوگوں کو جھوٹی گواہی کی عادت پڑ جاتی ہے وہ صوم وصلوٰۃ کی بھی پرواہ نہیں کرتے، نماز روزے کا اہتمام بھی کرتے ہیں اور دوسرے گناہوں کے علاوہ جھوٹی گواہی کے بھی

مرتکب ہوتے رہتے ہیں، ایسے لوگوں کی عبادات بے جان ہوتی ہیں اگر وہ جاندار ہوتیں اور انہیں ساری شرائط اور آداب ملحوظ رکھتے ہوئے ادا کیا گیا ہوتا تو وہ یقیناً کذب واتہام سے باز آجاتے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں آپ نے فرمایا: ''جو شخص جھوٹی بات اور اس پر عمل کرنا نہیں چھوڑتا، اللہ کو اس کے کھانا پینا چھوڑنے (اور روزہ رکھنے) کی کوئی ضرورت نہیں۔'' (بخاری: ۱۹۰۳)

روزے کا مقصد تقویٰ ہے یعنی دل میں اللہ کا ایسا ڈر پیدا ہوجانا جس کی وجہ سے گناہ کو چھوڑنا آسان ہوجائے، روزوں کی وجہ سے گناہ چھوڑنے کی مشق ہوجاتی ہے، جو شخص محض اللہ کے ڈر سے اور اس کی رضا کے لئے صبح سے شام تک اپنے زورِ بازو سے کمائی ہوئی حلال روزی کے قریب نہیں جاتا اس سے امید کرنی چاہئے کہ وہ نہ دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالے گا، نہ ظلم کرے گا، نہ حرام کو حلال کرے گا اور نہ ہی جھوٹ بولے گا، جب وہ روزہ رکھنے کے ساتھ یہ سارے جرائم بھی کرتا جاتا ہے تو اس پر یہ مثال صادق آتی ہے کہ ''گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز کریں'' صرف بھوکا پیاسا رہنا تو کوئی کمال نہیں، جب کہ گناہوں سے بچنے کا کوئی اہتمام ہی نہ ہو، نہ زبان کی حفاظت، نہ نگاہوں کی، نہ پیٹ کی اور نہ زبان کی۔

یہاں ایک اور حدیث سن لیجئے! جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دقتِ نظر کا بھی اندازہ ہوتا ہے، آپ نے دیکھا یا سنا ہوگا کہ بعض خواتین اپنی سوکن یا پڑوسن کو جلانے اور پریشان کرنے کے لئے جھوٹ موٹ کہہ دیتی ہیں کہ مجھے میرے شوہر نے اتنے زیور، جوڑے یا سامان لاکر دیا ہے، حالانکہ اس نے کچھ بھی نہیں دیا ہوتا یا جتنا وہ بتارہی ہے اس سے کم دیا ہوتا ہے مگر اسے تو اپنی برتری ثابت کرنی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ جھوٹ بولنے سے بھی دریغ نہیں کرتی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کو ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے۔

بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک عورت نے عرض کیا یارسول اللہ! میں (لوگوں سے کہتی ہوں کہ) مجھے میرے شوہر نے فلاں سامان دیا ہے حالانکہ اس نے نہیں دیا ہوتا؟ (تو اس کا کیا حکم ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جسے ایک چیز نہ دی گئی ہو وہ اگر ظاہر کرے کہ مجھے دی گئی ہے تو وہ ایسے ہوگا جیسے جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والا۔ (بخاری: ٥٢١٩) جھوٹ کا لباس پہننے والے سے مراد وہ شخص ہوسکتا ہے جو اپنے آپ کو نیک ظاہر کرے حالانکہ وہ نیک نہ ہو۔

ایک طرف ان احادیث کا مطالعہ کیجئے! دوسری طرف اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا جائزہ لیجئے، ہماری زندگی کا کون سا شعبہ ہے جو جھوٹ سے بچا ہوا ہے بالخصوص ہماری عدالتوں میں روزانہ نہ معلوم کتنی جھوٹی گواہیاں دی جاتی ہیں، کتنوں کی عزت برباد ہوتی ہے، کتنوں کو ان کے مال و متاع سے محروم کیا جاتا اور کتنوں کا ناحق خون بہایا جاتا ہے۔

جلد بازی

اہلِ عرب عجلت اور جلد بازی کو ''ام الندامات'' (ندامتوں کی ماں) کہا کرتے ہیں اور یہ واقعی حقیقت ہے کہ جلد باز کو ہمیشہ شرمندہ ہونا پڑتا ہے، سوچے سمجھے بغیر کہی ہوئی بات اور عجلت میں کیا گیا فیصلہ بسا اوقات اس کے گلے پڑ جاتا ہے، پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسے اپنا ہی تھوکا ہوا چاٹنا پڑتا ہے یا چھوٹوں اور بڑوں سب کے سامنے شرمندہ ہونا پڑتا ہے، مردوں کے مقابلے میں خواتین میں عجلت پسندی زیادہ پائی جاتی ہے، ان کی محبت اور نفرت، وصل اور فراق، خرید وفروخت، ہر چیز میں جلد بازی کا عنصر پایا جاتا ہے، سوائے ان خواتین کے جنہیں اللہ تعالیٰ نے علم اور حلم جیسی صفات سے نوازا ہے، اس لئے اسلام نے طلاق کا اختیار عورت کو نہیں دیا، اگر ایسا ہوتا تو یورپ کے غیر مسلموں کی طرح مسلمانوں میں بھی طلاق کی شرح بہت زیادہ ہوتی۔

امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے بڑے جامع اور خوبصورت الفاظ میں جلد باز کا تعارف کرایا ہے، فرماتے ہیں: ''وہ جاننے سے پہلے بول پڑتا ہے، سمجھنے سے پہلے جواب دیتا ہے، کسی کو آزمانے سے پہلے اس کی قصیدہ خوانی کرنے لگتا ہے، تعریف کرنے کے بعد مذمت شروع کر دیتا ہے، سوچنے سے پہلے کسی کام کا عزم کر لیتا ہے اور عزم سے قبل کر گزرتا ہے، عجلت کے ساتھ ندامت لازم ہے اور سلامتی اس سے جدا ہی رہتی ہے۔''

(روضة العقلاء: ٢٨٨)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''حلم اور بردباری اللہ کی طرف سے ہے اور عجلت شیطان کی طرف سے ہے، اللہ سے زیادہ معذرت قبول کرنے والا کوئی نہیں اور اپنی حمد وثنا سے زیادہ اسے کوئی چیز محبوب نہیں۔'' (الترغيب والترهيب: ٤١٨/٣)

اللہ تعالیٰ کے توقف اور حلم و بردباری کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ باوجود قدرتِ تامّہ کے اس نے زمین وآسمان کو چھ دنوں میں یا چھ مرحلوں میں پیدا فرمایا حالانکہ وہ چشم زدن میں انہیں عدم سے وجود میں لاسکتا تھا، پھر یہ بھی دیکھئے کہ مختلف قوموں کے تمرد اور عناد، سرکشی اور بغاوت اور فسق و فجور کے باوجود وہ یکا یک عذاب نازل نہیں کرتا بلکہ ڈھیل پر ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے، جب انسان عدوان اور طغیان کی آخری حد پر پہنچ جاتا ہے اور کوئی تفہیم اس پر اثر نہیں کرتی تب رب تعالیٰ کے عذاب کا کوڑا حرکت میں آتا ہے، یہی صفت اللہ کے نبیوں میں بھی پائی جاتی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سال تک تبلیغ کی، جب قوم کسی طرح بھی سمجھنے پر آمادہ نہ ہوئی اور آپ نے محسوس کیا کہ اب ہدایت ان کے مقدر میں نہیں اور ان کے کینسر زدہ دل بالکل گل سڑ چکے ہیں تب آپ نے ان کی غرقابی کی دعاء کی۔ اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کیجئے! آپ کے مزاج میں کتنا صبر، کتنا ٹھہراؤ اور کتنا حلم و وقار تھا، طائف والوں نے سنگباری سے جسم لہولہان کردیا، عذاب کے فرشتے تعمیلِ ارشاد کے لئے آموجود ہوئے مگر آپ نے زخمی ہاتھ اٹھائے اور فرمایا تو بقول جالندھری مرحوم یہ فرمایا ہے ؎

الٰہی رحم فرما کہسارِ طائف کے مکینوں پر
الٰہی پھول برسا پتھروں والی زمینوں پر

حلم اور وقار کسی بھی انسان کے لئے باعثِ زینت ہوتا ہے اور عجلت اس کی حماقت کی نشانی ہوتی ہے۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''لوگو! جان لو کہ حلم زینت ہے، وفا مروت ہے، عجلت حماقت ہے، سفر کمزوری ہے، کمینوں کے ساتھ نشست و برخاست بدنامی کا سبب ہے اور فاسقوں کے ساتھ میل جول رکھنا شکوک و شبہات پیدا ہونے کا باعث ہے۔'' (کنز العمال: ۱٦/۲٦۹)

حضرت ابن حبان رحمہ اللہ کا قول ہے کہ کوئی شخص ریاست وقیادت کا اس وقت مستحق ہوتا ہے جب اس کے اندر تین چیزیں پائی جائیں یعنی علم، عقل اور قوتِ گویائی، اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ چھ کمزوریوں سے اپنے آپ کو بچا کر رکھے یعنی تیزی، عجلت، حسد، نفس پرستی، جھوٹ اور ترکِ مشورہ سے۔ (كنز العمال : ٣٦١)

سورۂ اسراء کی آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جلد بازی انسان کی فطری کمزوری ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان اپنی اس کمزوری پر قابو پانے کی کوشش ہی نہ کرے، جیسے مال کی محبت، بخل، حرص اور شہوت بھی انسان کی فطرت میں پائی جاتی ہے، مگر کامیابی اسی کو ملے گی جو ان کمزوریوں کو شریعت کی لگام پہنا دے گا، لیکن جس انسان کے لئے یہ صفات خود لگام اور پیروں کی زنجیر بن گئیں وہ نجات کا ہرگز مستحق نہیں ہوسکتا۔

عجلت اگر اللہ کی رضا کے لئے ہو تو محبوب ہے، سیدنا موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو پیچھے چھوڑتے ہوئے نہایت عجلت میں طور پر پہنچ گئے تھے، اللہ نے سوال کیا: ”اے موسیٰ! تم نے اپنی قوم سے (آگے چلنے میں) جلدی کیوں کی؟“ انہوں نے عرض کیا: ”کہ وہ میرے پیچھے آرہے ہیں اور اے میرے پروردگار! میں نے تیری طرف آنے میں جلدی اس لئے کی کہ تو خوش ہوجائے۔“ (سورۂ طٰهٰ : ٨٣، ٨٤)

ثابت ہوا کہ اگر عجلت، اللہ کی رضا کے لئے ہو تو پسندیدہ ہے اور اگر اس کی ناراضی کے کاموں میں ہو یا بلا سوچے سمجھے کوئی کام کرنے کے سلسلے میں ہو تو ناپسندیدہ ہے۔

قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر عجلت پسند واقع ہوئے تھے، ان کے کفر وشرک کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں مہلت دے رکھی تھی مگر وہ انبیاء کرام کو غصہ دلانے یا ان کی کمزوری ثابت کرنے کے لئے ان سے جلد عذاب دکھانے کا مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ سورۂ حج میں ہے ”اور یہ آپ سے جلد عذاب لانے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اللہ اپنے

وعدے کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرے گا۔'' (الحج : ٤٧)

عجلت کے بارے میں چند احادیث کا بھی مطالعہ کیجئے! ان کے مطالعہ سے آپ اس موضوع کو مزید وسعتِ نظر کے ساتھ سمجھ سکیں گی:

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کی عیادت فرمائی جو بیماری کی وجہ سے چوزے جیسا ہو گیا تھا آپ نے اس سے دریافت فرمایا: ''کیا تم نے کوئی دعاء تو نہیں مانگی تھی یا کسی چیز کا سوال تو نہیں کیا تھا؟'' اس نے عرض کیا کہ ہاں میں اللہ سے دعاء کیا کرتا تھا کہ اے اللہ! تو نے مجھے جو سزا آخرت میں دینی ہے وہ جلدی سے دنیا ہی میں دے دے۔ آپ نے فرمایا سبحان اللہ! تم اس کے برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تم نے یوں کیوں نہ کہا ''اے اللہ! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا'' پھر آپ نے اس کے لئے دعاء فرمائی اور اللہ نے اسے شفا عطا فرما دی۔

(صحيح مسلم : ٢٦٨٨)

☆ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کسی کی بھی دعاء تب قبول ہوتی ہے جب کہ وہ جلد بازی نہ کرے (جلد بازی یہ ہے کہ) وہ کہتا ہے میں نے دعاء کی مگر میری دعاء قبول نہ ہوئی۔ (بخاری : ٦٣٤٠ ، مسلم : ٢٧٣٥) (چنانچہ اس نے دعاء کرنا ہی چھوڑ دی) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر چیز میں توقف کرنا چاہئے سوائے آخرت کے عمل کے۔'' (کہ آخرت بنانے والا عمل جلدی کر لینا چاہئے) (ابو داؤد : ٤٨١٠)

لالچ

قرآن کریم کی متعدد آیات میں لالچ کرنے اور دوسروں کے مال ومتاع پر نظر رکھنے سے منع کیا گیا ہے اور جن لوگوں کے اندر یہ بری صفت پائی جاتی ہے ان کی مذمت کی گئی ہے نمونہ کے طور پر چند آیات کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

۱ ...... سورۂ نساء میں ہے: ''اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر جو فضیلت عطا کی ہے تم اس کی تمنا نہ کرو۔'' (سورۃ النسآء: ۳۲)

۲ ...... سورۂ طٰہٰ میں ہے: ''اور دنیا کی زندگی کی آرائش میں سے ہم نے ان میں سے بعض کو آزمانے کے لئے جو طرح طرح کے فوائد دیئے ہیں تم ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھو۔'' (سورۃ طٰہٰ)

۳ ...... سورۂ فجر میں ہے: ''اور تم مردے کا مال سمیٹ سمیٹ کر کھاتے ہو اور مال سے بڑی محبت رکھتے ہو۔'' (سورۃ الفجر: ۱۹، ۲۰)

۴ ...... سورۂ تکاثر میں ہے: ''زیادہ کی حرص نے تمہیں غافل کر دیا یہاں تک کہ تم قبرستان میں جا پہنچے۔'' (سورۃ التکاثر: ۱، ۲)

لالچ ایک باطنی بیماری ہے جسے لگ جائے وہ خود اپنی نظروں میں بھی ذلیل ہو جاتا ہے اور عام انسان بھی اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، ایسا شخص سب کچھ ہوتے ہوئے بھی فقیر ہی رہتا ہے، اس کے ساتھ فقر لازم ہو جاتا ہے، اسے کبھی سکون نصیب نہیں ہوتا، وہ ہر وقت پریشان رہتا ہے، مزید کی طلب اس سے دن کا سکون اور رات کی نیند چھین لیتی ہے۔

انسان کا لالچی ہونا قلتِ ایمان کی دلیل ہے گویا اسے اللہ کے خزانوں اور اس کی عطا پر یقین نہیں ہے، وہ اسے نہیں دیکھتا جو اللہ نے عطا کیا ہوتا ہے اور نہ ہی اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا

ہے وہ تو بس دوسروں کے مال ومتاع پر نظر رکھتا ہے اور اسے اپنے قابو اور تصرف میں لانے کی تدبیریں سوچتا رہتا ہے، اس کی حرکتیں احمقوں جیسی ہوتی ہیں، لالچ کا مرض اسے عقل سے پیدل کر دیتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ''انسان کو عقل سے محروم کرنے میں شراب بھی لالچ کے مقابلے میں کچھ نہیں۔'' (المستطرف : ۹۸)

ظاہر ہے شراب کا نشہ تو بہر حال چند گھنٹوں میں اتر ہی جاتا ہے اور عقل کام کرنے لگتی ہے لیکن لالچ کا نشہ انسان پر زندگی بھر مسلط رہتا ہے اور اسے حماقت کے دائرے سے باہر نہیں نکلنے دیتا جیسے لالچ، اصحابِ عقل کو عقل سے محروم کر دیتا ہے یونہی لالچ، اہلِ علم کو علم سے بھی محروم کر دیتا ہے۔

ایک دفعہ حضرت کعب نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہما سے سوال کیا کہ اہلِ علم کون ہوتے ہیں؟ فرمایا وہ جو علم پر عمل کریں، انہوں نے دوسرا سوال کیا کہ وہ کون سے اسباب ہیں جن کی وجہ سے علماء کے دلوں سے علم جاتا رہا؟ فرمایا ''لالچ، حرص اور لوگوں کے سامنے اپنی حاجات پیش کرنے سے۔'' (المستطرف : ۹۸)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو بڑی محبت اور حکمت سے لالچ سے بچنے کی تلقین فرماتے تھے، آپ کی مبارک زبان سے نکلی ہوئی بات دل میں اتر جاتی تھی اور آپ کے جانثار زندگی بھر اس پر عمل پیرا رہتے تھے، صحیح بخاری میں حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی چیز کا سوال کیا، آپ نے مجھے وہ چیز عطا فرمادی، دوبارہ سوال کیا آپ نے پھر میری حاجت پوری فرمادی، میں نے سہ بارہ سوال کیا تو آپ نے فرمایا: ''اے حکیم! یہ مال بڑا سرسبز اور شیریں ہے، اگر کسی کو استغناء کے ساتھ ملے تو اس میں برکت دی جاتی ہے اور اگر لالچ اور حرص سے حاصل ہو تو

اس میں برکت نہیں دی جاتی، اس شخص کی طرح جو کھاتا ہے مگر سیر نہیں ہوتا، اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔''

حضرت حکیم کہتے ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے میں آپ کے بعد (سوال کرکے) کسی کے مال میں بھی کمی نہیں کروں گا یہاں تک کہ میں دنیا سے جدا ہو جاؤں (چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کچھ دینے کے لئے حضرت حکیم کو بلایا لیکن انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (اپنے دورِ خلافت میں) اسی مقصد کے لئے بلایا مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے مسلمانوں کی جماعت! میں تمہیں حکیم پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اسے مالِ فئی میں اس کا حق دینے کی کوشش کی مگر اس نے وصول کرنے سے انکار کر دیا، چنانچہ (اپنے وعدے کے مطابق) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اپنی وفات تک واقعی کسی کے مال میں کوئی کمی نہ کی۔ (البخاري: ١٤٧٢، مسلم: ١٠٣٥)

یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کراماتی زندگی تھی کہ وہ جب کسی چیز کا عزم کر لیتے یا کسی کام کے کرنے کا عہد کر لیتے تو اسے نبھاتے تھے ورنہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص ان باطنی امراض سے دوچار ہو جاتا ہے اس کے لئے ان سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے بلکہ ہر آنے والا دن اس کے مرض میں اضافے کا سبب بن جاتا ہے، یہاں تک کہ بڑھاپے میں اس کے مرض پر شباب آ جاتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انسان بوڑھا ہو جاتا ہے مگر دو چیزیں جوان ہو جاتی ہیں: ایک مال کی حرص اور دوسری عمر کی حرص۔'' (البخاري: ٦٤٢١، مسلم: ١٠٤٧)

ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا: دو حریص کبھی سیر نہیں ہوتے: ایک علم کا

حریص اور دوسرا مال کا حریص۔ (مستدرك حاكم : ١/٩٢)

لالچ کا تعلق امیری اور غریبی سے نہیں یعنی ضروری نہیں کہ غریب شخص لالچی ہو اور امیر لالچی نہ ہو بلکہ یہ تو ایک نفسیاتی بیماری ہے کسی کو بھی لاحق ہو سکتی ہے، بعض اللہ کے بندے تہی دست ہوتے ہیں لیکن ان کے دل قناعت اور غنا سے بھرے ہوتے ہیں وہ ہر حال میں اللہ کی تقدیر اور فیصلے پر راضی رہتے ہیں جبکہ دوسری طرف بعض لالچی لوگ دولت کے انبار پر بیٹھے ہوتے ہیں لیکن زیادتی کی ہوس اور کثرت کی طلب انہیں پریشان کر رہی ہوتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر ابن آدم کے پاس مال سے بھری ہوئی ایک وادی بھی ہو تو بھی وہ یہ تمنا کرتا ہے کہ اے کاش! ایک اور وادی مجھے مل جائے، ابن آدم کی آنکھ کو (قبر کی) مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی اور اللہ توبہ کرنے والے کی توبہ قبول کرتا ہے۔

(صحيح بخاری : ٦٤٣٧ ، مسلم : ١٠٤٩)

آخر میں گویا یہ بتا دیا کہ اگر کوئی شخص عزم کر لے اور سچے دل سے توبہ کر لے تو اللہ اسے ظاہری اور باطنی گناہوں سے پاک فرما دیتا ہے۔

لمبی اُمیدیں

قرآن کریم میں یہود کی جو بیماریاں ذکر کی گئی ہیں ان میں سے ایک بیماری ''لمبی امیدیں'' بھی ہے، انہوں نے ایسے منصوبے بنا رکھے تھے اور اتنی لمبی امیدیں قائم کر رکھی تھیں کہ یہ منصوبے اور امیدیں مختصر سی زندگی میں پورے ہوتے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ وہ طویل زندگی کی آرزو اپنے دلوں میں بسائے ہوئے تھے، اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ موت کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دیتے اور دنیا سے کبھی بھی جدا نہ ہوتے۔

سورۂ بقرہ میں ہے: ''تم ان (یہود) کو انسانوں میں سب سے زیادہ زندگی کا حریص پاؤ گے یہاں تک کہ مشرکوں سے بھی زیادہ۔ ان میں سے ہر ایک یہ آرزو رکھتا ہے کہ اے کاش! اسے ہزار سالہ زندگی دے دی جائے مگر لمبی زندگی کا دیا جانا اسے عذاب سے نہیں چھڑا سکتا اور جو کام یہ کرتے ہیں اللہ انہیں دیکھ رہا ہے۔'' (البقرة : ٩٦)

قرآن نے یہود کے نہاں خانۂ دل میں چھپی ہوئی جس تمنا کی نشاندہی کی تھی میڈیکل کی دنیا میں کی جانے والی جدید تحقیقات بھی اس کی تائید کرتی ہیں کیونکہ زندگی کو طول دینے کے لئے جو سائنسی تجربات کئے جا رہے ہیں اور جو دوائیں ایجاد کی جا رہی ہیں ان میں یہودی ڈاکٹر پیش پیش ہیں، لیکن اب یہ بیماری صرف یہودیوں تک محدود نہیں رہی بلکہ پوری دنیا یہاں تک کہ مسلمان بھی اس کی لپیٹ میں آچکے ہیں۔

امام غزالی رحمہ اللہ جنہیں باطنی امراض کی تشخیص، ان کے اسباب اور علاج بیان کرنے میں تخصص اور اسپیشلسٹ کا درجہ حاصل تھا، انہوں نے طولِ امل یعنی لمبی امیدیں قائم کرنے کے دو سبب بیان فرمائے ہیں: جہالت اور دنیا کی محبت، جس انسان کے قلب و دماغ پر دنیا کی شہوات ولذات کی محبت چھا جاتی ہے اس پر دنیا کی جدائی کا تصور بھی گراں گزرتا ہے۔

اول تو وہ موت کے بارے میں سوچتا ہی نہیں تاکہ اس کی لذتیں مکدر نہ ہوں اور اگر کبھی اسے موت کا خیال آ ہی جائے تو وہ اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کرتا ہے کہ ابھی تو جوانی ہے، بڑھاپا آئے گا تو دیکھا جائے گا، جب بال سفید ہونے لگ جائیں تو بھی وہ موت کی تیاری کو ٹالتا رہتا ہے اور اپنے آپ کو بوڑھا تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا پھر جب کمر جھک جائے، بینائی اور شنوائی میں ضعف آ جائے تو اپنے زیرِ تکمیل منصوبوں پر نظر ڈالتا ہے تو سوچتا ہے کہ فلاں عمارت اور فلاں فیکٹری مکمل ہو جائے، فلاں عہدے تک رسائی حاصل کرلوں، شہرت و ناموری کے فلاں سنگِ میل کو عبور کرلوں، فلاں دشمن سے انتقام لے لوں تو پھر ہمہ تن فکرِ آخرت میں لگ جاؤں گا لیکن ایک عمارت کے بعد دوسری اور ایک سنگِ میل کے بعد دوسرا اس کے سامنے آ جاتا ہے اور وہ اسے عبور کرنے میں لگا رہتا ہے یہاں تک کہ زندگی کا سفر تمام ہو جاتا ہے اور اسے ہمیشہ کی زندگی کے لئے تیاری کا موقع ہاتھ نہیں آتا۔ ان منصوبوں اور آرزوؤں کا اصل سبب ''حبِ دنیا'' ہے۔

اسی طرح جہالت بھی ''لمبی امیدیں'' قائم کرنے کا سبب بنتی ہے کیونکہ جہالت اور حماقت کی وجہ سے انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ مجھے جوانی میں موت نہیں آئے گی حالانکہ وہ دن رات بچوں اور جوانوں کے جنازے اٹھاتا ہے مگر اپنے بارے میں وہ دھوکے کا شکار رہتا ہے اور یہ موٹی سی حقیقت اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ موت کا کوئی مخصوص وقت نہیں وہ نہ جوانی کو دیکھتی ہے نہ بڑھاپے کو، نہ دن کو نہ رات کو، نہ بہار کو نہ خزاں کو، نہ امیری کو نہ غریبی کو نہ صحت کو نہ بیماری کو، وہ تو اچانک آ جاتی ہے اور جب وہ آ جائے تو ٹلائے نہیں ٹلتی۔

(نضرة النعيم : ١٠/٤٨٥٨)

طولِ امل کا علاج یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسروں پر قیاس کرے اور یہ یقین رکھے کہ اس کا جنازہ اٹھایا جانا اور اسے قبر میں دفن کیا جانا ضروری ہے، ہوسکتا ہے اس کا کفن

فروخت ہونے کے لئے دکان پر آچکا ہو، ممکن ہے اس کی لحد کی اینٹیں تیار ہوچکی ہوں، وہ نئے نئے منصوبے بنانے میں لگا رہے گا اور موت آکر اس سے مہلتِ عمل چھین لے گی۔

(نظرة النعيم : ٤٨٥٩/١٠)

حضرت جابر بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین لکڑیاں لیں، ان میں سے ایک لکڑی اپنے پہلو میں گاڑی، پھر تھوڑا سا چل کر دوسری لکڑی گاڑ دی اور چند قدم کے فاصلے پر تیسری لکڑی بھی گاڑ دی پھر حاضرین سے دریافت فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ یہ کیا ہے؟ (پھر خود ہی جواب دیا) یہ ابن آدم، اس کی موت اور امیدوں کی مثال ہے، اس کا نفس اسے امیدوں کا شوق دلاتا ہے لیکن اس کی موت، امیدوں کے پورا ہونے سے پہلے ہی اس کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

(اخرجه ابن المبارك في الزهد : ٩٦)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: ''دنیا میں یوں رہو گویا تم مسافر ہو یا راستے سے گزرنے والے'' اور حضرت ابن عمر فرمایا کرتے تھے کہ ''جب شام ہو جائے تو صبح کا انتظار نہ کرو، جب صبح ہو جائے تو شام کا انتظار نہ کرو اور اپنی صحت میں بیماری کے لئے اور اپنی زندگی میں موت کے لئے تیاری رکھو۔'' (البخاري : ٦٤١٦)

مقصد یہ ہے کہ مسلمان کو ہر وقت موت کے لئے تیار رہنا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ اس کے دل پر دنیا کی محبت اتنی چھا جائے اور وہ ایسی لمبی امیدیں اور ایسے طویل منصوبے بنالے جو اسے آخرت سے بے خبر کر دیں اور وہ اول و آخر دنیا ہی کا ہو کر رہ جائے، اسے چاہئے کہ وہ صحت اور زندگی کو غنیمت جانے اور انہیں آخرت کی تیاری اور رضاءِ الٰہی کے حصول میں لگائے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو! جوانی کو بڑھاپے سے پہلے، صحت کو بیماری سے پہلے، غنیٰ کو فقر سے پہلے، فراغت کو مشغولیت سے پہلے اور موت کو زندگی سے پہلے۔'' (مستدرك حاكم : ٣٠٦/٤)

ممکن ہے آج جوانی، صحت، فراغت اور غنیٰ میں ہمیں جن اعمال کی طاقت ہے کل ان اعمال کی طاقت باقی نہ رہے۔ مسلمان کی نظر میں اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے، دنیا کی زندگی حقیقی زندگی کی تیاری کے لئے ایک مہلت ہے لیکن جب وہ طولِ امل کی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے تو آخرت کو بھول جاتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''میں تمہارے بارے میں جن چیزوں کا اندیشہ رکھتا ہوں ان میں سب سے زیادہ خوف خواہشات کی اتباع اور طولِ امل (لمبی امیدیں قائم کرنے) کا ہے۔ خواہشات کی اتباع حق سے روک دیتی ہے اور طولِ امل اسے آخرت سے غافل کر دیتا ہے۔ سن لو! یہ دنیا بالآخر پیٹھ موڑ کر چلی ہی جائے گی۔ (صحيح بخاري : ٦٤٢١)

ظلم

بعض اہلِ علم نے ظلم کی تین قسمیں بیان کی ہیں:

پہلی قسم یہ ہے کہ انسان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ظلم ہو، اور اس میں سب سے بڑا ظلم کفر و شرک اور نفاق ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔'' (سورهٔ لقمان : ۱۳)

دوسری قسم یہ ہے کہ خود انسانوں کے درمیان ظلم ہو، سورۂ شوریٰ میں ہے: ''الزام صرف ان لوگوں پر ہے جو انسانوں پر ظلم کرتے ہیں۔'' (سورهٔ شوریٰ : ٤٢)

تیسری قسم یہ ہے کہ انسان خود اپنے اوپر ظلم کرے سورۂ فاطر میں ہے: ''ان میں سے بعض اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں۔'' (سورهٔ فاطر : ۳۲)

انجام اور حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ تینوں قسمیں اپنے اوپر ظلم کرنے ہی کی ہیں کیونکہ ان کا نقصان خود انسان ہی کو ہوتا ہے خواہ وہ کفر و شرک کرے یا فسق و فجور اور منافقت، کسی کا حق دبائے یا ہاتھ اور زبان سے کسی کو تکلیف دے، خودکشی کرے یا اپنے جسم و جان کو ناروا تکلیف میں ڈالے، بہر صورت دنیا اور آخرت میں ان حرکتوں کا خمیازہ خود اسی کو بھگتنا پڑے گا۔ (نظرة النعيم : ١٠/٤٨٧٣)

سورۂ یونس میں ہے: ''بے شک اللہ انسانوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا لیکن انسان ہی اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔'' (سورهٔ يونس : ٤٤)

سورۂ توبہ میں بعض ظالم اور نافرمان قوموں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا: ''پس اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں تھا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے۔''

(سورهٔ التوبة : ٧٠)

قرآن کریم میں اگرچہ ظلم کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے لیکن روزمرہ زبان میں جب ظلم کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ ظلم ہوتا ہے جو بندے بندوں پر کرتے ہیں، انسان چونکہ اپنی فطرت کے اعتبار سے ''ظلوم اور جہول'' ہے، اس لئے ہر شخص کے اندر ظلم اور جہالت کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور پایا جاتا ہے، البتہ جس شخص کے ساتھ اللہ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے علمِ نافع عطا فرمادیتا ہے اور اس کے دل میں رشد وہدایت القاء کردیتا ہے اور جب وہ علم پر عمل کرتا ہے تو ظلم سے بھی بچ کر رہتا ہے اور جس شخص کے ساتھ اللہ بھلائی کا ارادہ نہ کرے اسے اول تو علمِ نافع حاصل نہیں ہوتا اور اگر وہ حروف خوانی اور کتاب فہمی کی حد تک علم حاصل کر بھی لے تو اسے عمل کی توفیق نہیں ہوتی، اگر اسے علم حاصل نہ ہو تو وہ جہل میں مبتلا رہتا ہے اور اگر توفیقِ عمل نہ ہو تو وہ ظلم کا مرتکب ہوتا ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ کے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہر خیر کی اصل علم اور عدل ہے اور ہر شر کی اصل جہل اور ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عدل کی حدود مقرر کی ہیں، جو شخص ان حدود سے تجاوز کرے گا وہ ظالم شمار ہوگا اور وہ ان تمام وعیدوں کا مستحق ہوگا جو کتاب وسنت میں ظالموں کے لئے مذکور ہیں، (تلخیص از اغاثة اللّهفان : ۲/۱۳۶، ۱۳۷) قرآن کریم کو دیکھیں تو وہ ظلم اور ظالموں کی مذمت سے بھرا پڑا ہے، کہیں فرمایا گیا: ''بے شک اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔'' (سورۂ مائدة : ۵۱) کہیں فرمایا گیا: ''اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔'' (سورۂ آل عمران : ۱٤۰) کہیں فرمایا گیا: ''ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔'' (سورۂ فاطر : ۳۷) انسانیت کو ظلم کے تباہ کن اثرات سے بچانے کے لئے قرآن نے مسلمانوں کو ایک بنیادی ہدایت یہ دی ہے کہ ''نیکی اور تقویٰ کے کاموں پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور تعدی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو۔'' (سورۂ مائدة : ۲)

جدید دنیا میں نان کو اپریشن کو مظالم کی روک تھام کے لئے ایک مؤثر حربہ قرار دیا جارہا

ہے لیکن قرآن نے یہ نظریہ صدیوں پہلے پیش کیا تھا اور ایک ایسی امت اور جماعت بھی کھڑی کردی تھی جس نے معاشرتی، سیاسی، فوجی اور معاشی میدانوں میں اس نظریہ پر عمل کر کے دکھایا، وہ خیر کے کاموں میں ایک دوسرے کے دست وباز وثابت ہوتے تھے اور ظلم وتعدی میں تعاون نہیں کرتے تھے، اس عدمِ تعاون کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں جہاں وہ اصحابِ خیر پہنچے وہاں سے ظلم وستم کا خاتمہ ہوگیا، وہ نہ صرف یہ کہ ظلم میں تعاون نہیں کرتے تھے بلکہ ظالم کا ہاتھ روکنے اور اس کا پنجہ مروڑنے میں بھی اپنی تمام صلاحیتیں صرف کردیتے تھے، اس لئے کہ انہیں اسی چیز کی تعلیم دی گئی تھی، صحیح بخاری میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو فرمایا: ''تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، صحابہ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جاسکتی ہے مگر ظالم کی مدد کیونکر کی جائے، فرمایا ''اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے۔''

(البخاري : ٢٤٤٤ ، مسلم : ٢٥٨٤)

اس طریقۂ تعلیم کی جدت پر ایک نظر ڈالیے! ظالم کی مدد کی ترغیب دلا کر سننے والوں کے دلوں میں تو یہ کی خلش پیدا کردی اور جب بظاہر اسی عجیب تعلیم کی طرف وہ بدل وجان متوجہ ہوگئے تو اس کمالِ التفات سے فائدہ اٹھا کر آپ نے یہ تلقین فرمائی کہ ظالم کی مدد کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے۔ (سیرت النبیؐ)

مسند احمد کی ایک حدیث میں آپ نے ظالم سے ڈرنے پر بھی وعید سنائی ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''جب تم میری امت کو دیکھو کہ وہ ظالم کو ظالم کہتے ہوئے بھی ڈرتی ہے تو پھر اس کی اصلاح سے مایوسی ہوجائے گی۔'' (مسند أحمد : ٢/١٦٣-١٩٠)

دوسری روایت میں ہے کہ اس صورت میں میری امت کو زمین میں دھنسنے، شکلوں کے

مسخ ہونے اور سنگ باری جیسے عذابوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

احادیث کے مطالعہ سے ظلم کے بہت سارے نقصانات سامنے آتے ہیں، ہم ان میں سے چندایک کے ذکر پر اکتفاء کرتے ہیں:

۱ ......ظالم اللہ کے غضب کا مستحق ہو جاتا ہے اور اس پر مختلف قسم کے عذاب نازل ہوتے ہیں، جب اللہ گرفت فرماتا ہے تو اس کی گرفت سے ظالم کو کوئی بھی نہیں چھڑا سکتا۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ظالم کو ڈھیل دیتا رہتا ہے پھر جب اسے پکڑتا ہے تو اسے کوئی نہیں چھڑا سکتا۔'' (البخاري : ٤٦٨٦)

۲ ......مظلوم کی بددعاء اس کے خلاف قبول ہوتی ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مظلوم کی دعاء سے بچو کیونکہ وہ آسمان کی طرف ایسے چڑھتی ہے گویا وہ چنگاری ہے۔'' (مستدرك حاكم : ٢٩/١)

۳ ......ظلم کی وجہ سے ملک اور حکومتیں تباہ ہو جاتی ہیں۔

۴ ......ظالم قیامت کے دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے محروم رہے گا، صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا ''میری امت میں دو قسم کے لوگ ایسے ہیں جنہیں میری سفارش نہیں پہنچے گی: ایک تو ظالم اور غاصب بادشاہ، دوسرا دین میں غلو کرنے والا، میں ان دونوں کے خلاف گواہی دوں گا اور ان سے براءت کا اعلان کروں گا۔

(الترغيب والترهيب : ١٨٥/٣)

۵ ......ظلم کا ارتکاب، دل کی ظلمت اور قساوت کی دلیل ہے۔

٦ ......ظالم سے مخلوقِ خدا نفرت کرتی ہے اور دور بھاگتی ہے۔

۷ ......ظالم، قیامت کے دن اپنی نیکیوں سے محروم ہو جائے گا اور اس کے کندھوں پر

مظلوموں کے گناہوں کا بوجھ لاد دیا جائے گا۔

۸......ظالم، اللہ کی نظر میں انتہائی ذلیل اور حقیر ہوتا ہے۔

۹......ظالم کے لئے قیامت کے دن ظلمت ہی ظلمت ہوگی، اسے جنت کی طرف جانے کا راستہ دکھائی نہیں دے گا۔

۱۰......ظالم کا ہاتھ نہ روکنے کی وجہ سے پوری امت کا نظم درہم برہم ہو جاتا ہے۔ شاید ہمارے آج کے انتشار کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ظالم کا ہاتھ روکنا تو کجا الٹا اس کا ساتھ دیا جاتا ہے۔ (ماخوذ أز نضرة النعيم : ۱۰/٤٩٢٦)

والدین کی نافرمانی

تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ والدین کی نافرمانی کبیرہ گناہوں میں سے ہے، امام ذہبی اور امام ابن حجر رحمہما اللہ جنہوں نے کبیرہ گناہوں کے بارے میں الگ الگ کتابیں لکھی ہیں، ان دونوں حضرات نے کتاب وسنت کے متعدد دلائل سے ثابت کیا ہے کہ والدین کی نافرمانی کبیرہ گناہوں میں سے ہے، بلکہ صحیح حدیث سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کبیرہ گناہوں میں بھی سب سے بڑا کبیرہ گناہ ہے۔

بخاری میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں تمہیں کبائر میں سے بڑے کبیرہ کے بارے میں نہ بتاؤں؟ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ضرور بتایئے! آپ نے تین بار یہ سوال کیا اور صحابہ نے بھی تینوں بار یہی جواب دیا پھر آپ نے فرمایا: ''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی کرنا...... آپ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے پھر آپ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور آپ بار بار فرمانے لگے: ''سن لو! (تیسرا کبیرہ) جھوٹی بات اور جھوٹی گواہی ہے، (تکرار کی وجہ سے آپ کو جو تکلیف ہو رہی تھی اس کا احساس کرتے ہوئے) میں سوچنے لگا کاش! آپ خاموش ہو جائیں۔'' (بخاري: ٥٩٧٦، مسلم: ٨٧)

یہاں پر نکتہ یہی قابل غور ہے کہ آپ نے والدین کی نافرمانی کو شرک جیسے گناہ کے ساتھ ذکر فرمایا۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ نے تم پر حرام کر دیا ہے والدین کی نافرمانی کو، بیٹیاں زندہ درگور کرنے کو، ان حقوق کے منع کرنے کو جن کی ادائیگی انسان پر واجب ہے اور ان حقوق کے طلب

کرنے کو جن کا وہ مستحق نہیں اور تمہارے لئے اللہ تین چیزوں کو ناپسند کرتا ہے: قیل وقال (فضول قسم کی بحث) کثرتِ سوال اور اضاعتِ مال۔(فضول خرچی)

(بخاري: ٥٩٧٥، مسلم: ١٧١٥)

سننِ نسائی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین آدمی ایسے ہیں جن کی طرف قیامت کے دن اللہ تعالیٰ (شفقت کی نظر سے) نہیں دیکھے گا، والدین کا نافرمان، مردوں کی مشابہت کرنے والی عورت اور دیوث (بے غیرت مرد، جو غیر مردوں کے ساتھ اپنی بیوی کے میل ملاپ اور بے پردگی پر خاموش رہے) اور تین آدمی ایسے ہیں جو جنت میں داخل نہیں ہوں گے، اپنے والدین کا نافرمان، شراب پر مداومت کرنے والا اور دے کر احسان جتانے والا۔'' (النسائي: ٨٠)

ہر صاحبِ ایمان کا جنت میں داخل ہونا یقینی ہے، جن احادیث میں کسی گناہ گار مسلمان کے بارے میں یہ آیا ہے کہ وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے گناہ کی سزا بھگتے بغیر جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

یوں تو زندگی کے ہر دور میں والدین کی خدمت ضروری ہے لیکن جب وہ بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ دیں تو پھر ان کے جذبات کا احساس اور ان کی دلداری کی اہمیت زیادہ ہو جاتی ہے کیونکہ بڑھاپے کی خزاں میں انسان کو چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کھٹکنے لگتی ہیں، اس کا دل چاہتا ہے کہ میری خدمت کی جائے اور میری مصیبتوں، بیماریوں اور پریشانیوں کا بوجھ ہلکا کیا جائے، کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بڑھاپے کی وجہ سے انسان چڑ چڑا ہو جاتا ہے، یا اس کے حواس اعتدال پر نہیں رہتے، عقل میں بھی ضعف آجاتا ہے ایسے موقع پر سمجھدار اولاد کو چاہئے کہ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھے اور سوچ سمجھ کر ان کے سامنے زبان کھولے، اس کی ذرا سی بے احتیاطی بوڑھے والدین کے آبگینۂ دل کو ٹھیس پہنچا سکتی ہے اور یہ آبگینہ ایسا ہے کہ

ٹوٹ جائے تو پھر بڑی مشکل سے جڑتا ہے، بعض اوقات اسے توڑنے والا اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشان بن جاتا ہے۔

سورۂ اسراء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''تیرے رب نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اگر وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک تمہارے پاس بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں اف تک نہ کہو اور نہ ہی انہیں جھڑکو اور ان کے ساتھ ادب سے بات کرو۔'' (الاسرآء : ۲۳)

یعنی انہیں ایسا کلمہ نہ کہو جس میں تحقیر یا دل شکنی کا پہلو ہو، لہجے کی سختی سے بھی بچا جائے ایسا نہ ہو کہ کلمہ تو تحقیر والا نہ تھا لیکن اسے اس انداز میں ادا کیا گیا جس سے والدین نے ذہنی اذیت اور اپنی تذلیل محسوس کی گویا الفاظ کے انتخاب اور ادائیگی کے اسلوب دونوں میں ان کے جذبات کو ملحوظ رکھا جائے۔ بڑھاپے میں والدین کی خدمت اور راحت رسانی انسان کو جنت کا حقدار بنا سکتی ہے اور اذیت دہی اور ناراضگی اسے دوزخ میں پہنچا سکتی ہے۔

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کی وہ مشہور حدیث آپ نے بار بار پڑھی اور سنی ہوگی جس میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ صحابہ کو منبر کے قریب ہونے کا حکم دیا، جب وہ قریب آ گئے تو آپ نے منبر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے فرمایا: ''آمین'' پھر دوسری اور تیسری سیڑھی پر بھی آپ نے ''آمین'' فرمایا (صحابہ کہتے ہیں) جب آپ منبر سے اترے تو ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! آج ہم نے آپ سے ایسی بات سنی ہے جو اس سے پہلے نہیں سنی تھی، آپ نے فرمایا: ''جبرئیل علیہ السلام میرے سامنے آئے اور انہوں نے کہا ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جس نے رمضان کا مہینہ پایا لیکن اس کی مغفرت نہ ہو سکی میں نے کہا آمین، جب میں نے دوسرے درجہ پر قدم رکھا تو جبریل نے کہا ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جس کے سامنے آپ کا ذکر ہوا لیکن اسے درود شریف پڑھنے کی توفیق نہ ہوئی

میں نے کہا آمین، جب میں نے تیسرے درجے پر قدم رکھا تو جبریل نے کہا ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جس نے اپنے والدین کو یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا لیکن وہ اسے (خدمت کی بدولت) جنت میں داخل نہ کرا سکے، میں نے اس پر بھی آمین کہا۔ علماء کہتے ہیں کہ جس دعاء کے کرنے والے جبریل امین ہوں اور اس پر آمین کہنے والے سید الانبیاء ہوں، اس دعاء کی قبولیت میں کیسے شک ہوسکتا ہے؟

(مستدرك حاكم : ٤/١٥٤)

ایک دوسرے موقع پر بھی آپ نے والدین کے نافرمان کے لئے بددعاء فرمائی تھی، صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ناک، خاک آلود ہو جائے، پھر ناک، خاک آلود ہو جائے، پھر ناک، خاک آلود ہو جائے، عرض کیا گیا یا رسول اللہ! یہ بددعاء آپ کسے دے رہے ہیں، آپ نے فرمایا: ''اس شخص کو جو اپنے والدین میں کسی ایک کو یا دونوں کو بڑھاپے کی حالت میں پائے مگر (ان کی خدمت کر کے) جنت میں داخل نہ ہو سکے۔'' (مسلم : ٢٥٥١)

یہ اِسلامی تعلیمات ہی کا نتیجہ ہے کہ آج جب کہ پوری دنیا میں بالعموم اور یورپ میں بالخصوص بوڑھے والدین کو بوجھ سمجھ کر اولڈ ہاؤسز میں داخل کرا دیا جاتا ہے اور وہ عام دنوں میں تو کیا خوشی کے مواقع پر بھی اپنی اولاد، پوتوں اور نواسوں کے مسکراتے چہرے دیکھنے کے لئے ترستے ہیں، اس مادّیت زدہ ماحول میں بھی اکثر مسلمان آج بھی اپنے والدین کی خدمت کو سعادت سمجھتے ہیں اور بڑھاپے میں بھی انہیں اپنے آپ سے دور کرنے کی جسارت نہیں کرتے۔

والدین کی نافرمانی میں جو نقصانات پوشیدہ ہیں وہ کسی بھی عقلمند سے مخفی نہیں، چند ایک ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:

۱- والدین کی نافرمانی انسان کو اللہ کی رضا سے محروم کر دیتی ہے۔

۲- اس نافرمانی کے اثرات دور تک مرتب ہوتے ہیں، چنانچہ جو شخص اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش نہیں آتا، اسکی اولاد اسکے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کرتی۔

۳- والدین کا نافرمان اللہ کی نعمت کا بھی منکر ہوتا ہے اور والدین کے احسان کا بھی۔

۴- اسی گناہ کے عام ہونے سے معاشرہ امن وامان اور انسانیت کے دائرہ سے نکل جاتا ہے۔

۵- والدین کے نافرمان کا چہرہ بے نور ہوتا ہے اور اس پر ایک نحوست سی چھا جاتی ہے۔

(ماخوذ از نضرة النعيم : ۱۰/۱۷ ۵۰)

عِصیان

اردو میں ''عصیان'' کا معنیٰ نافرمانی اور گناہ کیا جاتا ہے، ایک مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی زندگی کے ہر شعبے میں اطاعت کرے، جب وہ ایسا نہیں کرتا تو گناہ گار شمار ہوتا ہے۔ فیلسوفِ اسلام امام ابن قیم رحمہ اللہ اپنی لاجواب کتاب ''الجواب الکافی'' میں فرماتے ہیں کہ گناہ کا دل پر وہی اثر ہوتا ہے جو زہر کا جسم پر ہوتا ہے البتہ اس ضرر اور اثر کے درجات مختلف ہوتے ہیں۔ دیکھا جائے تو دنیا اور آخرت کے جتنے بھی شر ہیں وہ گناہوں ہی کی وجہ سے تو ہیں کبھی سوچیے تو سہی!

وہ کیا چیز تھی جس نے حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام کو لذت و نعمت اور فرحت و بشاشت کے گھر (جنت) سے نکال کر غموں اور پریشانیوں، ہموم و افکار کے گھر (دنیا) میں پہنچا دیا؟ وہ کیا سبب تھا جس کی وجہ سے ابلیس کو آسمانوں کی ملکوت سے نکلنا پڑا، وہ دائمی لعنت کا مستحق بنا، اس کے ظاہر اور باطن کو مسخ کر دیا گیا، قرب کو بُعد میں، رحمت کو لعنت میں، جمال کو قبح میں اور جنت کو آگ میں بدل دیا گیا؟

آخر کیا وجہ تھی کہ اہلِ زمین کو پانی کی طوفانی موجوں میں غرق کر دیا گیا، یہاں تک کہ پانی پہاڑوں کی چوٹیوں سے بھی تجاوز کر گیا؟ قومِ عاد پر ایسی ہوا کیوں مسلط کی گئی جس نے انہیں اٹھا اٹھا کر زمین پر پٹخا، ان کی بدبودار لاشوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا گویا کھجور کے کھوکھلے تنے ہیں؟

قومِ ثمود کو اس خوفناک زلزلے اور چنگھاڑ کا کیوں سامنا کرنا پڑا جس سے ان کے کانوں کے پردے پھٹ گئے اور ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے؟ زمین پر شاداں و فرحاں بسنے والی قومِ لوط کی بستیوں کو آسمانوں کے قریب تک اٹھایا گیا یہاں تک کہ ان کے کتوں

کے بھونکنے کی آواز اہل آسمان نے سن لی پھر انہیں پٹخ دیا گیا، اوپر کو نیچے کر دیا گیا اور وہ سب ہلاک ہوکر رہ گئے؟ اہلِ مدین پر بادل کا عذاب کیوں آیا جسے دیکھ کر وہ سمجھے تھے کہ ان پر بارش برسے گی لیکن اس بادل سے آگ برسی جس نے انہیں زندہ جلا دیا؟

فرعون اور اس کی قوم کو سمندر میں کیوں ڈبو دیا گیا، ان کے جسم غرق ہو گئے اور ان کی روحیں جلنے کے لئے رہ گئیں؟ سورہ یٰسین میں جن سرکشوں کا ذکر ہے وہ ایک ہی چیخ میں بجھی ہوئی راکھ کیوں بن گئے؟

وہ بنی اسرائیل جنہیں اللہ کے چہیتے اور انبیاء کی اولاد ہونے کا دعویٰ تھا، ان پر ایسی وحشی اور طاقتور قوم کیوں مسلط کر دی گئی جو گھروں میں گھس گئی، انہوں نے مردوں کو قتل کر دیا، خواتین اور بچوں کو گرفتار کر لیا، گھر جلا دیے، اموال لوٹ لئے، کچھ عرصہ کے وقفہ اور مہلت کے بعد دوبارہ ان کے ساتھ یونہی ہوا اور انہیں تہس نہس کر کے رکھ دیا گیا؟

(الجواب الكافي : ٤٦، ٤٧)

آخر سوچیے تو سہی! اور سوچنے میں حرج ہی کیا ہے کہ ان اقوام پر تباہی و بربادی اور عذاب اور ہلاکت مسلط کئے جانے کا کیا سبب تھا؟ اللہ کی قسم! اس کا سبب سوائے اللہ کی نافرمانی کے اور کچھ نہ تھا، جو قومیں اور افراد مرضِ عصیاں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور توبہ کے ذریعے اس سے شفا پانے کی نہ تدبیر کرتے ہیں اور نہ کوشش کرتے ہیں تو ان کے ساتھ یونہی ہوتا ہے۔ یہی تاریخ کی گواہی ہے اور یہی ہمارے رب کا اعلان ہے، سورۂ نساء میں ہے:

''اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کی حدود سے تجاوز کرتا ہے اللہ اسے آگ میں داخل کر دے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے رسوا کن عذاب ہے۔'' (النسآء : ١٤)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بتا دیا کہ نجات صرف میری اطاعت میں ہے اور جو

معصیت کا راستہ اختیار کریں گے ان کے لئے ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’میری ساری امت جنت میں داخل ہوگی سوائے اس کے جس نے انکار کیا، عرض کیا گیا یارسول اللہ! انکار کرنے والا کون ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو میری اطاعت کرے گا وہ جنت میں داخل ہوگا اور جو نافرمانی کرے گا اس نے انکار کیا۔‘‘ (البخاري : ۷۲۸۰)

کتاب وسنت کے نصوص اور صحابہ اور علماء واتقیاء کے آثار واقوال سے گناہوں کے جو نقصانات ثابت ہوتے ہیں ہم ذیل میں ان میں سے کچھ نقل کرتے ہیں:

۱- علم سے محرومی...... کیونکہ علم ایک نور ہے جسے دل میں القاء کیا جاتا ہے، جب کہ معصیت اس نور کو بجھادیتی ہے۔

۲- رزق سے محرومی...... جیسے تقویٰ سے رزق میں برکت ہوتی ہے، اسی طرح ترکِ تقویٰ سے فقر وفاقہ پیدا ہوتا ہے۔

۳- طاعت سے محرومی...... غور کیا جائے تو معصیت کی سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ بندہ اپنے مالک کی اطاعت سے محروم ہوجاتا ہے۔

۴- معاصی کی وجہ سے دل اور بدن دونوں ضعف کا شکار ہوجاتے ہیں۔

۵- گناہ، عمر کو گھٹادیتے ہیں اور برکت ختم ہوجاتی ہے۔

۶- معاصی دوسرے معاصی کی پیداوار کا ذریعہ بنتے ہیں، شراب نوشی یا بدنظری ہی کو لے لیجئے کہ یہ انسان کو کشاں کشاں زنا کی طرف لے جاتے ہیں۔

۷- مسلسل گناہ کرنے کی وجہ سے گناہ کے عزائم قوی ہوجاتے ہیں اور توبہ کا ارادہ کمزور پڑ جاتا ہے، یہاں تک کہ ہوتے ہوتے دل سے توبہ کا ارادہ کلی طور پر ختم ہوجاتا ہے۔

۸- ہر گنا ہ، تباہ شدہ قوموں کی میراث ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والا ان کا وارث،

میراث بھی بدترین اور وارث بھی بدترین!

۹- معصیت کی وجہ سے بندہ اللہ کی نظر میں ذلیل ہوجاتا ہے، بعض اوقات نجاست کے کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل!

۱۰- گناہوں کی نحوست کے اثر سے غیر گناہ گار بلکہ حیوان بھی محفوظ نہیں رہتے، جب اللہ کا عذاب آتا ہے تو سب ہی متاثر ہوتے ہیں اس لئے گناہ گار کو سمجھانا اور اس کا ہاتھ روکنا سب کی ذمہ داری ہے۔

۱۱- کثرتِ گناہ کی وجہ سے دل سے گناہ کی مضرت کا احساس ختم ہوجاتا ہے اور یہی ہلاکت کی علامت ہے۔

۱۲- معصیت، ذلت کا سبب بنتی ہے، عزت تو بس اللہ کی اطاعت ہی میں ہے۔

۱۳- معاصی، عقل میں فساد پیدا کردیتے ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے عقل کا نور بجھ جاتا ہے، جب نور بجھ گیا تو ضعف اور فساد لازمی ہے۔

۱۴- بار بار گناہ کرنے سے دل پر مہر لگ جاتی ہے پھر اس پر کوئی آیت کوئی حدیث اور کوئی نصیحت اثر نہیں کرتی۔

۱۵- گناہوں کی وجہ سے ہر جگہ فساد برپا ہوجاتا ہے، کیا پانی اور کیا ہوا، کیا کھیتیاں اور کیا مکانات کوئی چیز بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔

۱۶- معصیت، حیا کو ختم کردیتی ہے...... حیا جو کہ دل کی زندگی اور ہر خیر کی بنیاد ہے۔

۱۷- گناہوں پر جری ہونا دلیل اور نشانی ہے ایمان کے ضعف کی، ظلمتِ قلب کی اور بصیرت کے فقدان کی۔

۱۸- جسے گناہوں سے توبہ کی توفیق نصیب نہ ہو وہ جان لے کہ اللہ نے اسے اس کی سرکشی کی وجہ سے نفس اور شیطان کے حوالے کردیا ہے۔

۱۹- گناہ، انسان کو احسانی کیفیت سے محروم کر دیتے ہیں۔

۲۰- گناہوں کی وجہ سے نعمتیں زائل ہو جاتی ہیں اور مصیبتیں اور پریشانیاں نازل ہونے لگتی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قولِ زریں ہے: ''مصیبت آتی تو ہے گناہ کی وجہ سے اور دور ہوتی ہے صرف توبہ کی وجہ سے۔''

(ماخوذ از نضرة النعيم: ۱۰/۵۰۰۹، ۵۰۱۰)

گناہ پر اِصرار

انبیاءِ کرام علیہم السلام کے علاوہ ہر انسان سے گناہ ہوسکتا ہے، کوئی انسان ایسا نہیں جو یہ دعویٰ کر سکے کہ مجھ سے کبھی گناہ نہیں ہوسکتا، مسلمان کی شان یہ ہے کہ اگر اس سے کوئی گناہ ہوجائے تو وہ اس پر اصرار نہیں کرتا، سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ والوں کی مختلف صفات بیان فرمائی ہیں، ان میں سے ایک صفت یہ ہے کہ ''اور وہ جب کوئی کھلا گناہ یا اپنے حق میں کوئی اور برائی کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور اس کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے؟ اور جان بوجھ کر اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔'' (سورة الِ عمران : ۱۳۵)

دیکھئے! اس آیتِ کریمہ میں متقیوں کی صفت یہ بیان نہیں فرمائی کہ ان سے کبھی گناہ ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ بیان فرمائی ہے کہ ان سے اگر گناہ ہوجائے تو وہ اسے مسلسل نہیں کئے جاتے بلکہ اللہ کو یاد کرتے اور اس سے مغفرت طلب کرتے ہیں، انسان کو ذکر و استغفار کی توفیق تب حاصل ہوتی ہے جب وہ اللہ کی کتاب میں غور و فکر کرتا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ نے جنت کی جو نعمتیں ذکر فرمائی ہیں اور اطاعت گزاروں کے ساتھ ان کا وعدہ کیا ہے۔

یونہی دوزخ کے مختلف عذابوں کا ذکر ہے اور نافرمانی کرنے والوں کو ان سے ڈرایا گیا ہے، جب انسان انہیں یاد کرتا رہتا ہے تو اس کے دل میں خوف اور امید کا جذبہ قوی ہوجاتا ہے، ایسے انسان سے اگر بتقاضائے بشریت کبھی کوئی گناہ ہوجائے تو وہ بے چین ہوجاتا ہے، اسے منعمِ حقیقی کے انعامات یاد آتے ہیں اور جب تک وہ توبہ نہ کرلے اس کے ضمیر میں ایک خلش اور کسک سی محسوس ہوتی ہے جیسا کہ حضرت سھل بن عبداللہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ''توبہ کرنے والے کی علامت یہ ہے کہ گناہ کی وجہ سے اسے کھانا پینا بھی اچھا

نہیں لگتا، (قرطبي : ٤/١٣٦) اسے تو بس یہ فکر لگی ہوتی ہے کہ جتنا جلدی ممکن ہو میں گناہ سے پاک ہو جاؤں، ایسا نہ ہو کہ گناہ کی نجاست میں آلودہ ہونے کی حالت میں مجھے موت آ جائے کیونکہ موت کا متعین وقت کسی کو معلوم نہیں وہ تو کسی وقت بھی آ سکتی ہے، نہ معلوم توبہ کی مہلت مل سکے یا نہیں۔‘‘

جو لوگ زندگی کی شدید محبت اپنے دلوں میں پال لیتے ہیں اور موت کو اس لئے یاد نہیں کرتے تا کہ ان کا لطف اور عیاشی بے مزہ نہ ہو جائے، مگر یہ تو کافر کا اندازِ فکر ہوتا ہے، مسلمان کی سوچ ایسی نہیں ہوتی اسے ہر وقت موت کی آہٹیں سنائی دیتی ہیں، اس لئے وہ گناہ پر اصرار کی بجائے فوراً استغفار کر لیتا ہے۔

سورۂ واقعہ میں گناہوں پر اصرار اور مرنے کے بعد والی زندگی کا انکار کافروں کی صفت بتایا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: ’’اور بائیں ہاتھ والے کیا ہیں، بائیں ہاتھ والے گرم ہوا اور گرم پانی میں ہوں گے اور سیاہ دھوئیں کے سائے میں جو نہ ٹھنڈا ہے نہ فرحت بخش، بے شک یہ لوگ اِس سے پہلے بہت نازوں میں پلے ہوئے تھے اور بڑے بڑے گناہوں پر اصرار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈی ہو جائیں گے تو کیا ہم پھر دوبارہ اٹھا کھڑے کئے جائیں گے۔‘‘ (سورة الواقعة : ٤١ ـ ٤٧)

قرآن کریم کے علاوہ احادیث میں بھی گناہ پر اصرار کی مذمت اور استغفار کی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر تشریف فرما ہو کر ارشاد فرمایا: ’’لوگو! رحم کرو تم پر رحم کیا جائے گا، معاف کیا کرو اللہ تمہیں معاف کر دے گا، ہلاکت ہے ان لوگوں کے لئے جو سنتے تو ہیں مگر نہ تو یاد رکھتے ہیں نہ ہی عمل کرتے ہیں، ہلاکت ہے ان لوگوں کے لئے جو علم رکھنے کے باوجود گناہ پر اصرار کرتے ہیں۔‘‘ (مسند أحمد : ٢/١٦٥)

علماء اور صوفیاء نے گناہ پر اصرار کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس میں سے چند منتخب اقوال یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مختلف اسباب کی وجہ سے صغیرہ، کبیرہ بن جاتا ہے، ان میں سے ایک سبب اصرار اور مداومت بھی ہے، پانی کے چند قطرے جب پتھر پر مسلسل گرتے رہیں تو اس میں نشان پڑ جاتا ہے، یونہی چھوٹے چھوٹے گناہ جب بار بار کئے جاتے ہیں تو انکی وجہ سے دل ضرور تاریک ہو جاتا ہے۔'' (احیاء علوم الدین : ٤/٣٢)

امام ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جس سے در گزر کیا جا رہا ہے اسے دھوکے کا شکار نہیں ہونا چاہئے کیونکہ کبھی سزا میں تاخیر بھی ہو جاتی ہے، گناہوں میں سے بدترین گناہ جس کے لئے بڑی سزا تیار کی گئی ہے وہ گناہ پر اصرار کرنا ہے۔''

یہ بھی اِنہی کا قول ہے:

''بسا اوقات جب گناہوں میں مبتلا شخص اپنے بدن اور مال کی سلامتی دیکھتا ہے تو گمان کر بیٹھتا ہے کہ مجھے کوئی سزا نہیں ملے گی حالانکہ مستقبل میں ملنے والی سزا سے اس کی غفلت بھی ایک سزا ہی ہے۔'' (صيد الخاطر : ١٧)

''بسا اوقات جو سزا اسے جلد دے دی جاتی ہے وہ معنوی ہوتی ہے جیسا کہ بنی اسرائیل کے ایک عالم سے منقول ہے کہ اس نے کہا یا رب! میں نے کتنی ہی بار تیری نافرمانی کی مگر تو نے مجھے سزا نہ دی تو اسے جواب دیا گیا کہ (اے ناداں!) میں تجھے کتنی بڑی سزا دے چکا ہوں مگر تجھے خبر ہی نہ ہوئی، کیا ایسا نہیں کہ میں نے تجھے اپنی مناجات کی حلاوت سے محروم کر دیا۔'' (صيد الخاطر : ٤٥)

''سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ جسے سزا دی جائے اسے سزا کا احساس نہ ہو اور اس سے بھی زیادہ خطرناک چیز یہ ہے کہ وہ سزا کو قابلِ مسرت چیز سمجھے، مثال کے طور پر مالِ حرام کا

حاصل ہونا، گناہوں پر قدرت ہونا اور نیکی کی توفیق سلب ہو جانا یہ سب سزائیں ہی تو ہیں مگر وہ بے وقوف ان پر خوش ہوتا ہے۔" (صيد الخاطر : ١٦)

آخر میں گناہوں پر اصرار کے چند نقصانات بھی ملاحظہ فرمائیں:

☆ گناہوں پر اصرار بندے اور اللہ کے درمیان وحشت کا سبب بنتا ہے۔

☆ اللہ اور مقرب فرشتے مصر (اصرار کرنے والے) پر لعنت بھیجتے ہیں۔

☆ ایسے شخص پر شیاطین مسلط ہو جاتے ہیں۔

☆ اس کے لئے طاعات مشکل ہو جاتی ہیں اور وہ دعاء سے غافل ہو جاتا ہے۔

☆ وہ ہمیشہ دل کا انقباض، نفس کی خباثت اور سینے کی تنگی محسوس کرتا ہے۔

☆ اس کی نظر میں دنیا بڑی چیز بن جاتی ہے، چنانچہ وہ اس کا غلام بن جاتا ہے۔

☆ اس کی عقل خفیف اور اس کے ایمان میں نقص پیدا ہو جاتا ہے۔

☆ جب وہ مرتا ہے تو عذاب کے فرشتے اس کا استقبال کرتے ہیں۔

☆ جب وہ قیامت کے دن حساب سے فارغ ہوگا تو اسے بائیں ہاتھ والوں میں شامل کر دیا جائے گا۔

☆ وہ انسانوں کی نظر میں بھی ذلیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ (نظرة النعيم : ٣٩٠٤/٩)

ترکِ نماز

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مسلمانوں کا اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ عمداً فرض نماز کا چھوڑنا گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ ہے، اللہ کے نزدیک ترکِ نماز کا گناہ قتل سے، غصب وغضب سے، سرقہ اور شراب نوشی سے بھی زیادہ ہے، ایسا شخص اپنے آپ کو دنیا اور آخرت میں، اللہ کے غضب اور عقوبت کے لئے پیش کرتا ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مختلف عمال اور مسلمانوں کو لکھا کرتے تھے کہ میرے نزدیک تمہارے معاملات میں سے سب سے زیادہ اہم نماز ہے، جس نے نماز کی حفاظت کی اس نے اپنے دین کی حفاظت کی اور جس نے نماز کو ضائع کیا وہ دین کے دوسرے احکام کو زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا، جو شخص نماز کو چھوڑتا ہے اس کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں، نماز اسلام کے فرائض میں سے پہلا فریضہ ہے اور یہ دین میں سے سب سے آخر میں مفقود ہوگا، یہ اسلام کا اول بھی ہے اور آخر بھی ہے، جب دین کا اول اور آخر جاتا رہا تو سارا دین جاتا رہا، اس لئے کہ جس چیز کا اول اور آخر نہ رہے تو اس کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

(كتاب الصلاة لابن قيم: ۲۲،۲۱)

اسلاف کے ہاں چونکہ ایک مسلمان سے ترکِ نماز کا تصور بھی محال تھا اس لئے وہ نماز کو ضائع کرنے کا مفہوم بیان کرتے تھے کہ نماز کو اپنے وقت سے مؤخر کردینا۔

حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ جنہیں تابعین کا امام کہا جاتا ہے وہ فرماتے ہیں:

''نماز کو ضائع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ظہر کی نماز عصر تک، عصر کی نماز مغرب تک، مغرب کی نماز عشاء تک، عشاء کی نماز فجر تک اور فجر کی نماز طلوعِ آفتاب تک مؤخر کردے، جس شخص کا اس حالت میں انتقال ہوگیا اور توبہ کی توفیق نصیب نہ ہوئی، اس کے لئے اللہ کی

طرف سے سخت وعید ہے اور وہ جہنم کی ایسی وادی میں ہوگا جس کی گہرائی بہت زیادہ اور جس کی سزا بہت سخت ہے۔" (مکاشفة القلوب : ۳۵۸)

سورۂ مدثر میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ جب دوزخی دوزخ میں چلے جائیں گے تو ان سے اہلِ جنت سوال کریں گے کہ تمہیں دوزخ میں کس چیز نے داخل کیا ہے تو وہ دوزخ میں ڈالے جانے کے چار اسباب بیان کریں گے" وہ کہیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور ہم بحث کرنے والوں کے ساتھ بحث میں مشغول رہتے تھے اور ہم جزا کے دن کو جھٹلاتے تھے یہاں تک کہ ہمیں موت آ گئی۔"

(المدثر : ۴۳۔۴۶)

اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کے درمیان جو گفتگو قیامت کے دن ہوگی اللہ تعالیٰ نے وہ گفتگو دنیا ہی میں بتا دی ہے تاکہ عقل رکھنے والے نصیحت حاصل کریں اور ان سارے اسباب سے بچ جائیں جو دوزخ میں لے جانے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ نے نماز میں سستی کرنے کو منافقوں کی علامت بتایا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "بے شک منافق اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں ان کے دھوکے کا بدلہ دے گا اور جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو بڑی کاہلی سے کھڑے ہوتے ہیں، صرف لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔" (النسآء : ۱۴۲)

سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیثِ مبارکہ میں بھی ترکِ نماز پر سخت وعیدیں سنائی ہیں۔ حضرت عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ مجھے میرے خلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات باتوں کی وصیت فرمائی تھی۔ آپ نے فرمایا تھا: "اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا اگرچہ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں یا تمہیں زندہ جلا دیا جائے یا سولی پر چڑھا دیا جائے اور جان بوجھ کر نماز نہ چھوڑنا، جس شخص نے جان بوجھ کر نماز چھوڑی

وہ ملت سے خارج ہو گیا اور معصیت کا ارتکاب نہ کرنا کیونکہ یہ اللہ کی ناراضگی کا سبب ہے اور شراب نوشی نہ کرنا کیونکہ یہ تمام گناہوں کی جڑ ہے۔"

(الترغیب والترھیب : ۳۷۹/۱)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "انسان اور کفر وشرک کے درمیان فرق، ترکِ نماز ہے۔" (مسلم : ۸۲)

نماز مسلمان کی پہچان ہے، کافروں اور مشرکوں کے مجمع میں مسلمان کو نماز کے ذریعے پہچانا جاتا ہے، گویا یہ ناممکن سی بات ہے کہ مسلمان تو ہو مگر نماز ادا نہ کرے جبکہ ہماری آبادیوں کو دیکھ کر مسلمان کا نماز ترک کرنا ایک عام معمول ہے۔ ایک طرف شہروں اور دیہاتوں کی آبادی کو دیکھئے اور دوسری طرف مساجد کو دیکھئے! آپ کو ہزاروں کی آبادی میں سو پچاس سے زیادہ نمازی دکھائی نہیں دیں گے۔ ایسا لگتا ہے کہ دلوں سے نماز کی عظمت اور اہمیت نکل ہی گئی ہے اور اسے ایک ایسا عمل سمجھ لیا گیا ہے جس کے کرنے یا نہ کرنے کا مسلمان کو اختیار دے دیا گیا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حال یہ تھا کہ وہ سخت مجبوری اور بیماری میں بھی نماز چھوڑنا گوارا نہیں کرتے تھے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی آنکھ میں کچھ تکلیف ہو گئی، جس کی وجہ سے ان کی بینائی جاتی رہی، ان سے کہا گیا کہ ہم آپ کا علاج کرتے ہیں، لیکن آپ کو چند روز تک نماز چھوڑنی ہو گی آپ نے فرمایا نہیں میں نماز نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "جس نے نماز چھوڑی اس کی اللہ سے ملاقات اس حال میں ہو گی کہ اللہ اس پر ناراض ہو گا۔" (الترغیب والترھیب : ۳۸۱/۱)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: "جو شخص نماز نہیں پڑھتا اس کے اسلام کا کوئی اعتبار نہیں۔" (تعظیم قدر الصلوٰۃ : ۸۷۹/۲)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، جس نے ایک نماز جان بوجھ کر چھوڑی وہ اللہ سے بری ہوگیا اور اللہ اس سے بری ہوگیا۔" (تعظیم قدر الصلوٰۃ : ۲/ ۸۹۷)

حضرت عبداللہ بن شفیق عقیلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نماز کے علاوہ کسی بھی عمل کے ترک کو کفر نہیں سمجھتے تھے۔"

(الترغیب والترهیب : ۱/ ۳۷۹)

آخر میں ترکِ نماز کے چند نقصانات بھی ملاحظہ فرمالیجئے:

۱- ترکِ نماز انسان کو بتدریج کفر اور ملت سے خارج ہونے کی طرف لے جاتا ہے۔

۲- ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے غضب اور ناراضگی کا مستحق ہوجاتا ہے۔

۳- تارکِ نماز دنیا اور آخرت میں ذلیل ہوتا ہے۔

۴- بے نمازی کا حشر ہامان، قارون، فرعون اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔

۵- اسے دیدارِ الٰہی اور لقاءِ الٰہی (اللہ تعالیٰ سے ملاقات) کی نعمت سے محروم رکھا جائے گا۔

٦- اس بدنصیب کو یہ علم بھی نہیں ہوتا کہ میں ایک ایسے عمل سے محروم ہوگیا ہوں جو گناہوں کے کفارہ اور نیکیوں میں اضافہ کا سبب بن سکتا تھا۔

(نضرة النعيم : ٩/ ٤١٦٧)

بدنظری

عام طور پر غیر محرموں کی طرف تاک جھانک کو بدنظری کہا جاتا ہے، سورۂ نور میں مسلمان مردوں اور عورتوں دونوں کو الگ الگ حکم دیا گیا ہے کہ اپنی نظریں جھکا کر رکھیں، (النور: ۳۰، ۳۱) جو لوگ اپنی نظروں کی حفاظت نہیں کرتے اور سامنے آنے والے ہر منظر کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، بعض اوقات یہ نظر بازی دل پر انتہائی مہلک اثرات مرتب کرتی ہے، یہ نظر ہی ہے جو پہلے دل میں محبت اور پھر عشق کی آگ روشن کرتی ہے، یہ آگ انسان کا امن وسکون ہی نہیں، شرم وحیا کی متاع کو بھی جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، جب حیا نہ رہے تو وہ رکاوٹ ختم ہو جاتی ہے جو انسان کو گناہوں اور بدکاریوں کی اندھی وادی میں کودنے سے روکتی ہے۔

قبل اس کے کہ ہم فیلسوفِ اسلام امام ابن قیم رحمہ اللہ کا قولِ زریں اپنے قارئین اور قاریات کے استفادہ کے لئے نقل کریں، یہ بتانا مناسب سمجھتے ہیں کہ انسان محبت کی پہلی سیڑھی سے لیکر آخری سیڑھی تک جن مراحل سے گزرتا ہے عربی زبان میں ان میں سے ہر مرحلہ کے لئے الگ لفظ وضع کیا گیا ہے یعنی علاقہ، صبابۃ، عزام، عشق اور شغف ہے۔

امام فرماتے ہیں کہ نظر محبت پیدا کرتی ہے، جوں جوں محبت کا جذبہ شدید ہوتا جاتا ہے، محبت ایک مرحلے کے بعد دوسرے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ جو لوگ بدنظری اور وساوس کے ذریعہ اس جذبے کی پرورش کرتے رہتے ہیں وہ خود اور ان کا دل کسی بندے کی بندگی کرنے لگتے ہیں، وہ اس کے اشارے پر ناچتے اور تھرکتے ہیں، پہلے انکا دل بادشاہ اور آزاد تھا لیکن وہ اسے قیدی اور غلام بنا دیتے ہیں، پھر وہ وقت بھی آتا ہے جب ان کی بصیرت ختم ہو جاتی ہے اور باطنی نور بجھ جاتا ہے پھر وہ حق کو حق اور باطل کو باطل نہیں سمجھتے۔ یہ ایسی

صورتحال ہوتی ہے جسے انسان اپنے اندر محسوس کرتا ہے کیونکہ دل آئینہ ہے اور باطل خواہشات کی طرح ہیں۔ جب یہ آئینہ زنگ سے پاک ہوگا تو اس میں حقائق کی تصویر بھی اپنی اصل شکل میں جلوہ گر ہوگی اور جب یہ زنگ آلود ہوگا تو اس میں معلومات کی صحیح صورتیں منقش ہوں گی، بلکہ ظلمت، نور محسوس ہوگی اور نور، ظلمت دکھائی دے گا۔

(اغاثة اللهفان: ۱/۴۷، ۴۸)

یہ عکسِ حقائق نتیجہ ہوتا ہے بدنظری کا، اس لئے مسلمان کو چاہئے کہ وہ یہ موقع آنے ہی نہ دے اور دل کی سرزمین میں برائی کو جڑ پکڑنے ہی نہ دے۔ ظاہر ہے غیر محرم مرد کو دیکھنے کی وجہ سے عورت کے دل میں اور عورت کو دیکھنے کی وجہ سے مرد کے دل میں وسوسہ پیدا ہوسکتا ہے، اس لئے جیسے مردوں کو عورتوں کے دیکھنے سے منع کیا گیا ہے، اسی طرح عورتوں کو مردوں کی طرف تاک جھانک کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ابوداؤد میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں اور میمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھیں، اسی دوران ابن ام مکتوم تشریف لے آئے، یہ اس وقت کی بات ہے جب پردے کا حکم نازل ہو چکا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم دونوں اس سے پردہ کرو، میں نے عرض کیا رسول اللہ! کیا وہ نابینا نہیں ہیں، نہ تو ہمیں دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی وہ ہمیں پہچانتے ہیں، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم دونوں بھی اندھی ہو؟ کیا تم انہیں نہیں دیکھ سکتی ہو؟ (ابو داؤد: ۴۱۱۲)

چونکہ راہ چلتے ہوئے اچانک نظر پڑسکتی ہے اس لئے پہلی نظر کی اجازت دی گئی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا تھا: ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالنا، کیونکہ تمہیں پہلی نظر کی تو اجازت ہے مگر دوسری کی اجازت نہیں۔

نظر کو زہریلا تیر بھی قرار دیا گیا ہے جو براہِ راست جا کر دل پر لگتا ہے، جو شخص بدنظری

کی بیماری میں مبتلا ہو جائے اسے اس بیماری سے نجات پانے کے لئے بڑا مجاہدہ کرانا پڑتا ہے۔ بدنظری کے ایسے بیمار بھی دیکھنے اور سننے میں آئے ہیں، جن کے بال بڑھاپے سے سفید ہو جاتے ہیں، جسم میں رعشہ آجاتا ہے، کمر جھک جاتی ہے لیکن اس بیماری سے انہیں نجات نہیں ملتی، ایسے مریضوں کا عبادت میں دل نہیں لگتا اور نہ ہی حلاوت نصیب ہوتی ہے، ذکر و عبادت کے وقت وساوس کی یلغار ہوتی ہے، بظاہر وہ نماز اور تلاوت میں مصروف ہوتے ہیں لیکن ان کے دل کہیں اور ہوتے ہیں، ان کے برعکس جو لوگ نظر کی حفاظت کرتے ہیں ان کے نورِ بصیرت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور انہیں عبادت میں ایسی حلاوت عطا کی جاتی ہے جس کا مقابلہ کوئی حلاوت نہیں کر سکتی، بظاہر نظر کی حفاظت بڑا مشکل کام محسوس ہوتا ہے، لیکن اگر انسان ہمت سے کام لے تو اس کے لئے یہ مشکل آسان کر دی جاتی ہے۔

مسلمان کو ہر وقت یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہئے کہ آنکھیں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہیں جو مفت اور بن مانگے مل گئی ہے، اللہ چاہتا تو ہمیں نابینا کر دیتا اور اب بھی ایسا کرنا اس کے لئے مشکل نہیں ہے، اس نعمت کے شکر کا تقاضا یہ ہے کہ اسے اللہ کی نافرمانی میں ہرگز استعمال نہ کیا جائے۔

فضول خرچی

قرآن کریم میں فضول خرچی کے لیے دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں: اسراف اور تبذیر۔ سورۂ اعراف میں ہے: ”اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنے آپ کو مزین کیا کرو اور کھاؤ اور پیو اور اسراف نہ کرو، بے شک اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

(سورۃ الاعراف: ۳۱)

جبکہ سورۂ اسراء میں ”تبذیر والوں“ کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ”قرابت دار کو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دے دو اور فضول خرچی نہ کرو بے شک فضول خرچی کرنے والے شیاطین کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کی نعمتوں کا ناشکرا ہے۔“

(الاسراء: ۲۶، ۲۷)

تبذیر اور اِسراف میں اہلِ علم نے فرق یہ کیا ہے کہ اگر کوئی شخص ضرورت سے زائد خرچ کرے تو یہ اسراف ہوگا، اگرچہ جائز مصرف ہی میں خرچ کرے جبکہ تبذیر کا اطلاق ناجائز محل میں خرچ کرنے پر ہوتا ہے۔ اسی لئے ”مسرفین“ کے بارے میں تو صرف یہ فرمایا گیا ہے کہ ”اللہ انہیں پسند نہیں کرتا“ جبکہ ”مبذّرین“ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ شیطان کے بھائی ہیں۔“ اس فرق کی تائید حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ کے قول سے بھی ہوتی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم اصحابِ محمد بیان کیا کرتے تھے کہ ناجائز مصرف میں خرچ کرنا ”تبذیر“ ہے۔ (الدرر المنثور: ۲۷۴/۵) حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ”اگر کوئی شخص اپنا سارا مال حق میں خرچ کر دے تو اسے ”مبذر“ (فضول خرچ) نہیں کہا جائے گا اور اگر اس نے ناحق جگہ تھوڑا سا غلہ بھی خرچ کیا تو اسے ”مبذّر“ شمار کیا جائے گا۔“

(تفسیر ابن کثیر: ۳۹/۳)

''اسراف'' کا اصل معنی ہے حد سے تجاوز کرنا، اسی لئے گناہ کی زندگی بسر کرنے والوں کو بھی ''مسرفین'' کہا گیا ہے کیونکہ وہ حقیقت میں اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرتے ہیں، لوط علیہ السلام کی قوم کو بھی قرآن کریم میں ''مسرفین'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ وہ تقاضائے شہوت کی تکمیل میں حد سے بڑھ جاتے تھے، لیکن اب یہ لفظ عام طور پر فضول خرچی کرنے والوں میں استعمال ہوتا ہے۔

اسلام اعتدال کا دین ہے، زندگی کے ہر معاملے میں اسلام نے اعتدال کی تلقین کی ہے خواہ خورونوش کا معاملہ ہو یا اوڑھنے اور بچھونے کا، اہل وعیال پر خرچ کرنے کا مرحلہ ہو یا کسی بھی جائز محل میں صرف کرنے کا، اسلام نہ تو بخل کو پسند کرتا ہے اور نہ ہی فضول خرچی کو، سورۂ فرقان میں رحمٰن کے مخصوص بندوں کی جو مختلف صفات اور علامات بیان کی گئی ہیں ان میں سے ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے: ''وہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ ہی بخل کرتے ہیں بلکہ اعتدال سے کام لیتے ہیں نہ ضرورت سے زیادہ نہ کم۔''

(الفرقان : ٦٧)

جو لوگ بخل کی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں وہ حقوقِ واجبہ بھی ادا نہیں کرتے، والدین ہوں یا قریبی عزیز اور بھائی بہن، غرباء اور مساکین ہوں یا ان کے اپنے اہل وعیال، کسی پر بھی خرچ کرنے میں انہیں اپنی موت دکھائی دیتی ہے، ان کا ہاتھ تو بس لینے کے لئے کھلتا ہے، دینے کے لئے نہیں، وہ اپنے گردوپیش میں اپنے ہی جیسے انسانوں کو فقر وفاقہ کی وجہ سے بھوکے مرتے دیکھتے ہیں، ننگ دھڑنگ بچے لباس کی ایک ایک تار کے متلاشی ہوتے ہیں مگر بخیلوں کی انسانیت سوئی رہتی ہے، کفر کی یلغار ہو یا دفاعِ اسلام کی پکار، ان کی بلا سے، وہ مال ودولت کو بچا بچا کر رکھنا ہی اپنا کمال اور فرض سمجھتے ہیں۔

بخیلوں کے مقابلے میں مسرفین اور فضول خرچوں کا گروہ ہے، ان کی اپنی ہی نفسیات

اور خصوصیات ہیں، نمود ونمائش کا جذبہ خون کی طرح ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہوتا ہے۔ ان کے اندر اخلاص کا نام ونشاں نہیں ہوتا، موقع خوشی اور شادی کا ہو یا غمی اور ماتم کا، وہ دونوں ہاتھوں سے دولت لٹاتے ہیں۔

بھلا سوچئے جس کے سر سے ماں یا باپ کا سایہ اٹھ جائے، یا جو اپنے ہاتھوں سے اپنے کسی لختِ جگر یا نورِ چشم کا جسم مٹی کے حوالے کر رہا ہے یہ آخر کون سا موقع ہوتا ہے اپنی دولت و ثروت کی نمائش کا، لیکن مسرف اور فضول خرچ اس ''زرّیں موقع'' کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، یوں تو وہ بظاہر سب کچھ ''ایصالِ ثواب'' کے نام پر کرتا ہے، لیکن اصل مقصد ثروت وغنا کی نمائش ہوتا ہے، اگر واقعی ایصالِ ثواب پیش نظر ہوتا تو غرباء ومساکین اور مساجد ومدارس میں اس طرح خرچ کیا جاسکتا تھا کہ دائیں سے دیا جاتا مگر بائیں کو خبر نہ ہوتی۔

یہاں یہ جان لینا بھی مناسب ہے کہ لذیذ کھانا کھانے اور اچھا لباس پہننے کا نام فضول خرچی نہیں، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے مزاج اور طبائع مختلف بنائے ہیں، بعض لوگوں کا ذوق ایسا ہوتا ہے کہ وہ عمدہ غذا کھاتے اور اچھا لباس پہنتے ہیں، ویسے بھی اللہ نے دیا ہو تو اس کا اثر لباس اور رہن سہن میں نظر آنا چاہئے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص حد سے تجاوز کیے بغیر طعام اور لباس میں خوش ذوقی کا ثبوت دے تو اسے اسراف نہیں کہا جائے گا۔

سننِ نسائی میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کھاؤ اور صدقہ کرو اور پہنو مگر اسراف اور تکبر نہیں ہونا چاہئے۔'' (النسائی : ۷۹)

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی ہمدرد مربّی اور معلّم تھے۔ آپ صحابہ کو کم کھانے کی تلقین کیا کرتے تھے اور بہت زیادہ کھانے کو اسراف بتاتے تھے، آپ فرماتے تھے کہ مومن پیٹو نہیں ہوسکتا وہ تو بس بقدرِ ضرورت ہی کھاتا ہے، ہر وقت کھانے پینے میں لگے رہنا اور حد

سے زیادہ کھانا کافر کی عادت ہے، مسلمان کا شیوہ نہیں۔

وضو جو کہ نماز کی کنجی اور حصولِ طہارت کا ذریعہ ہے اس میں بھی آپ کم پانی استعمال کرنے پر زور دیتے تھے۔ تین بار سے زیادہ اعضاء دھونے والے کے بارے میں آپ نے فرمایا: ''اس نے برا کیا، حد سے تجاوز کیا اور ظلم کیا۔'' (النسائي : ۱/۸۸)

اب ایک طرف اسلامی تعلیمات دیکھیں اور دوسری طرف اپنی قومی اور معاشرتی زندگی کا جائزہ لیں، وہ کونسا شعبہ اور کونسا موقع ہے جہاں اسراف نہیں پایا جاتا، آپ نے دیکھا ہوگا کئی نمازی وضو کرنے کے لئے نل کھول کر بیٹھ جاتے ہیں، پھر مزے مزے سے باتیں کرتے رہتے ہیں اور پانی ضائع ہوتا رہتا ہے، حالانکہ مساجد میں جو پانی ہوتا ہے وہ وقف کا ہوتا ہے، اس کا ضائع کرنا ویسے بھی جائز نہیں، کئی گھرانوں میں ٹنکی بھرنے کے بعد پانی بہتا رہتا ہے مگر وہ وال بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے حالانکہ ان کے بھائی بہن پانی کی بوند بوند کو ترس رہے ہوتے ہیں۔

شادی ہالوں میں اور ہر روز گھروں میں کتنا کھانا کچرے کے ڈھیر کی نذر ہوتا ہے، اس کا حساب کون دے گا جبکہ بے شمار مسلمان لقمے لقمے کے لئے تڑپ رہے ہوتے ہیں، پھر شادی بیاہ اور دوسری تقریبات میں اکثر خواتین شرکت کے لئے جو نئے نئے جوڑے سلواتی ہیں کیا یہ اسراف نہیں؟ خواتین ایسی نازک مزاج اور ''باذوق'' بلکہ بے ذوق بھی ہوتی ہیں جو پہلی تقریب میں پہنا گیا جوڑا دوسری تقریب میں پہننا اپنی توہین سمجھتی ہیں۔

اے قارئین وقاریات! بہت باریک بینی سے اپنی زندگی کا جائزہ لیجئے! کہیں آپ بھی تو اسراف میں مبتلا نہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر اپنی اصلاح کی کوشش کیجئے!

وہ بشر تھیں مگر......

یقیناً وہ بشر تھیں، فرشتہ نہ تھیں، بشری تقاضے اور عوارض ان کے ساتھ بھی لگے ہوئے تھے، ان میں سے کوئی یہودی کے گھر میں پیدا ہوئی اور اکثریت نے بت پرست والدین کے گھر میں آنکھ کھولی اور وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا جو زمانہ جاہلیت سے ہوتا چلا آرہا تھا، مکہ میں توحید کا نعرہ ان کے سامنے ہی لگایا گیا تھا، پھر عقیدہ توحید کی دعوت پر لبیک کہنے والوں کے ساتھ جو کچھ ہوا اس سے بھی وہ ناواقف نہ تھیں۔

حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا نے ان کے سامنے ہی جام شہادت نوش کیا تھا، زنیرہ رضی اللہ عنہا اور ام عبیس رضی اللہ عنہا جیسی بے سہارا لونڈیوں کی دل ہلا دینے والی چیخیں بھی انہوں نے سنی ہوں گی، اگر سنی نہ بھی ہوں تو ان سے وہ باخبر ضرور تھیں، شاید انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ ایک دن ہم بھی حریمِ نبوت میں شمار ہوں گی، جب وہ دامنِ نبوت سے وابستہ ہوگئیں تو رشکِ شمس وقمر بن گئیں۔ بلاشبہ انہوں نے وہ کچھ دیکھا جو کوئی دوسرا نہ دیکھ سکا، وہ کچھ سنا جو کوئی دوسرا نہ سن سکا، ان کے گوش ونگاہ کے بے مثل ہونے میں شک ہی کیسے ہوسکتا ہے، انہیں بلاشرکتِ غیرے یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ جن وانس اور کون ومکان کے مالک نے ان سے براہِ راست خطاب فرمایا، ارشاد ہوا: ”اے پیغمبر کی بیویو! تم دوسری عورتوں کی طرح نہیں ہو۔“ (الاحزاب : ۳۲)

وہ پوری امت کی روحانی مائیں ہیں، ایسی مائیں جن کے قدموں پر لاکھوں حقیقی ماؤں کو قربانی کیا جاسکتا ہے، ان میں سے اکثر لاولد تھیں شاید اس لئے کہ حکیم وخبیر مولیٰ نے انہیں جسمانی کی بجائے روحانی اولاد دینے کا فیصلہ کرلیا تھا، معلوم دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں ان کی اولاد موجود نہ ہو، امہات المؤمنین، انسانیت کے چہرے کا جھومر اور طبقۂ

نسوانیت کے لئے سرمایۂ افتخار تھیں۔

وہ عورت جسے گھر کا اثاثہ، شیطان کی ایجنٹ، لعنتِ ابدی کی مستحق، باغِ انسانیت کا کانٹا، دل بہلانے کا سامان اور شہوانی تقاضوں کی تکمیل کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، امت کی ماؤں نے اپنے کردار وعمل سے دیمک خوردہ ذہنوں سے پرانے تصورات کھرچ کر عورت کا نیا تصور ذہنوں میں اجاگر کیا، اس تصور کے مطابق عورت دنیا کی سب سے بہترین متاع ہے، ایمان کے نور میں مستور معلّم ہے، پتھر کو ہیرا بنانے والی مربیہ ہے، متلاشیانِ علم کی رہبری کرنے والی مفتیہ اور مرشدہ ہے، لشکرِ کفار کے سامنے کوہِ استقامت ثابت ہونے والی مجاہدہ ہے، طب اور جراحی میں نام پیدا کرنے والی طبیبہ ہے، تاریخ وادب میں نام پیدا کرنے والی ادیبہ ہے، کتاب وسنت کے مخفی حقائق ظاہر کرنے والی مفسرہ اور محدثہ ہے۔

موقع نہیں کہ ان کا تفصیلی تذکرہ کیا جائے، آیئے! انکی زندگی پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے چلیں کہ ان کی سیرت کے مطالعہ سے ایمان تازہ ہوتا ہے اور جذبۂ خیر کو جلا ملتی ہے۔

☆ یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منصبِ نبوت پر فائز ہوئے تو سب سے پہلے انہوں نے ہی ایمان قبول کیا نہ شک نہ تردد، نہ توقف نہ انتظار، صرف ایمان ہی قبول نہ کیا، دعوتِ ایمان کی اشاعت میں اپنی ساری دولت بھی وقف کردی، شعبِ ابی طالب کی تین سالہ سخت ترین آزمائش میں وہ ساتھ رہیں، پائے استقامت میں ذرہ بھی لغزش نہ آئی، ابن ہشام نے بجا لکھا ہے: ''وہ اسلام کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی مشیرِ کار تھیں۔''

حضرت جبرائیل علیہ السلام ان کے لئے آسمانوں سے اللہ کا سلام لائے تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب دن بھر مشرکین کی جھڑکیاں اور گالیاں سن کر دل شکستہ گھر تشریف لاتے تو تسلی اور تشفی کا سامان وہی کرتی تھیں، ان کی وفات سے آپ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ

ان کی جدائی کے سال کا نام ہی ''عام الحزن'' (غم کا سال) رکھ دیا گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھرپور جوانی انہی کے ساتھ گزاری اور جب تک وہ زندہ رہیں آپ نے کسی دوسری خاتون کو شرفِ زوجیت نہیں بخشا۔

☆ یہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا ہیں، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد سب سے پہلے وہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقدِ نکاح میں آئیں، ان کا نمایاں وصف اطاعت وفرمانبرداری تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ازواج مطہرات کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ میرے بعد گھر میں بیٹھنا، چنانچہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے اس حکم پر شدت سے عمل کیا کہ کبھی حج کے لئے نہ نکلیں، فرماتی تھیں کہ میں حج اور عمرہ دونوں کر چکی ہوں اور اب خدا کے حکم کے مطابق گھر میں بیٹھوں گی، سخاوت اور فیاضی بھی ان کا ایک نمایاں وصف تھا۔

☆ یہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں، آپ اسلام کی ان برگزیدہ شخصیتوں میں ہیں جن کے کانوں نے کبھی کفر وشرک کی آواز نہیں سنی، ان کی ولادت سے قبل ہی ان کے گھر میں ایمان کا نور پرتو فگن ہو چکا تھا، جب منافقین نے ان کے دامنِ عصمت کو داغدار کرنا چاہا تو آپ کی صفائی اور برأت کا اعلان خود اللہ تعالیٰ نے کیا۔ قرآن، فرائض، حلال و حرام، فقہ، شاعری، طب، عرب کی تاریخ اور نسب کا عالم ان سے بڑا کوئی نہ تھا، صحابہ کو جب کوئی مشکل بات پیش آتی تو وہ آپ ہی کا دروازہ کھٹکھٹایا کرتے اور یہاں سے انہیں خالی ہاتھ لوٹنا نہیں پڑتا تھا، علوم ومعارفِ نبوّت امت تک پہنچانے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

☆ یہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا ہیں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی، صائم النہار اور قائم الیل تھیں، انتقال کے وقت بھی روزے سے تھیں، دجّال سے بہت ڈرتی تھیں، سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید محبت کرتی تھیں، باوفا اور محبت کرنے والی

بیوی کی طرح ان کی بھی آرزو اور کوشش یہ ہوتی تھی کہ مجھے اپنے عظیم شوہر کی توجہ اور محبت حاصل رہے۔

☆ یہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہیں، فقراء ومساکین کے ساتھ محبت اور انہیں کھانا کھلانے کی وجہ سے امّ المساکین کی کنیت سے مشہور ہوگئی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو تین مہینے رہنے پائی تھیں کہ ان کا انتقال ہوگیا۔

☆ یہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ہیں، آغازِ نبوت ہی میں ایمان لے آئی تھیں، کامل العقل اور صائب الرائے تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز پر قرآن پڑھ سکتی تھیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بعد صحابہ میں انہی کے فتاویٰ زیادہ مشہور تھے، ان کے فتاویٰ کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ عموماً متفق علیہ ہیں اور یہ ان کی دقیقہ رسی اور نکتہ سنجی کا کرشمہ ہے، بڑے بڑے صحابہ اور تابعین نے ان سے علمِ حدیث حاصل کیا، انہیں حدیث و فقہ کے علاوہ اسرار کا بھی علم تھا، ان کی زندگی نہایت زاہدانہ تھی ایک مرتبہ ایک ہار پہنا جس میں سونے کا کچھ حصہ شامل تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعراض کیا تو اس کو توڑ ڈالا۔

☆ یہ حضرت زینب بنتِ جحش رضی اللہ عنہا ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ ان کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رائے یہ ہے: ”میں نے کوئی عورت زینب سے زیادہ دیندار، زیادہ پرہیزگار، زیادہ راست گفتار، زیادہ فیاض، مخیّر اور خدا کی رضا جوئی میں زیادہ سرگرم نہیں دیکھی، فقط مزاج میں ذرا تیزی تھی جس پر ان کو بہت جلد ندامت بھی ہوتی تھی، نہایت قانع اور فیاض طبع تھیں، خود اپنے دست و بازو سے معاش پیدا کرتی تھیں اور اسے اللہ کی راہ میں لٹا دیتی تھیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب حضرت زینب کا انتقال ہوا تو مدینہ کے فقراء اور مساکین میں سخت کھلبلی پیدا ہوگئی۔

☆ یہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا ہیں، ان کی زندگی زہد و قناعت اور عبادت و ریاضت سے عبارت تھی، جب رب العالمین کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھتے تو ان پر ایک خاص کیف طاری ہو جاتا اور وہ گرد و پیش بلکہ اپنے آپ سے بھی بے نیاز ہو جاتیں، ایک دن صبح کو مسجد میں دعاء کر رہی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گزرے اور دیکھتے ہوئے چلے گئے، دو پہر کے قریب آئے تب بھی ان کو اسی حالت میں پایا۔

☆ یہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ہیں، ایمان کا ایسا جوش اور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی محبت تھی کہ جب ان کے والد ابوسفیان (حالتِ کفر میں) ان کے گھر آئے اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بچھونے پر بیٹھنا چاہا تو حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے بچھونا الٹ دیا اور فرمایا آپ مشرک ہیں اور اس بناء پر ناپاک ہیں اس لئے اس فرش پر نہیں بیٹھ سکتے، ابوسفیان نے کہا تو میرے پیچھے بہت بگڑ گئی ہے۔

☆ یہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ہیں، یہ عجیب اتفاق ہے کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان مقام سرف میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ہوا، یہیں رخصتی ہوئی اور یہیں ان کا انتقال ہوا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان کے بارے میں فرماتی ہیں کہ ''ہم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے اور صلہ رحمی کرنے والی تھیں۔''

☆ یہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ہیں، نہایت عاقلہ، فاضلہ اور حلیم الطبع تھیں، سیر چشم اور فیاض واقع ہوئی تھیں، انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اور حضور کو ان سے نہایت محبت تھی، آپ ہر موقع پر ان کی دلجوئی فرماتے تھے، بعض صحابیات نے انہیں یہودی کی بیٹی ہونے کا طعنہ دیا وہ رونے لگیں، حضور نے دیکھا تو فرمایا: تم نے یہ کیوں نہ کہا کہ ''ہارون علیہ السلام میرے باپ، موسیٰ علیہ السلام میرے چچا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے شوہر ہیں تو مجھ سے افضل کون ہو سکتی ہے؟''

آپ نے اس اچٹتی نظر سے بھی محسوس کیا ہوگا کہ بلاشبہ وہ بشر تھیں، مگر دامنِ رسالت سے وابستہ ہونے کے بعد انہوں نے اپنے جذبات واحساسات کو اللہ اور رسول کی تعلیمات کے تابع کرلیا، وہ سر سے پاؤں تک ''اسلام'' تھیں، تسلیم وانقیاد اور دعوت وجہاد ان کی زندگی کا حصہ بن گیا تھا، قیامت تک آنے والے مرد وزن ان کے معنوی بیٹے اور بیٹیاں ہیں، وفادار اولاد اپنی ماؤں کا دل نہیں دکھایا کرتی، اسلام سے سچا تعلق کرنے سے ان کی روحیں خوش ہوں گی اور دوری اختیار کرنے سے ان کے دل دکھیں گے۔

آیئے! ہم عہد کریں کہ اپنی ماؤں کا دل کبھی نہیں دکھائیں گے۔

بدعت

علامہ عینی حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''بدعت'' اصل میں ایسی نو ایجاد چیز کو کہتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھی، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''بدعت اصل میں اس چیز کو کہا جاتا ہے جو بغیر کسی سابق مثال اور نمونہ کے ایجاد کی گئی ہو اور شریعت میں بدعت کا اطلاق سنت کے مقابلہ میں ہوتا ہے، لہٰذا وہ مذموم ہوگی۔''

حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''بدعت ان چیزوں کو کہتے ہیں جن کی اصل شریعت سے ثابت نہ ہو یعنی قرآن مجید اور احادیث شریف میں اس کا ثبوت نہ ملے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اور تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں اس کا وجود نہ ہو اور اسے دین کا کام سمجھ کر کیا یا چھوڑا جائے۔''

قرآن کریم میں بدعت کا ذکر صرف سورۂ حدید کی آیت ۲۷ میں آیا ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:
''انہوں نے خود رہبانیت کی نئی بات نکال لی ہم نے ان کو اس کا حکم نہیں دیا تھا مگر انہوں نے اپنے خیال میں اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے آپ ہی ایسا کر لیا تھا پھر جیسا اس کو نباہنا چاہئے تھا نباہ بھی نہ سکے''۔

رہبانیت، ترکِ دنیا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، عیسائی راہبوں نے یوں تو اللہ کی رضا کے لئے ترکِ دنیا کا راستہ اختیار کیا تھا، ان میں سے کوئی صحراؤں میں جا بسا، کسی نے غاروں کو اپنا مسکن بنالیا، کسی نے مرغن اور لذیذ کھانوں اور اہل وعیال سے کنارہ کشی اختیار کرلی، لیکن نہ تو اللہ نے انہیں اس کا حکم دیا تھا اور نہ ہی وہ خود اس ایجادِ بندہ بدعت کی رعایت کر سکے، چونکہ یہ عمل انسانی فطرت کے خلاف تھا اس لئے ہمارے آقا صلی اللہ علیہ

وسلم نے واضح طور پر اعلان فرمادیا کہ ''اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔''

احادیث میں بدعت کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی قباحتیں بھی بیان فرمائی ہیں اور مسلمانوں کو واضح الفاظ میں اس سے بچ کر رہنے کی تاکید بھی فرمائی ہے''۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ ہر بدعتی کو توبہ سے محروم کردیتا ہے۔'' (الترغیب والترھیب : ۸۶/۱)

بدعتی کو توبہ سے محروم کردینا گویا اس کے گناہ کی نقد اور شدید ترین سزا ہے، عقوبت اور سزا کے علاوہ بدعتی کے توبہ سے محروم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسان توبہ اسی عمل سے کرتا ہے جسے وہ گناہ سمجھتا ہو جبکہ بدعتی بدعت کو گناہ نہیں سمجھتا بلکہ ایسا عمل سمجھتا ہے جو اس کی غلط سوچ کے مطابق اللہ کی رضا اور جنت کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے، یہ شیطان کی طرف سے لوگوں کو توبہ سے محروم رکھنے کا بڑا مؤثر حربہ ہے کہ اس نے بظاہر اچھے خاصے سمجھدار اور دیندار انسانوں کو ایسے اعمال میں مبتلا کردیا جو اللہ کے غضب کو دعوت دینے والے ہیں، لیکن وہ ان اعمال کو رضاءِ الٰہی کے حصول کا ذریعہ سمجھ کر بجالاتے ہیں، ان اعمال میں بے تحاشہ دولت بھی خرچ کرتے ہیں اور وقت بھی ضائع کرتے ہیں، پھر یہ کہ ان فضول اعمال کو عینِ شریعت ثابت کرنے کے لئے جسم وجان اور قلم اور زبان کی ساری توانائیاں صرف کردیتے ہیں، ان کی ہٹ دھرمی اور ضد وعناد کی وجہ سے اختلافات جنم لیتے ہیں جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو تاکید فرمائی تھی کہ جب اختلاف وانتشار دیکھو تو بدعات سے اپنا دامن بچا کر میری سنت اور خلفاءِ راشدین کی سنّت کو لازم پکڑلینا۔

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی اور نماز کے بعد ہمیں انتہائی مؤثر اور بلیغ وعظ ارشاد فرمایا، جس

کی وجہ سے آنکھیں چھلک پڑیں اور دل دہل گئے، ایک کہنے والے نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ تو کسی رخصت کرنے والے کا وعظ محسوس ہوتا ہے تو آپ ہمیں اس موقع پر کیا وصیت فرماتے ہیں، آپ نے فرمایا: میں تمہیں وصیت کرتا ہوں اللہ سے ڈرنے کی، سننے کی اور اطاعت کرنے کی اگر چہ (تمہارا امیر) کوئی حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ تم میں سے جو کوئی زندہ رہے گا وہ میرے بعد بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا، ایسے وقت میں تم پر لازم ہے کہ تم میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ اور راہِ راست پر چلنے والے خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے تھام لو اور اسے دانتوں سے پکڑ لو اور تمہیں (دین کے نام سے نکالی گئی) نئی نئی باتوں سے بچ کر رہنا ہوگا، کیونکہ ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

(ابو داوٗد: ٤٦٩٧ ترمذی: ٢٦٧٦)

بدعتی ایسا بدنصیب انسان ہے کہ قیامت کے دن جب ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم حوضِ کوثر پر اپنی امت کو جام بھر بھر کر پلا رہے ہوں گے، بدعتی اس بے مثال مشروب سے محروم رہے گا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں تم سے پہلے حوض پر ہوں گا، تم میں سے کچھ لوگ میرے سامنے لائے جائیں گے پھر انہیں مجھ تک پہنچنے سے روک لیا جائے گا، میں کہوں گا، یا رب! یہ تو میرے اصحاب ہیں، تو مجھ سے کہا جائے گا، آپ نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کچھ کیا (اور کیا کیا بدعتیں گھڑتے رہے) (بخاري: ٦٥٧٦)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دین کے بارے میں اتنے حساس تھے کہ وہ جب سنت سے ذرا سا انحراف بھی دیکھتے تھے تو چونک اٹھتے تھے اور اس پر سخت تنقید کرتے تھے، انہیں یہ خدشہ لاحق ہو جاتا تھا کہ کہیں یہ بدعات، دین کا حلیہ نہ بگاڑ دیں، اس بگاڑ کی وجہ سے بعد میں آنے والوں کے لئے اصل اور نقل، سنت اور بدعت میں فرق کرنا مشکل ہو جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے ایک جماعت کو مسجد سے محض اس لئے نکال دیا تھا کہ وہ بلند آواز سے لا الہ الا اللہ اور بلند آواز سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھتی تھی اور فرمایا کہ میں تمہیں بدعتی خیال کرتا ہوں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ان الفاظ سے مروی ہے: ''ایک شخص نے عید کے دن نمازِ عید سے پہلے نفل نماز پڑھنی چاہی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو منع کیا۔ اس نے کہا اے امیر المؤمنین! میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے نماز پڑھنے پر سزا نہ دے گا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اور میں بالیقین جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کسی فعل پر ثواب نہ دے گا جب تک کہ اس فعل کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کیا ہو، یا اس کی ترغیب نہ دی ہو پس تیری یہ نماز فعلِ عبث ہوگی اور فعلِ عبث حرام ہے اور شاید کہ تجھے اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی مخالفت کی وجہ سے سزا دے۔

نماز اتنی عظیم عبادت ہے کہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک، مومن کی معراج اور دین کا ستون قرار دیا ہے مگر چونکہ عید سے قبل نفلی نماز پڑھنا آپ سے ثابت نہیں اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس شخص پر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

اس واقعہ سے ان لوگوں کو سبق حاصل کرنا چاہئے جو دین کے نام پر جو دل میں آتا ہے کرتے رہتے ہیں، مختلف دنوں، راتوں، تہواروں اور تقریبات میں انہوں نے عجیب و غریب بدعات ایجاد کر رکھی ہیں، جن کا نہ قرآن سے ثبوت ہے نہ حدیث سے نہ صحابہ سے اور نہ ہی ائمہ دین سے، پھر طرفہ تماشا یہ کہ ان بدعات پر وہ لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اللہ کی پناہ!

اتباعِ ھویٰ

''اتباعِ ھویٰ'' کا معنی ہے نفس کی خواہشات کی اتباع، جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے باغی ہو کر نفس کی خواہشات اور ترغیبات کے پیچھے لگ جاتا ہے اس کی نظروں میں ہر برا عمل مزین ہو جاتا ہے، خواہ ترکِ نماز ہو یا جھوٹ اور فراڈ، رشوت اور سود خوری ہو یا چوری چکاری اور ظلم وستم، خواہشات کا غلام حقیقت میں اپنے نفس کا پجاری اور بندہ ہوتا ہے۔

سورۂ فرقان میں ہے: ''کیا آپ نے اسے بھی دیکھا جو اپنی خواہش نفس کو معبود بنائے ہوئے ہے۔'' (سورة الفرقان : ٤٣) سورۂ فاطر میں ہے ''کیا وہ شخص جس کیلئے اسکا برا عمل مزین کر دیا گیا پس وہ اسے اچھا سمجھتا ہے پس اللہ تعالیٰ ہی جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے پس تو ان پر حسرت اور افسوس نہ کر''۔

(سورة الفاطر : ٣٥)

جس انسان پر خواہشات مسلّط ہو جائیں وہ اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے، بسا اوقات وہ حیوانوں کی صف میں جا کھڑا ہوتا ہے کیونکہ اس کی ہر سوچ کا محور لذت اور شہوت بن جاتی ہے اس کے اندر غیرت اور حیا کم ہو جاتی ہے اسے فواحش اور برائیوں کے ارتکاب میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی، اسے اللہ کے نیک بندوں سے وحشت محسوس ہوتی ہے، اہلِ علم سے وہ نفرت کرتا ہے، جاہلوں اور بدکاروں سے محبت ہو جاتی ہے اور لذتوں کی محبت اسے کسبِ اموال پر آمادہ کرتی ہے، خواہ حرام طریقے سے ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے لئے غصب ونہب دوسروں سے چھینا جھپٹی، خیانت اور بددیانتی آسان ہو جاتی ہے اس لئے کہ شکم اور فرج (پیٹ اور شرم گاہ) کی ساری لذتیں مال ومتاع کے بغیر پوری نہیں ہوتیں، تو جب خواہشات

کے بندے کو جائز طریقے سے مال حاصل نہیں ہوتا تو وہ اس کے لئے ناجائز ہتھکنڈے اختیار کرنے پر کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا، جس کی شہوت پرستی اس حد تک پہنچ جائے وہ ڈھورڈنگر کے مشابہ ہو جاتا ہے، شریف لوگ اس کے شر سے پناہ مانگتے ہیں اور کمزور انسان اس کی خباثت اور شرارت سے خوفزدہ رہتے ہیں۔

قرآن کریم کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانوں کی گمراہی میں ''اتباعِ ھویٰ'' نے بنیادی کردار ادا کیا ہے، جو انسان اپنی خواہشات کو اللہ اور رسول کی مرضیات کے تابع کردے، اس کے لئے روحانی بلندیوں اور ایمانی درجات کا راستہ کھل جاتا ہے لیکن جو کوئی ایسا نہ کر سکے بلکہ نفسانی لذتوں اور شیطانی بھول بھلیوں میں الجھا رہے اسے کبھی بھی رفعت اور ترقی حاصل نہیں ہو سکتی، خواہ وہ کتنا بڑا عالم ہی کیوں نہ ہو۔

بنی اسرائیل میں ایک بہت بڑا عالم تھا جس کا نام بلعم بن باعوراء بتایا گیا ہے اسے نفسانی خواہشوں نے اپنا غلام بنالیا، نتیجہ یہ نکلا کے بدترین پستیوں میں جا گرا اور قرآن کریم میں اس کا تذکرہ انتہائی قابل نفرت انداز میں کیا گیا، سورۂ اعراف میں ہے: ''اور اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کی بدولت بلندی عطا کردیتے لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہو گیا اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کرنے لگ گیا سو اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی کہ اگر تو اس پر حملہ کرے تب بھی ہانپے یا اس کو چھوڑ دے تب بھی ہانپے۔'' (الاعراف: ۱۷٦)

یہ صرف بلعم بن باعوراء کا معاملہ نہیں ہے بلکہ جو کوئی بھی نفس کی غلامی میں مبتلا ہو جائے گا اس پر یہ آیت کریمہ صادق آئے گی۔ نفسانی خواہشات میں سے بدترین خواہشات شکم اور فرج کی شہوات ہیں۔

مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ اندیشہ پیٹ اور شرمگاہ کے حوالے سے ہے۔

(مسند احمد : ٤/ ٤٢٣،٤٢٠)

کیا نظر تھی ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی، آج پوری امت پر نظر ڈالیں تو ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ شکم اور فرج کی غلامی ہی ہے جس نے ہمیں صراطِ مستقیم سے دور ہٹا دیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ بڑے درد اور پیار سے مسلمانوں کو سمجھایا کرتے تھے، فرماتے تھے: ''لوگو! مجھے ڈر ہے کہ تم طولِ امل (لمبی زندگی کی امید) اور اتباعِ ھویٰ کی بیماری میں مبتلا ہو جاؤ گے، طولِ امل آخرت فراموشی کا سبب بنے گی اور اتباعِ ھویٰ حق کی پیروی سے محروم کر دے گی، سن لو دنیا تو پیٹھ پھیر کر جا رہی ہے اور آخرت آرہی ہے دنیا اور آخرت دونوں کے بیٹے ہیں، تم آخرت کے بیٹے بنو، دنیا کے بیٹے نہ بنو، کیونکہ آج عمل ہے مگر حساب نہیں اور کل حساب ہوگا مگر عمل کی مہلت باقی نہیں رہے گی۔''

(فضائل الصحابہ للإمام احمد : ١/ ٥٣٠)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ حضرت! کیا اہلِ قبلہ میں بھی شرک ہو سکتا ہے؟ فرمایا: ہاں! منافق بھی مشرک ہوتے ہیں کیونکہ مشرکین اللہ کو چھوڑ کر شمس وقمر کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں جبکہ منافق اپنی خواہشات کی پرستش کرتے ہیں، پھر انہوں نے وہ آیت کریمہ پڑھی جس کا مفہوم یہ ہے: ''کیا آپ نے اسے بھی دیکھا جو اپنی خواہش نفس کو معبود بنائے ہوئے ہے۔'' (الاضواء : ٦/ ٣٣٠)

حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ کا ارشاد ہے: ''مخلوق پر چھ وجہ سے فساد آیا ہے:

١- آخرت کے اعمال کے بارے میں نیت اور اعتقاد کی کمزوری

٢- ان کے بدن ان کی خواہشات کی سواری بن گئے ہوں

٣- چھوٹی سی عمر ہے مگر ان پر طول امل غالب آ گئی ہے

۴- مخلوق کی رضا کو اللہ کی رضا پر ترجیح دیتے ہیں
۵- اپنی خواہشات کی اتباع کرتے ہیں اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو انہوں نے چھوڑ رکھا ہے
٦- سلف کی لغزشوں کو اپنے لئے محبت بنا لیتے ہیں اور انکے اکثر مناقب کو دفن کر دیتے ہیں۔"

(الاعتصام : ١/ ٦٨)

امام ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "سارے گناہوں کا سبب نفسانی خواہشات کو اللہ اور اس کے رسول کی محبت پر ترجیح دینا ہے، اللہ نے اپنی کتاب میں کئی جگہ مشرکوں کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ اپنی خواہشات کی اتباعِ کرتے ہیں اس طرح بدعات کا سبب بھی یہی ہے کہ خواہشات کو شریعت پر مقدم رکھا جاتا ہے اسی لئے بدعیتوں کو "اہلِ ہواء" کہا جاتا ہے، جس شخص کی محبت اور نفرت، عطاء اور منع، نفسانی خواہش کی بناء پر ہو تو یہ چیز اس کے ایمان میں نقص کا سبب ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ اس سے توبہ کرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی طرف رجوع کرے اور نفسانی خواہشات سمیت ہر چیز پر اللہ اور اس کے رسول کی محبت اور مرضیات کو مقدم رکھے۔"

(جامع العلوم والحکم : ٣٦٦، ٣٦٧)

بخل

برے اخلاق میں سے ایک بدترین خلق بخل بھی ہے، یوں تو بخل کے کئی درجات ہیں لیکن بخل کا بدترین درجہ یہ ہے کہ انسان ضرورت کے باوجود اپنی ذات پر بھی خرچ نہ کرے، کتنے ہی بخیل ہوتے ہیں جو بیمار پڑ جاتے ہیں مگر روپیہ ہوتے ہوئے بھی علاج نہیں کرتے، ان کا لباس پھٹ جاتا ہے مگر نیا خریدنے کو ان کا دل نہیں چاہتا۔ ان کے اہل وعیال اور عزیز واقارب ضرورت مند ہوتے ہیں مگر ان پر ایک پائی بھی خرچ نہیں کرتے، دین اسلام کی اشاعت کے لئے انہیں پکارا جاتا ہے مگر وہ کبھی لبیک نہیں کہتے، انہیں کمانے، جمع کرنے اور بچا بچا کر رکھنے کا فن تو آتا ہے مگر خرچ کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ اندازہ کیجئے ان دو انسانوں کے درمیان کتنا تفاوت (فرق) ہے جن میں سے ایک کا حال یہ ہے کہ وہ ذاتی ضروریات دبا کر دوسروں پر خرچ کرنے میں سکون محسوس کرتا ہے، صحابہ کرام کے اندر یہی صفت پائی جاتی تھی، رب تعالیٰ سورۂ حشر میں ان کے ایثار کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''وہ خود اپنے اوپر انہیں ترجیح دیتے ہیں اگرچہ ان کو کتنی ہی سخت حاجت ہو۔'' (الحشر : ۹)

اصحاب ایثار کے مقابلے میں بخیلوں کی سخت الفاظ میں مذمت کی گئی ہے، سورۃ آل عمران میں ہے ''جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے کچھ دے رکھا ہے وہ اس میں بخل کو اپنے لئے بہتر خیال نہ کریں بلکہ وہ ان کے لئے نہایت بدتر ہے، عنقریب قیامت والے دن انہیں اپنے بخل کی چیز کے طوق ڈالے جائیں گے۔'' (الِ عمران : ۱۸۰)

بعض ایسے ساہ دل بھی ہو ۔ ہیں جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی تلقین کرتے رہتے ہیں اور اللہ نے انہیں اپنی جن نعمتوں سے نوازا ہوتا ہے انہیں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ لوگ انہیں فقیر اور غریب سمجھیں۔ سورۂ نساء میں ایسے سیاہ دلوں

کے بارے میں کہا گیا: ''جو لوگ خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کرنے کو کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جو اپنا فضل انہیں دے رکھا ہے اسے چھپا لیتے ہیں ہم نے ان کافروں کے لئے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔'' (سورة النساء : ٣٧)

بخل چونکہ بدترین خلق ہے اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کثرت سے یہ دعاء مانگتے ہوئے سنا: ''اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں فکر اور غم سے، عاجز آنے اور سستی سے، بخل اور بزدلی سے، قرض کے بوجھ اور انسانوں کے تسلط اور غلبے سے۔'' (البخاري : ٢٨٩٣ ، مسلم : ٢٧٠٦)

مسند احمد میں ایک بڑا پُر لطف واقعہ مذکور ہے، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا کہ فلاں شخص کا میرے باغ میں ایک درخت ہے مجھے (اس کے بار بار آنے سے) تکلیف ہوتی ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعلقہ شخص کو بلا کر فرمایا کہ فلاں کے باغ میں جو تمہارا درخت ہے، وہ مجھے بیچ دو، اس نے انکار کر دیا، آپ نے فرمایا: چلو مجھے ہبہ کر دو، اس نے کہا ہبہ بھی نہیں کروں گا، آپ نے فرمایا جنت میں اس کے بدلے درخت لے لینا، اس نے اس پیشکش کو بھی منظور نہ کیا تو آپ نے فرمایا ''میں نے تجھ سے بڑا بخیل کوئی نہیں دیکھا سوائے اس شخص کے جو سلام کرنے میں بھی بخل کرتا ہو''۔ (مسند احمد : ٣٢٨/٣)

سلام کا جواب نہ دینے والے کی طرح آپ نے اس شخص کو بھی بہت بڑا بخیل قرار دیا ہے جسے آپ پر درود شریف پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں ایک دن گھر سے نکل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے فرمایا: کیا میں تمہیں انسانوں میں سے سب سے بڑے بخیل کے بارے میں نہ

بتاؤں؟ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ضرور بتائیں آپ نے فرمایا: ''جس شخص کے سامنے میرا ذکر ہو لیکن وہ مجھ پر درود شریف نہ پڑھے تو یہ انسانوں میں سے سب سے بڑا بخیل ہے۔'' (ذكره السخاوي في القول البديع الصلاة على الحبيب الشفيع)

اس میں شک ہی کیا ہے کہ آپ نے جو کچھ فرمایا وہی سچ ہے، اس لئے کہ عالمِ انسانیت کے سب سے بڑے محسن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپ کے احسانات بے شمار ہیں، ان احسانات کا بدلہ اور تو ہم کیا دے سکتے ہیں کم از کم درود شریف تو پڑھ سکتے ہیں بالخصوص جب آپ کا نام نامی ہمارے سامنے ذکر کیا جائے تب تو ہدیہ درود آپ پر ضرور بھیجنا چاہئے۔ وہ شخص کتنا حرماں نصیب ہے جسے آپ کا اسمِ گرامی سن کر بھی زبان ہلانے کی توفیق نہیں ہوتی۔

جو شخص مالی استطاعت کے باوجود اپنے غریب رشتہ داروں پر خرچ نہیں کرتا، حدیث میں اسی کی سخت مذمت بیان کی گئی ہے اور اسے وعید بھی سنائی گئی ہے، جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اپنے کسی رشتہ دار کے پاس آئے اور اس سے اللہ کے عطا کردہ فضل کا سوال کرے مگر وہ بخل کرتے ہوئے انکار کردے تو اللہ اس کے لئے قیامت کے دن دوزخ سے ایک (مخصوص قسم کا) سانپ نکالے گا جس کا نام ''شجاع'' ہوگا پھر یہ سانپ اس بخیل کے گلے میں طوق کے طور پر ڈال دیا جائے گا۔'' (رواه الطبراني في الأوسط: ۱۵٤/۸)

اللہ کی نظر میں بخیل کتنا رذیل اور قابل نفرت ہے؟ اس کا اندازہ طبرانی کی اس روایت سے ہوتا ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے جنت عدن کو پیدا فرمایا تو اس میں ایسی نعمتیں پیدا فرمائیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں، نہ کسی کان نے سنیں اور نہ ہی کسی کے دل میں ان کے بارے میں گمان آیا، پھر جنت کو حکم دیا کہ کچھ بولو'' جنت بولی'' مومن کامیاب ہوگئے'' پھر اللہ نے

فرمایا: میری عزت کی قسم! تیرے اندر کوئی بخیل داخل ہو کر میرا قرب حاصل نہیں کر سکے گا۔

(الطبراني في الكبير : ۱۸٤/۱۱)

بخل کے بارے میں چند صحابہ اور مشائخ کے اقوال بھی ملاحظہ فرما لیجئے!

☆ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ’’بخل ذلت کی چادر ہے اور بسا اوقات سخی اپنی سخاوت کی وجہ سے جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔‘‘ (الآداب الشرعية : ۳۱۲/۳)

☆ حضرت محمد بن منکدر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کے (اپنے ہی اعمال کی وجہ سے اسکے) ساتھ برائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے بدترین لوگوں کو ان پر مسلط فرما دیتے ہیں اور ان کا رزق بخیلوں کے ہاتھ میں رکھ دیتے ہیں۔‘‘ (الاحیاء : ۲۵۵/۳)

حضرت بشر بن حارث رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’بخیل کی طرف دیکھنا دل میں قساوت پیدا کر دیتا ہے اور بخیلوں کی ملاقات ایمان والوں کے لئے حزن وملال کا سبب ہوتی ہے۔‘‘

(الاحیاء : ۲۵۵/۳)

آخر میں اجمالی طور پر بخل کے نقصانات پر نظر ڈال لیجئے!

۱۔ بخل ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔

۲۔ بہت سارے برے اخلاق کی بنیاد بخل پر ہے۔

۳۔ بخیل اللہ کی نظر میں مبغوض اور انسانوں کی نظر میں بھی قابلِ نفرت ہوتا ہے۔

۴۔ بخل، اللہ کے بارے میں بدگمانی کی علامت ہے۔

۵۔ بخل قلتِ عقل اور بدتدبیری کی دلیل ہے۔

۶۔ بخل کی وجہ سے مالک اور سردار بھی ذلیل ہو کر رہ جاتا ہے۔

۷۔ بخیل دنیا میں محروم اور پریشان رہتا ہے اور آخرت میں اس سے مؤاخذہ (گرفت) ہوگا۔ (نضرة النعيم : ٤٠٤٦/٩)

حرام روزی

حضرت ابوعبداللہ ناجی رحمہ اللہ کا انتہائی زریں اور عبرت آموز قول ہے، فرماتے ہیں کہ پانچ اوصاف کے پائے جانے سے عمل پورا ہوتا ہے: ''اللہ کی معرفت پر ایمان، حق کی معرفت، عمل کو خالص اللہ کے لئے کیا جائے، سنت کے مطابق عمل اور رزق حلال، اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو جائے تو عمل قبول نہیں ہوتا، اگر تمہیں اللہ کی معرفت حاصل ہو لیکن تم حق کی معرفت سے محروم ہو تو فائدہ نہیں ہوگا، اگر تم حق کی پہچان رکھتے ہو مگر معرفتِ باری تعالیٰ اور عمل میں اخلاص نہ ہو تو بھی فائدہ نہیں اور اگر یہ تینوں باتیں حاصل ہوں مگر عمل سنت کے مطابق نہ ہو تو بھی نافع نہیں اور اگر یہ چاروں شرائط پائی جائیں مگر انسان کی روزی حلال نہ ہو تو بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔'' (جامع العلوم والحکم: ۹۳)

ابن رجب رحمہ اللہ نے بھی اسی سے ملتی جلتی بات کہی ہے، فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو اور ان کی امتوں کو پاکیزہ اور حلال روزی کھانے اور عملِ صالح کا حکم دیا ہے، جب روزی حلال ہو تو عملِ صالح قبول ہوتا ہے اور اگر حلال روزی میسر نہ ہو تو عمل کیسے قبول ہوگا؟'' (جامع العلوم والحکم: ۹۲)

جیسے مختلف غذاؤں کے مادی اور حسی اثرات ہوتے ہیں، کوئی غذا جسم میں گرمی پیدا کرتی ہے اور کوئی سردی، کوئی رطوبت پیدا کرتی ہے اور کوئی خشکی، کوئی غذا طبعیت میں نشاط کا سبب بنتی ہے تو کوئی افسردگی کا سبب بنتی ہے، اسی طرح غذاؤں کے روحانی اور معنوی اثرات بھی ہوتے ہیں، قلب ودماغ، جذبات وخیالات اور اعمال وافعال سب ہی متاثر ہوتے ہیں یہاں تک کہ انسان کی اولاد بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔

اگر سامان خورونوش اور ذریعۂ معاش حرام اور ناپاک ہوگا تو دل سیاہ ہو جائے گا، اس پر

قساوت اور ظلمت چھا جائے گی، قبولِ ہدایت کی استعداد ختم ہو جائے گی، دماغ میں گندے خیالات پرورش پائیں گے، شیطانی وساوس اور شہوانی افکار کی یلغار ہوگی، اعمالِ خیر کی توفیق سلب ہو جائے گی، نیکی کا کرنا مشکل اور بدی کا کرنا آسان معلوم ہوگا، اولاد بغاوت اور سرکشی پر اتر آئے گی، لیکن اگر رزقِ حلال میسر ہو تو دل میں رقت ولطافت پیدا ہوتی ہے، نور وعرفان کی بارش ہوتی ہے، صبر وشکر اور عفت وعصمت کے جذبات پرورش پاتے ہیں، اعمالِ صالحہ کی توفیق ارزانی ہوتی ہے۔ ایک عجیب سا سکون اور کیف محسوس ہوتا ہے۔ شاعرِ مشرق نے صدقِ مقال اور اکلِ حلال (سچی بات اور حلال روزی) کو ''سرِ دین'' قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؂

سرِ دین، صدقِ مقال اکلِ حلال
خلوت و جلوت تماشائے جمال
علم و حکمت زاید از نانِ حلال
عشق و رقت آید از نانِ حلال

رزقِ حلال کی وجہ سے علم وحکمت میں اضافہ ہوتا ہے اور عشق و رقت جیسے پاکیزہ جذبات دل میں پرورش پاتے ہیں۔ قرآن کریم میں پاکیزہ چیزیں اور نیک عمل کرنے کا اکٹھے حکم دیا گیا ہے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔'' (سورۃ المؤمنون: ۵۱) بعض علماء نے ان دونوں کو اکٹھا ذکر کرنے میں یہ حکمت بیان کی ہے کہ پاک اور حلال روزی کے استعمال سے اعمالِ صالحہ کی توفیق ملتی ہے۔

سورۃ البقرہ میں ہے: ''اے ایمان والو! کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں اور اللہ کا شکر کرو اگر تم اس کے بندے ہو۔'' (سورۃ البقرۃ: ۱۷۲) حلال روزی کے میسر آنے پر اس کا شکر تو ادا کرنا ہی چاہئے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جو حلال پر قناعت کرتا ہے

اسے شکر کی توفیق بھی خوب ہوتی ہے، اس کے مقابلے میں حرام کھانے والے کے پاس دولت کی کتنی ہی فراوانی کیوں نہ ہو لیکن اسے شکر کی توفیق نہیں ہوتی وہ ہمیشہ حالات کا شکوہ ہی کرتا رہتا ہے۔

یہودی علماء کے جو جرائم اور قباحتیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ذکر کی ہیں، ان میں سے ایک جرم یہ تھا کہ ان کی قوم حرام خوری میں مبتلا تھی مگر وہ اسے منع نہیں کرتے تھے۔ سورۂ مائدہ میں ہے: ''ان کے مشائخ اور علماء انہیں گناہ کی بات سے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے، بہت برا عمل ہے جو وہ کرتے ہیں۔'' (سورة المائدة : ٦٣)

آج ہم اپنی آنکھوں سے اس تغافل، چشم پوشی اور کتمانِ حق کی جھلک کہیں نہ کہیں بخوبی دیکھ سکتے ہیں، حرام کی کثرت ہو چکی ہے مگر روک ٹوک کرنے والے بہت کم ہیں، بلکہ بعض دلوں سے تو حلال حرام کی تمیز اور احساس ہی اٹھ گیا ہے وہ نہیں دیکھتے کہ جو کچھ وہ کما، یا کھا رہے ہیں وہ حلال ہے یا حرام ہے، اس کی پیشنگوئی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی تھی، صحیح بخاری میں ہے آپ نے فرمایا: ''لوگوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ آدمی پرواہ ہی نہیں کرے گا کہ وہ جو کچھ لے رہا ہے وہ حلال ہے یا حرام ہے۔''

(البخاري : ۲۰۸۳)

بہت سے لوگوں کا شکوہ ہے کہ ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتیں حالانکہ وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم ان اوصاف اور شرائط سے محروم ہیں جن کی وجہ سے دعائیں قبول ہوتی ہیں، دعائیں قبول ہونے کی ایک اہم شرط، روزی کا حلال ہونا بھی ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بارگاہِ رسالت میں ایک دفعہ درخواست کی تھی کہ یارسول اللہ! میرے لئے دعاء کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے مستجاب الدعوات کردے، آپ نے فرمایا: ''اپنا کھانا حلال اور پاک بنادو، مستجاب الدعوات ہو جاؤ گے''۔ جو شخص چالیس

روز رزقِ حلال کھائے جس میں ذرہ بھر بھی حرام کی آمیزش نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو منور کر دیتا ہے اور اس کی زبان سے حکمت کے چشمے جاری کر دیتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جس کا کھانا پینا، لباس اور غذا حرام ہو تو اس کی دعاء کیسے قبول ہو سکتی ہے۔''

اختصار کے ساتھ حرام روزی کے درجِ ذیل نقصانات بیان کئے جاسکتے ہیں:

۱- آدمی دعائیں قبول ہونے سے محروم ہو جاتا ہیں۔

۲- حرام کی طرف میلان، نفس کی کمینگی کی دلیل ہے۔

۳- حرام کھانے والا جبار کے غضب اور دوزخ کی آگ کا مستحق ہو جاتا ہے۔

۴- حرام مال، انسان کو اللہ سے دور کر دیتا ہے۔

۵- اکلِ حرام سے نیک اعمال کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے۔

۶- رزقِ حرام کے نقصانات سے جسم اور عقل بھی محفوظ نہیں رہتی۔

۷- حرام کی ہوس حقوق العباد کے ضائع کرنے کا سبب بنتی ہے۔

(نضرة النعيم: ۳۹۷۹/۹)

بغض

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ولا تباغضوا" (آپس میں ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو!) (بخاري: ٦٠٦٤، مسلم: ٢٥٦٣) بغض، محبت کی ضد ہے، اگر کسی سے اس لئے بغض رکھا جائے کہ وہ فاسق وفاجر اور دین کا باغی ہے تو یہ بعض صورتوں میں واجب، بعض میں مستحب ہے لیکن محض اپنے نفس اور شیطان کی اتباع میں کسی سے بغض رکھنا حرام ہے کیونکہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے آپس میں بھائی بھائی بنایا ہے، اخوت اور بھائی چارے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے محبت رکھیں، بغض اور عداوت نہ رکھیں۔

صحیح مسلم میں ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تم جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک کہ مومن نہ بن جاؤ اور مومن نہیں بن سکتے جب تک کہ آپس میں محبت نہ کرو، کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جس پر عمل کرنے سے دلوں میں محبت پیدا ہوگی، تم آپس میں سلام کو عام کرو۔"

(مسلم، ابو داؤد، ابن ماجه، في الأدب: ٢٦٠٠)

اللہ نے صرف بغض ہی کو حرام نہیں کیا بلکہ ان اسباب کو بھی حرام قرار دیا ہے جن کی وجہ سے دلوں میں بغض پیدا ہوتا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے: "شیطان تو بس یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کی وجہ سے تمہارے درمیان عداوت اور بغض پیدا کر دے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دے پس کیا تم باز آ جاؤ گے۔" (سورة المائدة: ٩١) چونکہ شراب اور جوئے کی وجہ سے آپس میں دشمنی، بغض، حسد اور نفرت پیدا ہوتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں سے سختی سے منع فرما دیا۔ غیبت اور چغلی سے بھی اسی لئے منع فرمایا کہ یہ بغض

کی تخم ریزی کرتی ہیں۔

اگر کوئی سچا مسلمان کسی سے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے بغض رکھتا ہے تو یہ ممنوع نہیں بلکہ ایمان کی نشانی ہے۔ اگر کوئی شخص خیر اور بھلائی کو ظاہر کرے جبکہ دل میں اس نے شر چھپا رکھا ہو تو اس سے محبت کرنے کی وجہ سے ثواب ملے گا اور اگر کوئی شخص ظاہر میں برا ہو اگرچہ بباطن نیک ہو تو اس سے بغض رکھنے کی وجہ سے ثواب ملنے کی امید ہے کیونکہ ہم تو ظاہر کے مکلف ہیں، باطن کا حال تو بس اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

حضرت ربیع بن خثیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چونکہ لوگوں نے دین کے مسائل میں بہت اختلاف شروع کر دیا ہے اور فرقہ واریت بھی عام ہوگئی ہے جس کی وجہ سے آپس میں لعن طعن اور بغض ونفرت کی بھی کثرت ہوگئی ہے اور ہر شخص یہی ظاہر کرتا ہے کہ میں تو بس اللہ کے لئے بغض رکھتا ہوں، ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے دعوٰی میں سچا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ جھوٹ بولتا ہو، ظاہر تو یہ کرتا ہو کہ میری دوستی اور دشمنی اللہ کے لئے ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں بلکہ وہ اپنی خواہشات کی اتباع کر رہا ہو۔

پس مسلمان پر لازم ہے کہ وہ خیر خواہی کرے اور بغض سے اپنے آپ کو بچا کر رکھے، کیونکہ عام طور پر انسان یونہی بغض میں مبتلا ہوتا ہے۔ وہ اپنے دل میں دوسروں کے لئے پائے جانے والے بغض اور نفرت کے بارے میں درست فیصلہ نہیں کر پاتا، وہ یہی سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور میری محبت اور نفرت محض اللہ کی رضا کے لئے ہے اور دوسرا غلطی پر ہے اور اس سے نفرت کرنا میرے لئے جائز ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا وہ سراسر خطا پر ہوتا ہے اور اس کا دوسروں سے بغض رکھنا محض شیطان اور نفس کے بہکاوے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ (جامع العلوم والحکم: ۲۸۸، ۲۸۹)

بغض ان بیماریوں میں سے ہے جو یہود میں پائی جاتی تھیں وہ اسلام سے، پیغمبرِ اسلام

سے اور مسلمانوں سے بغض رکھتے تھے اور وہ بھی یہی ظاہر کرتے تھے کہ مسلمان باطل پر ہیں اس لئے ان سے بغض رکھنا ہم پر واجب ہے۔ بعض ایسے اللہ والے بھی ہوتے ہیں جن سے محبت رکھنا ایمان کی اور بغض رکھنا منافقت کی نشانی ہوتا ہے، انصارِ مدینہ بھی انہی خوش نصیبوں میں سے تھے، صحیح بخاری میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا: ''انصار سے صرف وہی محبت رکھے گا جو مومن ہوگا اور وہی ان سے بغض رکھے گا جو منافق ہوگا، جو ان سے محبت رکھے گا اللہ اس سے محبت رکھے گا جو منافق ہوگا اور جو ان سے بغض رکھے گا اللہ اس سے بغض رکھے گا۔'' (بخاري : ۳۷۸۳)

حضرات حسنین رضی اللہ عنہما بھی ایسے ہی انسانوں میں سے تھے۔ ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص حسن اور حسین (رضی اللہ عنہما) سے محبت رکھتا ہے وہ حقیقت میں مجھ سے محبت رکھتا ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے وہ مجھ سے بغض رکھتا ہے۔'' (ابن ماجه مقدمة : ۱٤۳)

بغض ایسی خوفناک بیماری ہے جو انسان کے پورے دین کو متاثر کرتی اور وہ بغض کی وجہ سے دینداری کی حقیقت اور برکات سے محروم ہو جاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک کہ اسلام نہ لاؤ اور تمہارا اسلام مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ آپس میں محبت نہ کرو (باہم محبت کو فروغ دینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ) سلام کو عام کرو اس طرح آپس میں محبت کرنے لگو گے، اپنے آپ کو بغض سے بچا کر رکھو کیونکہ بغض مونڈ دیتا ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ یہ بالوں کو مونڈ دیتا ہے بلکہ یہ دین کو مونڈ دیتا ہے۔'' (الأدب المفرد : ۲٦۰)

اب تک کی گفتگو تو اس حوالے سی تھی کہ ہمیں کسی سے بغض نہیں رکھنا چاہئے لیکن اگر کوئی

شخص ہمارے ساتھ بغض رکھتا ہو تو ہمیں اس کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہئے؟ ایک مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ بغض اور جہالت کا جواب بالمثل نہ دے بلکہ عفو و درگزر اور محبت و الفت کو اپنا شعار بنائے، اس کے ایسا کرنے سے اسے اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد حاصل ہوگی اور مخالف کی آتشِ غیظ و غضب کے شعلے سرد پڑ جائیں گے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے دربارِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! میرے کچھ قرابتدار ہیں میں ان سے صلہ رحمی کرتا ہوں مگر وہ مجھ سے قطع رحمی کرتے ہیں۔ میں ان سے حسنِ سلوک کرتا ہوں اور وہ مجھ سے بدسلوکی کرتے ہیں۔ میں ان کے بارے میں بردباری سے کام لیتا ہوں جبکہ وہ جہالت کا ثبوت دیتے (اور مجھ سے بغض رکھتے) ہیں۔ آپ نے فرمایا: اگر واقعی ایسے ہے جیسے تم بتا رہے ہو اور جب تک تمہارا یہی حال اور کردار رہے گا تمہارے لئے اللہ کی طرف سے مددگار مقرر رہے گا۔

(مسلم: ۲۵۵۸)

مختصر یہ کہ بغض انتہائی مضر باطنی بیماری ہے، اس بیماری سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے، جسے یہ بیماری لاحق ہو جائے، اس کا دل اندھا ہو جاتا ہے اور عبادت کا نور اس سے سلب ہو جاتا ہے، اس کے لئے انسانوں کے درمیان رہنا محال ہوتا ہے، وہ الگ تھلگ زندگی گزارتا ہے، بغض کی وجہ سے اجتماعیت ختم ہو جاتی ہے اور جماعت کے افراد کے درمیان انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔

افشاءِ راز

راز ایک امانت ہوتا ہے، اس کا کسی کے سامنے بیان کردینا خیانت شمار ہوگا، اگر دوستوں اور عزیزوں کا راز افشاء کرنے سے انہیں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس کا ظاہر کرنا حرام ہے اور اگر ضرر کا اندیشہ نہ ہو تو بھی یہ مروّت کے خلاف ہے۔

امام عزالدین بن عبدالسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انسانوں کے عیوب پر پردہ ڈالنا اور ان کے رازوں کی حفاظت کرنا اولیاء کا شیوہ اور عادت ہے، لیکن کسی مصلحت کے حصول اور دفعِ مضرّت کے لئے راز کا افشاء جائز ہے، اپنے اس دعویٰ پر انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے استدلال کیا ہے، جنہوں نے زلیخا سمیت ان عورتوں کا راز فاش کردیا تھا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو وہ خود متّہم ہوجاتے اور ان کا دامن داغدار شمار ہوتا۔ (شجرة المعارف والاحوال: ۳۸۹، ۳۹۰)

قرآنِ کریم میں افشاءِ راز کے بارے میں صراحۃً کوئی آیت نہیں آئی، البتہ جن آیات میں اللہ تعالیٰ نے خیانت کرنے والوں کی مذمت فرمائی ہے انہی آیات سے اہلِ علم نے افشاءِ راز کی حرمت یا کراہت پر استدلال کیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ انفال میں ہے: ”اے ایمان والو! اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو اور اپنی قابلِ حفاظت چیزوں میں بھی خیانت نہ کرو اس حال میں کہ تم جانتے ہو“۔ قابلِ حفاظت چیزوں میں جیسے وہ امانتیں داخل ہیں جو ایک شخص دوسرے کے پاس رکھواتا ہے اسی طرح راز کی باتیں بھی داخل ہیں۔

(سورة الأنفال : ۲۷)

سورۂ تحریم میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک مشہور واقعہ میں بھی راز کا ذکر آیا ہے جب آپ نے اپنی ایک زوجہ مطہرہ کو راز کی کوئی بات بتائی جسے وہ پوشیدہ نہ رکھ سکیں تو

آپ نے انہیں بتادیا کہ تم نے میرا راز فاش کردیا ہے، جب انہوں نے پوچھا کہ آپ کو کس نے بتایا ہے تو آپ نے فرمایا ''مجھے اس نے بتایا ہے جو سب کچھ جاننے والا اور پوری خبر رکھنے والا ہے۔'' (سورة التحريم : ٣)

بعض احادیث سے بھی کسی کے راز کی حفاظت کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ مسند احمد میں حضرت ثابت سے روایت ہے، فرماتے ہیں مجھے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس سے گزرے، آپ نے ہمیں سلام کیا پھر مجھے بلا کر اپنے کسی کام سے بھیجا، مجھے والدہ کے پاس پہنچنے میں تاخیر ہوگئی تو انہوں نے تاخیر کی وجہ پوچھی میں نے بتادیا کہ مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کام سے بھیجا تھا۔ والدہ نے اس کام کے بارے میں پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ وہ راز ہے (لہٰذا میں آپ کو نہیں بتاسکتا) والدہ نے کہا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راز کسی کو بھی نہ بتانا، یہ واقعہ سنانے کے بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے ثابت! اگر میں کسی کو اس راز کے بارے میں بتاتا تو تمہیں ضرور بتاتا۔

(مسند أحمد : ٢٥٣/٣)

اندازہ کیجئے! کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ چھوٹے بچے تھے مگر افشاءِ راز کو ایسا برا سمجھتے تھے کہ اپنی والدہ کو بھی نہیں بتایا، والدہ کی تربیت دیکھئے کہ انہوں نے اصرار کرنے کی بجائے مزید تاکید کی کہ یہ راز کسی کے سامنے بھی فاش نہ کرنا۔ صحابہ کرام اور ازواجِ مطہرات افشاءِ راز کے بارے میں کس قدر حساس تھے؟ اس کا اندازہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ سے ہوتا ہے، ان کے پاس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ صحابہ آئے اور انہوں نے ام المؤمنین سے درخواست کی کہ ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خفیہ معمولات کے بارے میں بتایئے۔ انہوں نے جواب دیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خفیہ اور علانیہ تمام معاملات

برابر ہیں، یہ جواب دینے کے بعد انہیں یہ خیال ستانے لگا کہ کہیں میں نے آپ کا راز فاش تو نہیں کر دیا، جب آپ تشریف لائے تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے صحابہ کے سوال اور اپنے جواب کے بارے میں بتایا آپ نے تفصیل سن کر فرمایا: ''تم نے اچھا جواب دیا''۔

(مسند أحمد: ٣٠٩/٦)

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو بدترین انسان قرار دیا ہے جو اپنی بیوی کے ان معاملات کو لوگوں کے سامنے بیان کرتا پھرتا ہے جنہیں راز میں رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ (مسلم: ١٤٣٧)

قرآن اور حدیث کے بعد بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہلِ علم کے چند اقوال بھی سن لیجیے! حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو ایک موقع پر سمجھاتے ہوئے فرمایا تھا: ''میں دیکھ رہا ہوں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تمہیں بڑے صحابہ اور شیوخ کی مجلس میں بٹھاتے ہیں پس تم میری پانچ باتیں پلے باندھ لو: پہلی یہ کہ کسی کے سامنے ان کا راز فاش نہ کرنا، دوسری یہ کہ ان کے سامنے کسی کی غیبت نہ کرنا، تیسری یہ کہ ان کے روبرو جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کرنا، چوتھی یہ کہ کسی بھی معاملے میں عمر (رضی اللہ عنہ) کی مخالفت نہ کرنا، پانچویں یہ کہ تمہاری طرف سے کسی بھی قسم کی خیانت نہیں ہونی چاہیے۔'' امام شعبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان پانچوں میں سے ہر نصیحت ہزار (درہم یا دینار) سے بہتر ہے۔

(احیاء علوم الدین: ١٩٥/٢)

حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ایسے شخص کی دوستی میں کوئی خیر نہیں جو تمہیں صرف معصوم دیکھنا چاہتا ہو، اور جو غصے میں آکر راز فاش کر دے وہ کمینہ ہے اس لئے کہ رضا میں تو ہر طبعِ سلیم والا انسان راز کی حفاظت کر لیتا ہے۔''

(احیاء علوم الدین: ١٩٥/٢)

آخر میں افشاءِ راز میں جو نقصانات ہیں ان پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے!

۱-یہ امانت میں خیانت، بدعہدی اور دھوکہ ہے۔

۲-یہ کسی انسان کی کمینگی، قلتِ صبر اور کم ظرفی کی دلیل ہے۔

۳-اس سے تعلقات خراب ہوتے ہیں اور باہم نفرت وعداوت پیدا ہوتی ہے۔

۴-افشاءِ راز کرنے والے سے ہر کسی کا اعتماد اٹھ جاتا ہے یہاں تک کہ جس کو وہ دوسروں کے راز بتاتا ہے وہ بھی اس پر اعتماد نہیں کرتا، وہ سمجھ لیتا ہے کہ جیسے اس نے دوسرے کا راز میرے سامنے فاش کیا ہے یہ میرا راز کسی اور کے سامنے فاش کر دے گا۔

۵-راز کا فاش کرنا جہالت کی علامت اور اس کی حفاظت دانشمندی کی نشانی ہے۔

(نضرة النعيم: ۳۹۵۷/۹)

ایک سو اخلاق

بعض قارئین و قاریات کے خطوط، تقاضے اور مطالبات پڑھ اور سن کر میں ضرورت محسوس کر رہا ہوں کہ اس ''درسِ قرآن وحدیث'' کے سلسلہ میں ایک اہم وضاحت ان کے سامنے کردی جائے، ہر ہفتے اس صفحہ پر نہ تو قرآنِ کریم کی مسلسل تفسیر بیان کی جارہی ہے (اس مقصد کے لئے جمعہ کے دن اسلامی صفحہ کا مطالعہ مناسب ہوگا) اور نہ ہی منتخب آیات کی تشریح کی جارہی ہے، بلکہ بعض منتخب عنوانات پر کتاب وسنت کے نصوص، صحابہ کرام اور دیگر اسلاف اور اہلِ علم کے آثار پیش کیے جاتے ہیں۔ ان عنوانات میں بھی فی الحال اخلاقِ ذمیمہ کے حوالے سے گفتگو چل رہی ہے، ان شاء اللہ! ارادہ یہ ہے کہ کم از کم سو برے اخلاق بیان کرنے کے بعد سو اچھے اخلاق بھی اسی انداز سے قارئین کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ اخلاق کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق: ''مؤمنوں میں سے سب سے کامل ایمان والا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔'' (ترمذي: ١١٦٢) یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشادِ گرامی ہے: ''مؤمن اچھے اخلاق سے وہ درجہ پاسکتا ہے جو رات بھر عبادت کرنے اور دن بھر روزہ رکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔'' (ابو داؤد: ٤٧٩٨) ایک صاحب نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ''اللہ کے نبی! وہ کون سی چیز ہے جو سب سے زیادہ دخولِ جنت کا سبب بنتی ہے، آپ نے فرمایا اللہ کا تقویٰ اور خوش خلقی، پھر پوچھا گیا وہ کونسی چیز ہے جس کی وجہ سے عام طور پر لوگ جہنم میں داخل ہوں گے، آپ نے فرمایا منہ اور شرمگاہ۔'' (الترمذي: ٢٠٠٤)

یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک اقوال ہیں مگر آپ کے اعمال بھی ایسے ہی تھے،

آپ کا کردار گفتار کا آئینہ دار تھا، آپ مجسم اخلاق تھے، دوستوں اور محسنوں کے ساتھ بداخلاقی تو رہی ایک طرف، اپنے بدترین دشمنوں کے لئے بھی آپ کے دامن میں مغفرت کی دعاؤں اور حسنِ اخلاق کے سوا کچھ نہ تھا، جبکہ ہمارا معاملہ اس کے برعکس ہے، ہم دشمنوں اور مخالفین کے سامنے تو حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کیا کریں گے، اپنوں کے ساتھ بھی ہم بدترین اخلاق کے ساتھ پیش آتے ہیں۔

حیا، غصہ پی جانا، قناعت، زہد وورع، خیر خواہی، وفاداری، تواضع، میانہ روی، سخاوت اور سچائی۔ یہ سب اچھے اخلاق ہیں مگر ان میں سے کون سا خلق ہے، جو کامل درجے میں اور عمومی طور پر ہمارے اندر پایا جاتا ہے حالانکہ حیا کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: ''حیا اور ایمان دونوں ساتھ ساتھ ہوتے ہیں جب ان میں سے کوئی ایک نہ رہے تو دوسرا بھی نہیں رہتا۔'' (الترمذي : ٢٠٢٧) غصہ پی جانے کے بارے میں فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ اجر والا گھونٹ غصے کا گھونٹ ہے جسے کوئی بندہ محض اللہ کی رضا کے لئے پی جاتا ہے''۔ قناعت کے بارے میں فرمایا ''وہ شخص کامیاب ہوگیا جس نے اسلام قبول کیا، اسے بقدرِ ضرورت رزق عطا ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی عطا پر قناعت کرنے کی توفیق دے دی۔'' (الترمذي : ٢٣٤٩)

اسی طرح دوسرے اخلاقِ حسنہ کی آپ نے فضیلت اور اہمیت بیان فرمائی ہے۔ اخلاقِ حسنہ کے مقابلے میں اخلاقِ ذمیمہ کی سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت الفاظ میں مذمت بیان فرمائی ہے، آپ جھوٹ کو لے لیجئے جسے آپ نے منافق کی تین نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا ہے، لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ جھوٹ کے بغیر کوئی کام نہیں ہوسکتا، نہ دوستی قائم رکھی جاسکتی ہے، نہ تعلقات خوشگوار ہوسکتے ہیں، نہ تجارت ہوسکتی ہے نہ دکان چل سکتی ہے، نہ سیاست اور حکومت کی جاسکتی ہے، چنانچہ ہر شعبے میں جھوٹ ہی کا چلن دکھائی

دیتا ہے۔

آپ وعدہ خلافی کو لے لیجئے! جو کہ ایک متعدی بیماری کی صورت میں ہمارے عوام اور خواص میں عام ہو چکی ہے، بڑے بڑے لوگ وعدہ خلافی کرتے ہیں اور اسے کوئی عیب بھی نہیں سمجھتے، قرض لے کر بروقت ادا نہ کرنا، معین وقت پر تقریب کا آغاز نہ کرنا، کسی پروگرام میں شرکت کا وعدہ کر کے شریک نہ ہونا، بیع وشراء کا معاہدہ کر کے پھر جانا، یہ سب وعدہ خلافی کی وہ صورتیں ہیں جن میں ابتلاء عام ہو چکا ہے، حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے دن وعدہ خلاف انسان کی ذلت اور رسوائی کے بارے میں فرمایا کہ ''ہر غدّار اور وعدہ خلاف کے لئے قیامت کے دن اس کی وعدہ خلافی کے بقدر جھنڈا بلند کیا جائے گا۔''

(مسلم : ۱۷۳۸)

کون نہیں جانتا کہ غیبت ایک ایسا گناہ ہے جس کی وجہ سے ایمانی انوار ختم ہو جاتے ہیں، یہ فتنہ وفساد کی ایسی بنیادی وجہ ہے جس کی وجہ سے باہمی تعلقات خراب ہو جاتے ہیں اور محبت کا رشتہ ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے، نامعلوم کتنے گھرانے، کتنے ادارے اور کتنی جماعتیں غیبت اور بہتان تراشی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے تباہ ہو چکی ہیں، قرآن پاک میں غیبت کو اپنے مردہ بھائی کے گوشت کھانے سے تعبیر کیا گیا ہے، جسے مومن تو مومن کافر بھی انتہائی قبیح اور قابل نفرت سمجھتا ہے۔ لیکن کتنے مسلمان ہیں جو غیبت اور چغلی سے اپنا دامن بچا کر رکھتے ہیں؟ کتنے ہیں جو جھوٹ بولنے سے نفرت کرتے ہیں؟ کتنے ہیں جو غصے کے وقت آپے سے باہر نہیں ہوتے؟ کتنے ہیں جو حسد اور نفرت کی نجاست سے اپنے دل کو آلودہ نہیں ہونے دیتے؟ کتنے ہیں جو سود، جوا، ملاوٹ، دھوکہ فریب، رشوت اور خرید وفروخت کے ناجائز طریقوں سے بچ کر صرف حلال روزی پر اکتفاء کرتے ہیں؟

اگر ہم سب اپنا محاسبہ کریں گے اور گرد وپیش کا جائزہ لیں گے تو ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور

ہوں گے کہ آج ہمارے اخلاق تباہی اور زوال کا شکار ہیں، اس تباہی اور زوال پر کڑھنے کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ حالات کا بہت باریک بینی سے جائزہ لے کر ان سطور کے ناچیز راقم نے ایک سو اخلاقِ ذمیمہ اور ایک سو اخلاقِ حسنہ قرآن اور حدیث کی روشنی میں بیان کرنے کا عزم کیا ہے، دعاء فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے خلوص کے ساتھ اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

ایک پروفیسر صاحب نے پیغام بھیجا کہ مولانا صاحب! آپ درس قرآن میں صرف وعیدیں ہی بیان نہ کیا کریں بلکہ بشارتیں بھی سنایا کریں، میں نے جواباً عرض کیا کہ حضرت! میں تو فی الوقت اخلاقِ ذمیمہ پر لکھ رہا ہوں، جھوٹ، غیبت، چغلی اور حسد جیسے گناہوں پر بشارتیں کہاں سے تلاش کر کے لاؤں، البتہ جب اخلاقِ حسنہ زیرِ بحث آئیں گے تو بشارتیں بھی بیان کی جائیں گی۔ ان شاء اللہ!

دہشت گردی

یہ بات تو ہمارے قارئین اور قاریات کے ذہن میں ضرور ہوگی کہ ہمارے سامنے اخلاقِ ذمیمہ کی جو فہرست ہے وہ عربی لغت کے اعتبار سے ہے، اسی فہرست کے پیشِ نظر آیاتِ قرآنیہ، احادیثِ نبویہ اور صحابہ کرام اور صلحاء کے آثار و اقوال جمع کئے جاتے ہیں، چونکہ ہمارے سامنے اخلاقِ ذمیمہ کے نام اور عنوانات عربی زبان میں ہیں اس لئے ہم اکثر یہ کوشش کرتے ہیں کہ پہلے زیر بحث خلق کے لغوی معنی بیان کردیئے جائیں۔

آج ہم جس خُلق کے حوالے سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں وہ ہے ''اِرھاب'' یہ لفظ خوف پر دلالت کرتا ہے، اصل میں تو یہ لفظ اونٹ کو حوض سے روکنے اور دور دھکیلنے کے معنی میں استعمال ہوتا تھا، بعد میں اسے دشمن کو ڈرانے اور دھمکانے کے معنی میں بھی استعمال کیا جانے لگا، (تفسير قرطبي: ٢٦/٧ ، المفردات في غريب القرآن: صـ ٢٠٤) جدید عربی میں اسے ''دہشت گردی'' کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، ہوتا یہ ہے کہ چند افراد جماعت کی صورت میں منظّم ہوجاتے ہیں پھر وہ اپنے دشمن کو مرعوب کرنے اور نقصان پہنچانے کے لئے جو کچھ ان کے بس میں ہوتا ہے وہ کرگزرتے ہیں، بم دھماکے کرتے ہیں، تنصیبات کو نقصان پہنچاتے ہیں، عمارات کو خاک کے ڈھیر میں تبدیل کردیتے ہیں، موقع ملے تو دشمن کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔

جہاں تک ایسے دشمنوں کا تعلق ہے جو اسلام، مسلمانوں، اسلامی مملکت اور امنِ عامہ کے لئے خطرہ ہوں تو انہیں دہشت زدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۂ انفال میں ہے: ''تم ان کے مقابلے کے لئے اپنی طاقت بھر قوت کی تیاری کرو اور گھوڑوں کو تیار رکھنے کی کہ اس سے تم اللہ کے دشمنوں کو خوف زدہ رکھ سکو اور ان کے سوا اوروں کو بھی، جنہیں تم نہیں جانتے،

اللہ انہیں خوب جانتا ہے۔" (سورة الأنفال : ٦٠) اس آیتِ کریمہ میں "ترھبون" کا لفظ ہے جو کہ اِرہاب سے مشتق ہے۔

دُشمنانِ اسلام کے پروپیگنڈا اوران کی زبان درازیوں کو دیکھتے ہوئے کچھ بعید نہیں کہ وہ یہ بھی کہہ دیں کہ قرآن کریم میں مسلمانوں کو دہشت گردی کا حکم دیا گیا ہے، دہشت گردی کا معنی ہے دشمن کے دل میں خوف اور دہشت بٹھانا، اس وقت عالمی سیاست پر جو طاقتیں چھائی ہوئیں ان میں سے کون ہے جو اپنی حربی، فوجی اور معاشی قوت کا اظہار کرکے دہشت نہیں پھیلا رہی، یہ طاقتیں وقتاً فوقتاً اپنے جدید اسلحہ کی نمائش اور بحرو بر میں جنگی مشقیں کرتی ہیں تاکہ اپنے مخالفوں کو دہشت زدہ کرسکیں، بعض اوقات یہ اپنے لاؤلشکر سمیت کسی کمزور ملک پر چڑھ دوڑتی ہیں تاکہ پوری دنیا میں ان کی قوت و ہیبت کا سکہ جمارہے، عالمِ اسلام ان کی وحشت اور بربریت کا خصوصی ہدف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور مسلمان روزِ اوّل ہی سے دہشت گردی کا شکار رہے ہیں، جبکہ اہلِ باطل کی وحشیانہ اور ظالمانہ کارروائیوں کے مقابلے میں انہوں نے ہمیشہ امن اور سلامتی کا راستہ اختیار کیا، آپ مکۃ المکرمہ سے مدینہ منورہ تک اور بدر سے غزوہ تبوک تک ایک اچٹتی سی نظر ڈالیں تو آپ یہ باور کرنے پر مجبور ہوجائیں گے کہ مشرکین اور یہود و نصاریٰ نے محض قبولِ حق کے جرم میں انہیں ظلم وستم کا نشانہ بنایا، بعض اوقات دیوار سے لگادینے والا رویّہ بھی انہوں نے اختیار کیا مگر اہلِ ایمان نے پھر بھی امن اور آشتی کا پرچم گرنے نہ دیا، مسلمانوں کی امن پسندی ثابت کرنے کے لئے صرف صلح حدیبیہ کی مثال ہی کافی ہے، جب مسلمان صرف عمرہ کے ارادہ سے نکلے تھے اور زمانۂ جاہلیت میں بھی حرم، احرام اور قربانی کے جانور کا احترام کیا جاتا تھا مگر قریش کے قلب ودماغ کو جاہلی حمیت نے پوری طرح اپنے قابو میں لے لیا اور وہ جنگ کی باتیں کرنے لگے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم نے ان کی جاہلانہ باتیں سن کر فرمایا تھا: ''اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، کفارِ قریش مجھ سے جس بات کا بھی سوال کریں گے اگر وہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں میں سے نہ ہو تو میں ان کی ہر بات منظور کرلوں گا'' آپ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ میں جنگ سے بچنے کے لئے آخری حد تک جانے کے لئے تیار ہوں چنانچہ ایسے ہی ہوا اور یہ محض آپ کی امن پسندی، تدبیر اور حکمت ہی کا نتیجہ تھا کہ مکّہ کی وادیوں اور پہاڑیوں پر چھائے ہوئے جنگ کے بادل چھٹ گئے۔

شاید چودہ سو سال پہلے کی مثالیں کسی کی سمجھ میں نہ آئیں، آپ آج کی دنیا پر ہی ایک نظر ڈال لیں، کشمیر سے افغانستان اور فلسطین سے عراق تک دہشت گردی کا کون سا حربہ ہے جو مسلمانوں کے خلاف نہیں آزمایا گیا اور جور و جفا کا کون سا پہاڑ ہے جو ان پر نہیں توڑا گیا، خونِ مسلم کی ندیوں، لاشوں کے انبار، لٹی ہوئی عصمتوں، ستم زدوں کے نالوں اور یتیموں کی چیخ و پکار سے کوئی اندھا بہرا تو شاید انکار کردے مگر جسے اللہ نے سماعت و بصارت عطا کی ہے وہ بہر حال ان زندہ حقیقتوں سے انکار نہیں کرسکتا۔

پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے زور پر دو باتیں ہر خاص و عام کے ذہن میں بٹھادی گئی ہیں: پہلی یہ کہ دہشت گردی خواہ کسی کے خلاف ہو، مذموم اور قبیح ہے اور دوسری بات یہ کہ پوری دنیا میں دہشت گردی کی کارروائیوں میں صرف مسلمان ہی ملوث ہیں حالانکہ یہ دونوں باتیں خلافِ حقیقت اور غلط ہیں، ہم مذکورہ بالا سطور میں اجمالی طور پر ثابت کرچکے ہیں کہ مسلمان دہشت گرد نہیں بلکہ دہشت گردی کا ہدف ہیں، جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو اسے بھی کوئی خردمند من وعن تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوسکتا، صحیح بات یہ ہے کہ دہشت گردی محمود بھی ہے اور مذموم بھی ہے۔ اگر فاسقوں، فاجروں، مجرموں، امن دشمنوں، ڈاکوؤں، لٹیروں اور اللہ اور اس کے رسول کے باغیوں کو مجرمانہ کارروائیوں سے باز رکھنے

کے لئے دہشت زدہ کیا جائے اور طاقت کا ایسا مظاہرہ کیا جائے جس سے ان کے دلوں میں خوف بیٹھ جائے تو یہ قابلِ تعریف عمل اور انسانیت پر احسانِ عظیم ہوگا۔ لیکن ایسی دہشت گردی اور اسلحہ کی نمائش جو جرائم پیشہ اور ظالم لوگ امن پسند شہریوں کو خوف زدہ کرنے کے لئے کرتے ہیں تو یہ ایک ناقابلِ معافی جرم ہے، اسلام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء فرمائی تھی: ''اے اللہ! جو شخص اہلِ مدینہ پر ظلم کرے اور انہیں خوفزدہ کرے تو اسے خوفزدہ فرما اور اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہو، نہ اس کی توبہ قبول کی جائے گی اور نہ ہی اس سے فدیہ لیا جائے گا۔'' (الترغيب والترهيب: ۲/۲۳۲)

مدینہ منورہ کو جو فضیلت اور شرف حاصل ہے اس سے کسے انکار ہوسکتا ہے اور یقیناً اس دعاء میں اس کی مخصوص فضیلت آپ کے پیشِ نظر ہوگی، لیکن یہ نکتہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ مدینہ کو دنیا میں پہلی اسلامی مملکت اور مسلمانوں کا مسکن ہونے کا شرف بھی حاصل تھا، اس بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ جو شخص بھی اسلامی بنیادوں پر قائم کسی مملکت کے امن کے لئے خطرہ بنے گا وہ کسی نہ کسی درجے میں اس بددعا کا ہدف ضرور بنے گا۔ ابوداؤد میں ہے کہ ایک مرتبہ چند صحابہ جارہے تھے۔ ان میں سے ایک غلبۂ نیند کی وجہ سے سو گیا، دوسرے ساتھی نے کوئی ایسی حرکت کی جس سے وہ خوفزدہ ہوگیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا: ''کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کو ڈرائے۔'' (ابو داؤد: ٥٠٠٤) اس حدیث سے ہم جو بات ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ کے نبی نے کسی بھی انداز میں مسلمان کو خوفزدہ کرنے کی اجازت نہیں دی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اپنے بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرے گا اس پر فرشتے لعنت کریں گے

اگر چہ وہ اس کا ماں باپ شریک بھائی ہی کیوں نہ ہو۔'' (مسلم : ٢٦١٦)

اس حدیث سے مسلمان کی حرمت بھی ثابت ہوتی ہے اور اسے خوف اور دہشت میں مبتلا کرنے کی ممانعت بھی سمجھ آتی ہے۔

حضرت ہشام بن حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کا گزر شام میں کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جنہیں دھوپ میں کھڑا کر کے ان کے سروں پر تیل ڈالا گیا تھا، آپ نے اس کی وجہ پوچھی تو بتایا گیا کہ ان لوگوں کو خراج ادا نہ کرنے کی وجہ سے سزا دی جا رہی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ ان لوگوں کو عذاب دے گا جو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔'' (مسلم : ٢٦١٣) اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر مسلم ذمیوں کو ناحق ستانے اور پریشان کرنے والے بھی قیامت کے دن عذاب کے مستحق ہوں گے۔

حبطِ عمل

حبطِ عمل کا معنی ہے عمل کا ضائع ہو جانا اور احباط کہتے ہیں عمل کے باطل اور ضائع کر دینے کو۔ عربی زبان میں حبط کا لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب جانور بہت زیادہ کھالے۔ یہاں تک کہ اس کا پیٹ پھول جائے، بسا اوقات ایسی صورت میں موت بھی واقع ہو جاتی ہے، بظاہر تو جانور نے غذائیت بخش چارہ کھانے کا عمل کیا تھا، چونکہ وہ حد سے تجاوز کر گیا اس لئے یہ عمل اس کی موت کا سبب بھی بن سکتا ہے۔

اسی طرح بعض بدنصیب ایسے ہیں جو زندگی بھر عمل کرتے ہیں، لیکن صبحِ قیامت کو جب وہ اٹھیں گے تو انہیں یہ بری خبر سننے کو ملے گی کہ تمہاری ساری محنت اکارت گئی اور تمہارے سارے اعمال ضائع ہو گئے، اس دنیا میں آنے والا ہر انسان محنت اور کوشش کر رہا ہے، شعوری زندگی کی ابتداء سے لیکر رشتۂ حیات کے انقطاع تک وہ جہد و عمل میں مصروف رہتا ہے، خواہ وہ مومن ہو یا کافر، عالم ہو یا جاہل، نیک ہو یا بد، خدا پرست ہو یا دنیا پرست، مرد ہو یا عورت، آخرت پر اس کا ایمان ہو یا کہ نہ ہو، اسے بہر حال مصروفِ عمل رہنا پڑتا ہے۔

انسان جو کچھ دنیا میں کرتا ہے اس کا نتیجہ آخرت میں ظاہر ہوگا، دنیا آخرت کی کھیتی ہے جو کچھ یہاں بویا جائے گا آخرت میں کاٹا جائے گا اس لئے کسی بھی عمل کے فائدہ مند اور ثمر بار ہونے کا فیصلہ آخرت کے اعتبار سے کیا جائے گا، آخرت میں اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں پکڑایا جانا اس بات کی نشانی ہوگی کہ اس شخص کی محنت ٹھکانے لگ گئی اور اعمال نامہ کا بائیں ہاتھ میں دیا جانا خسران اور ناکامی کی طرف اشارہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں قرار دیا ہے جو بزعم خویش اچھے اعمال کرتے رہے تھے، لیکن آخرت میں انہیں بتایا جائے گا کہ تمہاری

ساری محنت ضائع گئی۔

سورۂ کہف میں ہے: ”فرما دیجئے کیا میں تمہیں ان لوگوں کے بارے میں نہ بتاؤں جو اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں ہیں؟ وہ کہ جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں ضائع ہوگئی اور وہ یہ سمجھتے رہے کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔“

(الكهف : ۱۰۳،۱۰٤)

اہلِ علم نے عمل کے ضائع ہوجانے کی تین صورتیں لکھی ہیں:

☆ پہلی یہ کہ وہ ایسے اعمال ہوں جن کے کرنے والے ایمان سے محروم ہوں، کیونکہ کسی بھی عمل کی قبولیت کے لئے ایمان بنیادی شرط ہے، کفار اور مشرکین کے اچھے اعمال کا بدلہ انہیں دنیا میں دے دیا جاتا ہے، آخرت میں انہیں کوئی صلہ نہیں ملے گا، سورۂ اعراف میں ہے: ”اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا یا ان کے اعمال ضائع ہوگئے“......شرک ایسا عمل ہے کہ اگر بالفرض اللہ کے نیک بندے بھی اس کا ارتکاب کرلیں تو ان کے سارے نیک اعمال ضائع ہوجائیں۔ سورۂ زمر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ”تحقیق وحی کی گئی ہے تیری طرف اور ان لوگوں کی طرف جو تجھ سے پہلے ہوئے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے اعمال ضائع ہوجائیں گے اور تم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوجاؤ گے۔“ (سورة الزمر : ٦٥)

آج یہ نظارہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ کافروں والے بہت سے اعمال مسلمانوں نے اختیار کر رکھے ہیں اور اہل ایمان کے بعض اعمال و اخلاق اہلِ کفر نے اپنا لیے ہیں، معاملات کی صفائی، تجارت میں سچائی، وقت کی پابندی، ایفائے عہد، ملاوٹ سے اجتناب، ملک وملت سے وفا، مظاہرِ فطرت میں غور وفکر، انسانیت کی فلاح و بہبود اور راحت رسانی کے لئے نئی نئی تحقیقات اور ایجادات۔ یہ خصوصیات اور اوصاف مسلمانوں کی

پہچان ہوا کرتے تھے جبکہ اس کے برعکس معاملات میں دھوکہ فریب، تجارت میں دروغ گوئی، وقت کا ضیاع، وعدہ خلافی، بددیانتی اور خیانت، ملک اور قوم سے غداری، کاہلی اور سستی، نقالی اور راحت طلبی یہ سارے اوصاف کافروں کے تھے لیکن آج صورتحال برعکس ہے۔ اس لئے بعض مسلمانوں کو یہ کہتے ہوئے سنا جاتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ معاملات وغیرہ کی صفائی کے باوجود کفار دوزخ کا ایندھن بنیں اور ساری عملی اور اخلاقی کمزوری کے باوجود مسلمان جنت کے حقدار ٹھہریں، ہم ان کے مغالطہ کا اپنی طرف سے کوئی جواب دینے کی بجائے یہی عرض کرنا کافی سمجھتے ہیں کہ جب رب تعالیٰ نے واضح طور پر فرمادیا کہ کافروں اور مشرکوں کے اعمال ضائع ہوجائیں گے تو اب ہمارا اٹکل پچو کرنا اپنے آپ کو اللہ کے غضب کا مستحق بنانے کی ناروا کوشش کے سوا کچھ نہیں، کفر و شرک کا ارتکاب اور نبوت و رسالت اور آخرت کا انکار کرنے والوں کو جنتی ثابت کرنے کی کوشش کرنا قرآنِ کریم کے دو ٹوک ارشادات کا انکار کرنے کے مترادف ہے۔ یہ تو ہوئی حبطِ اعمال کی پہلی صورت، یعنی یہ کہ عمل کرنے والا کافر یا مشرک ہو۔

☆ حبطِ اعمال کی دوسری صورت یہ ہے کہ عمل کرنے والا اگرچہ مومن ہو مگر بعض اسباب کی وجہ سے اس کے اعمال ضائع ہوجائیں، ان اسباب میں سے سب سے مہلک سبب ریا ہے جسے شرکِ اصغر بھی کہا گیا ہے، اپنے عمل پر اترانے، دوسروں کا دل دکھانے اور صدقہ خیرات دینے کے بعد احسان جتلانے اور تکلیف دینے کی وجہ سے بھی عمل باطل ہوجاتا ہے۔ سورۂ بقرہ ۲/ ۲۶۴ میں ہے: ''اے ایمان والو! اپنے صدقات، احسان جتلانے اور ایذا دینے سے اس شخص کی طرح برباد کردینا جو لوگوں کے دکھاوے کے لئے مال خرچ کرتا ہے اور اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔''

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے ادبی اور بے احترامی کی وجہ سے بھی

اعمال ضائع ہو جاتے ہیں، سورۂ حجرات ۴۹ / ۲ میں ہے: ''اے ایمان والو! اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اونچی نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو۔ اس طرح آپ کے سامنے زور سے نہ بولا کرو ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔''

☆ حبطِ اعمال کی تیسری صورت یہ ہے کہ کسی شخص کے گناہ اس کی نیکیوں سے زیادہ ہوں، اسی چیز کو قرآن کریم میں خفتِ میزان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۂ قارعہ میں ہے: ''تو جس کے اعمال کے وزن بھاری ہوں گے وہ دل پسند عیش میں ہوگا اور جس کے وزن ہلکے ہوں گے اس کا ٹھکانا ہاویہ ہے اور تمہیں کیا خبر کہ ہاویہ کیا چیز ہے وہ دہکتی ہوئی آگ ہے۔''

(القارعة : ٦۔١١)

اللہ تعالیٰ سے دعاء کرنی چاہئے کہ وہ ہمیں حبطِ اعمال کی ان تینوں صورتوں سے محفوظ رکھے۔ (ماخوذ از نظرة النعيم : ٣٧٩٧/٩)

اَذیت

آج کی نشست میں ہم جس خلق یا لفظ کے حوالے سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں، وہ ''اذی'' ہے، ہم نے قارئین کی سہولت اور تفہیم کی خاطر اذیت کا عنوان قائم کیا ہے۔ قرآن کریم میں لفظ ''اذی'' دس معانی میں استعمال ہوا ہے، جس کی تفصیل علامہ فیروز آبادی رحمہ اللہ کی کتاب ''بصائر ذوی التمیز'' کی دوسری جلد میں دیکھی جاسکتی ہے۔ سب وشتم، جھوٹ اور بہتان سے لے کر گندگی اور حرام تک کے معنی میں ''اذی'' کو استعمال کیا گیا ہے لیکن دیکھا جائے تو ان سب میں جو وجہِ مشترک ہے وہ اذیت اور تکلیف ہے۔

اسلام، سلامتی کا مذہب ہے اور مسلمان امن اور سلامتی کا پیامبر ہے، عربی زبان سے ذرا سی شُد بُد رکھنے والا شخص جانتا ہے کہ اسلام اور مسلم کے لفظ ہی میں سلامتی کا مفہوم پایا جاتا ہے اسی لئے سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کامل مسلم اسی کو قرار دیا ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ بلاوجہ کسی کو اذیت دینا حرام ہے چاہے وہ قول سے ہو یا عمل سے۔

اسلام صرف جسمانی اور مالی اذیت کو حرام قرار نہیں دیتا بلکہ ذہنی اور قلبی اذیت سے بھی منع کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تم تین ہو تو دو الگ ہو کر سرگوشی نہ کریں کیونکہ اس سے تیسرے کو پریشانی لاحق ہوگی۔'' (ترمذي : ۲۸۲۵) ممکن ہے اسے یہ خیال ہو کہ یہ دونوں میرے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں بعض لوگ مجبوری کی بناء پر یا محض تفریح کی خاطر راستے میں بیٹھ جاتے ہیں، اللہ کے نبی نے اس شرط کے ساتھ انہیں بیٹھنے کی اجازت دی ہے کہ ان کی وجہ سے آنے جانے والوں کو اذیت نہ ہو۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم راستوں میں بیٹھنے سے بچو۔'' صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! بعض معاملات کے بارے میں بات چیت کرنے کے لئے راستے میں بیٹھنا ہماری مجبوری ہے، آپ نے فرمایا کہ اگر بیٹھنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں تو راستے کا حق بھی ادا کرو، پوچھا گیا یا رسول اللہ! راستے کا حق کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''نظریں جھکا کر رکھنا، کسی کو تکلیف نہ دینا، سلام کا جواب دینا، نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔'' (بخاري : ٦٢٢٩)

انسانوں کو تکلیف اور ایذاء دہی سے بچانا کتنا بڑا عمل ہے؟ اس کا اندازہ صحیح مسلم کی اس روایت سے ہوتا ہے جو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے سامنے میری امت کے اچھے اور برے اعمال پیش کئے گئے، میں نے ان کے اچھے اعمال میں منجملہ دوسرے اعمال کے اس شخص کا عمل بھی پایا جو راستے سے تکلیف دینے والی چیز کو ہٹا دیتا ہے اور برے اعمال میں یہ بھی پایا کہ کسی شخص نے مسجد میں تھوک دیا پھر اسے دفن کرنے اور صاف کرنے کی بھی توفیق نہ ہوئی۔'' (مسلم : ٥٥٣)

مسجد میں تھوکنا جہاں اللہ کے گھر کی بے ادبی ہے وہیں ایسا کرنے سے کسی بھی نظافت پسند انسان کو تکلیف ہوتی ہے اور کون مسلمان ہے جو نظافت پسند نہیں ہوتا، اسلام اپنے پیروکاروں کو نظافت اور طہارت کی تعلیم دیتا ہے۔ حدیث میں کچا پیاز اور لہسن کھا کر مسجد میں آنے سے جو منع کیا گیا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان کی بو سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیاز اور لہسن کھانے سے منع فرمایا، ہم نے ضرورت کی بناء پر کھالیا تو آپ نے فرمایا: ''جس نے یہ بدبودار درخت کھایا ہو وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے کیونکہ جس چیز سے انسانوں کو تکلیف

ہوتی ہے اس چیز سے فرشتوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔" (مسلم : ٥٦٤)

یہاں یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض حضرات گھٹیا قسم کا تیز عطر لگا کر مسجد میں آتے ہیں وہ بھی اذیت دہی کا سبب بنتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ خوشبو لگانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے لیکن یہ واضح رہنا چاہیے کہ آپ انتہائی اعلیٰ قسم کی خوشبو استعمال فرمایا کرتے تھے، ضروری نہیں کہ ہر شخص قیمتی اور اعلیٰ خوشبو ہی استعمال کرے، اگر مالی حالات اجازت نہیں دیتے تو خوشبو استعمال ہی نہ کی جائے، آخر خوشبو کا استعمال فرض تو نہیں ہے۔ ویسے سستے عطریات میں بھی ہلکی خوشبو والے عطر بازار میں دستیاب ہیں، وہ استعمال کیے جا سکتے ہیں، اس میں کیا تک ہے کہ ایک طرف تو عطر بہت تیز قسم کا ہو جس کی خوشبو سر درد میں مبتلا کر دے اور دوسری طرف پوری پوری شیشی انڈیل لی جائے، ایسے لوگ بزعمِ خویش سنت پر عمل پیرا ہوتے ہیں، لیکن وہ نہیں جانتے کہ ہم کتنوں کو تکلیف دینے اور ان کے خشوع وخضوع میں خلل انداز ہونے کا سبب بن رہے ہیں۔

اسی طرح وہ لوگ بھی دوسروں کی اذیت کا سبب بنتے ہیں جو مسجد کے باتھ روم میں مٹی کے ڈھیلے اور پتھر استعمال کرتے ہیں، دیکھا گیا ہے کہ ان کی وجہ سے گندگی پھیلتی ہے، بعض اوقات گٹر لائن بند ہو جاتی ہے، جس کے بند ہونے سے سارے نمازیوں کو ناقابلِ بیان پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اگر ہم اپنی معاشرتی زندگی پر نظر ڈالیں تو ہمیں قدم قدم پر ایسے نظارے دکھائی دیں گے جب ہم یا ہمارے بھائی دوسروں کو خواہ مخواہ پریشان کرنے اور تکلیف دینے کا سبب بن رہے ہوں گے، لیکن ہمیں اس کا احساس بھی نہیں ہوگا کہ ہم نے کوئی غلط کام کیا ہے، گاڑیوں کی غلط جگہ پارکنگ سے لیکر بازاروں میں آمد ورفت تک کہاں کہاں اپنے جیسے انسانوں کو پریشان نہیں کیا جاتا، یوں محسوس ہوتا کہ اذیت دہی ہماری معاشرت اور کلچر کا حصہ بن چکی

ہے اوپر سے لیکر نیچے تک ہر کوئی حتی المقدور دوسروں کو پریشان کررہا ہے۔

وی آئی پی حضرات جو کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بڑی بڑی ڈگریوں کے حامل ہوتے ہیں آپ ان کے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ ہی دیکھ لیجئے، وہ جہاں سے گزرتے ہیں ہزاروں انسانوں کی اذیت کا سبب بنتے ہیں، روڈ بلاک ہوجاتے ہیں اور ٹریفک جام ہوجاتا ہے مگر ان کی بلا سے، وی آئی پی جو ٹھہرے!

بعض منچلے دکانون، ہوٹلوں، گاڑیوں بلکہ گھروں تک میں اونچی آواز میں گانے بجاتے ہیں، میوزک کا حرام ہونا تو اپنی جگہ مسلّم ہے مگر اس انداز سے ایذاء دہی کی اجازت تو غیر مسلم ممالک میں بھی نہیں دی جاتی، آج کل آئس کریم فروخت کرنے والے سائیکل سوار گلی کوچوں میں میوزک بجاتے پھرتے ہیں مگر کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں، تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ برطانیہ کی ایک کمپنی یہ آئس کریم تیار کرتی ہے مگر برطانیہ کے کسی شہر اور قصبے میں چل پھر کر بیچنے والوں کو میوزک بجانے کی اجازت نہیں۔

ایسے لوگ بھی آپ نے دیکھے ہوں گے جو گھر کا کچرا گلی میں پھینک کر اڑوس پڑوس کی اذیت کا سبب بنتے ہیں حالانکہ پڑوس کے کچھ مخصوص حقوق ہیں ان میں سے سب سے بڑا حق یہ ہے کہ اسے اذیت نہ دی جائے، صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہئے کہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ دے۔'' (بخاري: ٦٤٧٥)

بعض نمازیوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ اگلی صفوں میں آنے کے شوق میں گردنیں پھلانگتے ہوئے آتے ہیں یہ بھی ممنوع ہے۔ حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جمعہ کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ گردنیں پھلانگتا ہوا آرہا ہے، آپ نے فرمایا: ''بیٹھ جاؤ تم نے اذیت پہنچائی ہے۔''

(ابو داؤد : ۱۱۱۸)

اذیت کا موضوع اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک یہ عرض نہ کردیا جائے کہ انسانوں سے زیادہ ہم پر سب سے زیادہ حق اللہ اوراس کے رسول کا ہے، اس لئے سب سے بڑا جرم اللہ اوراس کے رسول کواذیت پہنچانا ہے، سورۂ احزاب میں ہے: ''بے شک وہ لوگ جواللہ اوراس کے رسول کواذیت دیتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ لعنت کرتا ہے اور اس نے ان کے لئے رسواکن عذاب تیار کررکھا ہے۔'' (سورة الأحزاب : ٥٧)

اللہ کوایذاء دینے کا مطلب ہے ایسے عقائد اختیار کرنا اور ایسے افعال کا ارتکاب جنہیں وہ ناپسند کرتا ہے جیسے مشرکین، یہود اور نصاریٰ وغیرہ اللہ کے لئے اولاد ثابت کرتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوایذاء پہنچانا، آپ کی تکذیب، آپ کوشاعر، ساحر وغیرہ کہنا۔ کامل مومن وہی ہوگا جو نہ اللہ ورسول کوایذاء پہنچائے، نہ مسلمانوں کو، نہ بے گناہ انسانوں کو اور نہ ہی حیوانوں کو۔

فحش گوئی

امام ابوحاتم بن حبان رحمہ اللہ کا ایک قول ہے جس کا اصل لطف عربی میں آئے گا، اس لئے ''خواتین کا اسلام'' کے باذوق قارئین اور قاریات کے لئے اصل الفاظ نقل کر رہا ہوں فرماتے ہیں:

''ومن اصيب في عقله كان اكثر قوته عليه لاله ولا دواء لمن لاحياء له، ولا حياء لمن لا وفاء له ولا وفاء لمن لا اخاء له من قلّ حياؤه صنع ما شاء وقال ما احب.''

''جس کی عقل میں فتور آجائے اس کی گفتگو اسے عام طور پر نقصان ہی دیتی ہے، فائدہ نہیں دیتی، جس کے اندر حیاء نہ ہو اس کا کوئی علاج نہیں، جس میں وفا نہ ہوں اس میں حیاء نہیں ہوتی، جس میں اخوت نہ ہو اس میں وفاء نہیں ہوتی، جس میں حیاء کم ہو جو چاہے کرتا ہے اور اور جو چاہتا ہے بولتا ہے۔''

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ گالی گلوچ اور فحش گوئی مذموم ہے، خباثت اور کمینگی اس کا منبع اور مصدر ہے، اذیت پسندی اور عادت کا وہ بگاڑ اس کا سبب بنتا ہے جو فساق و فجار اور اہلِ خباثت کی صحبت اور میل ملاپ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ بدگوئی اور گالی گلوچ ان کی عادت ہوتی ہے، جو شخص ان کی صحبت میں بیٹھے گا وہ بھی ان کے رنگ میں رنگ جائے گا۔''

فساق و فجار محض اپنی فحش گوئی پر اکتفاء نہیں کرتے، ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ بھی ایسے ہی بن جائیں، اسی لئے قرآن کریم میں ایسے بدطینت انسانوں کو عذابِ الیم کی وعید سنائی گئی ہے جو اہلِ ایمان میں فحاشی اور بے حیائی کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔

سورۂ نور/ ۱۹ میں ہے: ''جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں میں فحاشی

پھیل جائے، ان کے لئے دنیا اور آخرت میں دکھ دینے والا عذاب ہوگا اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

فحاشی اور بے حیائی، قول میں ہو یا عمل میں، سچا مسلمان اس سے دامن بچا کر رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی بدگو سے اس کا سامنا ہو جائے تو بھی وہ گالی گلوچ اور فحش گوئی کا جواب فحش گوئی سے نہیں دیتا۔ قرآن کریم کے طالب علم جانتے ہیں کہ فحش گوئی یہودیوں کی فطرت میں داخل تھی یہاں تک کہ اگر وہ علی الاعلان اپنی زبان گندی نہیں کر سکتے تھے تو اشاروں کنایوں میں ایسا کرنے کی ضرور کوشش کرتے تھے، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی دریدہ دہنی کے جواب میں اپنی زبان کو تو راہِ راست سے ہٹنے سے بچاتے ہی تھے، اپنے متعلقین کو بھی صبر کا دامن نہیں چھوڑنے دیتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ کچھ یہودی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے کہا اے ابوالقاسم! السام علیکم (سام کا معنی موت ہے گویا انہوں نے آپ کو موت کی بد دعا دی) آپ نے فرمایا "وعلیکم" جبکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یوں جواب دیا "علیکم السام، ولذّام" (تمہیں موت آئے اور تمہاری مذمت ہو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے عائشہ! فحش گو نہ بنو" انہوں نے عرض کیا آپ نے سنا نہیں یہود کیا کہتے ہیں، آپ نے فرمایا: "کیا میں نے "وعلیکم" کہہ کر ان کی یاوہ گوئی کا جواب نہیں دے دیا؟" (بخاري : ٦٠٣٠)

جن لوگوں کو گالی گلوچ کی عادت پڑ جاتی ہے وہ صرف انسانوں ہی کو نہیں بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں کو بھی گالیاں دیتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ بارش، ہوا، موسم ارض وسما اور زمانے کو بھی گالیاں دینے سے باز نہیں آتے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایک صاحب نے لعنت کی صورت میں ہوا کو

برا بھلا کہا، آپ نے فرمایا: ہوا کو لعن طعن نہ کرو کیونکہ ہوا تو اللہ کے حکم کے تابع ہے، جو شخص کسی ایک چیز پر لعنت کرے جو لعنت کی اہل نہ ہو تو خود اسی پر لعنت لوٹ آتی ہے۔

اسی طرح ایک خاتون بخار میں مبتلا تھیں آپ اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے تو اس نے بخار کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا آپ نے فرمایا: ''بخار کو گالی نہ دو کیونکہ بخار انسانوں کو گناہوں سے ویسے ہی پاک کر دیتا ہے جیسے آگ لوہے کو میل کچیل سے پاک کر دیتی ہے۔''

چونکہ انسان ماحول سے متاثر ہوتا ہے اس لئے آج کل وبا کی صورت میں ایک قابلِ مذمّت بات یہ چل نکلی ہے کہ بعض لوگ طبعی طور پر فحش گو نہیں ہوتے، لیکن دوسروں کی دیکھا دیکھی بتکلف فحش گو بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قسم کی فحش گوئی سے منع فرمایا ہے خواہ اختیاری ہو یا غیر اختیاری، تکلف سے ہو یا بغیر تکلف کے، آپ نے فرمایا تم ہر قسم کی فحش گوئی سے بچ کر رہو کیونکہ اللہ تعالیٰ فحش گو کو پسند نہیں فرماتا۔ جب ایک شخص کسی کو گالی گلوچ کرتا ہے تو یقیناً دوسرا بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش کرتا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات ایک دوسرے کے والدین تک بات پہنچ جاتی ہے، یوں ایک ناخلف بیٹا خود ہی اپنے والدین کو گالی دلوانے کا سبب بن جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی شخص کا اپنے والدین کو گالی دینا کبائر میں سے ہے، صحابہ نے عرض کیا رسول اللہ! کیا کوئی شخص اپنے والدین کو بھی گالی دے سکتا ہے، آپ نے فرمایا: ہاں! اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کسی کے والدین کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کے والدین کو گالی دیتا ہے۔''

آخر میں ایک نظر فحش گوئی کے نقصانات پر بھی ڈال لیجئے!

۱۔ فحش گوئی ضعفِ ایمان اور قلتِ دین کی دلیل ہے، جس کے اندر ایمان راسخ ہو

اس کی زبان ہر قسم کی گندگی سے پاک ہوتی ہے کیونکہ زبان دل کی ترجمان ہوتی ہے، زبان پر وہی کچھ آتا ہے جو کہ دل میں ہوتا ہے۔

۲- بدزبانی اور گالی گلوچ کی عادت فطرت کی خباثت اور کمینگی کی علامت ہے۔

۳- ایسا شخص اغیار اور احباب سب ہی کی اذیّت کا سبب بنتا ہے۔

چنانچہ دلوں سے اس کی محبت اٹھ جاتی ہے، اس کے ساتھ اگر کوئی نرم لہجے میں گفتگو کرتا بھی ہے تو محض اس کے شر سے بچنے کے لئے اور ایسے شخص کو حدیث میں بدترین انسان قرار دیا گیا ہے۔

۴- وہ اپنے اہل وعیال بلکہ پورے معاشرہ میں فحش کو پھیلانے کا سبب بنتا ہے۔

(نضرة النعيم : ۱۱/۵۲۳۵)

تجسس

تجسس کا معنی ہے دوسروں کے حالات اور معاملات کی ٹوہ میں لگنا، لوگوں کے راز ٹٹولنا اور عیوب تلاش کرنا، سورۂ حجرات (۱۲) میں ہے: ''اے ایمان والو! زیادہ گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور تجسس نہ کرو۔''

عام طور پر تجسس، بدگمانی کے نتیجے میں رونما ہوتا ہے، پہلے ایک شخص دوسروں کے بارے میں بدگمان ہوتا ہے پھر وہ ان کے عیوب اور کمزوریوں کی تلاش میں لگ جاتا ہے، یہ ایک قسم کی نفسیاتی بیماری ہوتی ہے جس میں وہ مبتلا ہو جاتا ہے، اسے عیوب تلاش کرنے اور پھر انہیں بیان کرنے میں ایک طرح کا لطف آتا ہے، شاید اسی لئے قرآن کریم میں ان تینوں معاشرتی اور نفسیاتی بیماریوں کو اکٹھے ذکر کیا گیا ہے اور ان سے بچ کر رہنے کی تلقین کی گئی ہے یعنی بدگمانی، تجسس اور غیبت۔

اس دنیا میں انبیاء کرام علیہم السلام کے ماسوا کون ایسا ہے جس کے اندر کوئی نہ کوئی کمزوری اور عیب نہ پایا جاتا ہو، جس شخص کا جذبہ تجسس اسے دوسروں کی کمزوریاں تلاش کرنے اور ان کی ٹوہ میں لگنے پر مجبور کرتا ہے اگر وہ اپنی برائیوں پر ایک نظر ڈال لے تو اس کی نگاہ میں کوئی برا نہیں رہے گا، وہ واضح طور پر محسوس کرے گا کہ سب سے برا تو میں خود ہوں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجسس کرنے والوں کے متعلق فرمایا: ''اے وہ لوگو! جو زبان سے تو ایمان لائے ہو مگر تمہارے دل میں ایمان داخل نہیں ہوا، مسلمانوں کے پوشیدہ حالات کی ٹوہ میں نہ لگو، کیونکہ جو شخص دوسروں کے عیوب کی تلاش میں لگے گا، اللہ اس کے عیوب کے درپے ہوگا، اور جس کے عیوب کے درپے اللہ ہو جائے اسے اس کے گھر میں ذلیل کر کے رہتا ہے۔'' (ابو داؤد: ۴۸۸۰)

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے انسان کی کوئی حرکت، کوئی عمل اور کوئی بات پوشیدہ نہیں، ایک انسان کو دوسرے انسان کے عیوب تلاش کرنے میں خاصی تگ ودو کرنی پڑتی ہے، تب جا کر کوئی عیب اس کے ہاتھ لگتا ہے لیکن باری تعالیٰ کو تو ایسا کرنے کی ضرورت نہیں، وہ ان کمزوریوں کو بھی جانتا ہے جو انسان کے اخلاق میں پائی جاتی ہیں، ان حرکتوں سے بھی باخبر ہے جو وہ رات کے اندھیرے میں دوسروں سے چھپ چھپ کر کرتا ہے، ان قابلِ اعتراض سرگوشیوں کو بھی سنتا ہے جن کی انسانوں کو خبر تک نہیں ہوتی، جو شخص مسلمانوں کے عیوب تلاش کرنے سے باز نہ آئے اللہ تعالیٰ اسے اس کے گھر میں بیٹھے بٹھائے رسوا کر دیتا ہے۔

اسلام نہ صرف یہ کہ دوسروں کے عیوب کی تلاش میں لگنے سے منع کرتا ہے بلکہ تلقین بھی کرتا ہے کہ اگر اتفاقاً کسی کا کوئی عیب اور برائی تمہارے ہاتھ لگ جائے تو اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرو، جو لوگ دنیا میں دوسروں کے گناہوں پر پردہ ڈالیں گے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا، ظاہر ہے کہ اصل عزت بھی قیامت کے دن کی ہے اور اصل رسوائی اور ذلت بھی یومِ آخرت کی ہے، اس دن جسے رسوا کیا گیا وہ کسی کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہ ہوگا نہ والدین کو نہ رشتہ داروں کو، نہ دوستوں کو نہ دشمنوں کو۔

قیامت کے دن کی روسیاہی سی بچنے کا کیسا آسان نسخہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ تم اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے دوسروں کے عیوب پر پردہ ڈال دو، اللہ تمہارے عیوب پر پردہ ڈال دے گا۔ ایک دوسری حدیث میں آپ نے پردہ پوشی کی اتنی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ جو اللہ کا بندہ یا بندی یہ فضیلت سن لے تو پھر اسے حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔

امام جصاص رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”جس نے کسی کا کوئی پوشیدہ عیب دیکھ لیا اور اس پر پردہ ڈال دیا تو یہ ایسا ہے جیسے کسی نے

زندہ درگور کی جانے والی بچی کو موت سے بچالیا۔''

تجسس اور عیب جوئی کی بیماری سے بچنے کا ایک مؤثر علاج یہ ہے کہ انسان اپنے عیوب پر نظر رکھے اور ان کی اصلاح کی کوشش کرے، حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''تم اس وقت تک ایمان کی حقیقت نہیں پاسکتے جب تک کہ لوگوں کے وہ عیوب بیان نہ کرو جو تمہارے اندر پائے جاتے ہیں اور ان کی اصلاح کی ابتداء اپنی ذات سے کرو، جب تم ایسا کرو گے تو تم اپنی ذات کی اصلاح میں مشغول ہو جاؤ گے اور اللہ کی نظر میں اس کے بندوں میں سے محبوب وہی ہیں جو ایسے ہوتے ہیں۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر لشکر اور امام کو بھی تاکید کی ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں اور اپنی رعایا کے عیوب کی ٹوہ میں نہ لگے، ابوداؤد میں حضرت مقدام بن معد یکرب اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب امیر لوگوں کے عیوب تلاش کرے گا تو ان میں بگاڑ پیدا کردے گا۔'' (ابو داؤد: ٤٨٨٩)

اصلاحی حکومت اور امیر جماعت کو یہ قطعاً زیبا نہیں دیتا کہ وہ جاسوسی کا نظام قائم کرکے لوگوں کے عیوب تلاش کرتا رہے، بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ وہ تجسس کے بغیر علم میں آجانے والی برائیوں پر دار و گیر کریں۔

تجسس میں پائی جانے والی دوسری خرابیوں کے علاوہ یہ خرابی بھی ملحوظ ذہنی چاہئے کہ جب کسی جماعت کے کارکنوں یا کسی امیر کی رعایا کو پتہ چل جائے کہ ان کا امام اور امیر ہماری کمزوریوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے تو ان کا اعتماد اپنے سربراہ سے اٹھ جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ تجسس ضعفِ ایمان، بدخلقی اور نفس کی کمینگی کی دلیل ہے اس سے دلوں میں کدورتیں پیدا ہوتی ہیں اور ایسا شخص اللہ اور اس کے رسول کے غضب کا مستحق ہو جاتا ہے۔

جھوٹ

کذب اور تکذیب دو لفظ آپ نے یقیناً سنے ہوں گے، کذب کا معنی ہے جھوٹ بولنا اور تکذیب کا معنی ہے دوسرے کو جھٹلانا اور اسے جھوٹا قرار دینا، قرآن کریم میں کذب کے مقابلہ میں تکذیب کا لفظ زیادہ استعمال ہوا ہے، کافر اور مشرک انبیاء کی اور آیات الٰہیہ کی تکذیب کرتے تھے، قرآن کریم میں اس کا کثرت سے ذکر ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم تک کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس کی کسی نہ کسی نے تکذیب نہ کی ہو۔

جھوٹ بدترین جرم اور گناہِ کبیرہ ہے، یہ جماعتوں اور افراد کو ہلاکت اور بربادی کے گڑھے تک پہنچا دیتا ہے، جھوٹا شخص بتدریج دوزخ تک پہنچ جاتا ہے، اپنوں اور غیروں کی نظر میں اس کی کوئی عزت نہیں ہوتی، اس پر کوئی بھی اعتبار کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، جھوٹے کے چہرے پر نحوست چھا جاتی ہے جس کی وجہ سے صاحب بصیرت انسان دیکھتے ہی پہچان لیتا ہے کہ یہ جھوٹے کا چہرہ ہے، جبکہ سچے انسان کے چہرے پر ایک خاص قسم کی رونق اور نور ہوتا ہے۔

یہودیوں کے بہت بڑے عالم حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربارِ اقدس میں حاضر ہوئے اور چہرۂ انور پر نظر ڈالی تو دیکھتے ہی ان کے دل نے گواہی دی کہ یہ کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں ہوسکتا چنانچہ انہوں نے فوراً ایمان قبول کرلیا۔

امام ماوردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کی عام طور پر انسان پانچ وجہ سے جھوٹ بولتا ہے:

۱۔ حصولِ منفعت اور دفعِ مضرت کے لئے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ جھوٹ بول کر وہ فوائد حاصل کرسکتا ہے اور نقصانات سے بچ سکتا ہے، تاجر، دکاندار، ملازم، دلال، وکیل اور ملازم

اسی نیت سے جھوٹ بولتے ہیں۔

٢۔ اپنے کلام کو پرکشش بنانے اور اس میں تحیر اور سنسنی خیزی کا عنصر پیدا کرنے کے لئے ...... سچائی میں سادگی، حقیقت اور واقعیت ہوتی ہے، اسے جوں کا توں بیان کیا جاتا ہے، خواہ اس میں کسی کے لئے دلچسپی کا سامان ہو یا نہ ہو جبکہ جھوٹ میں کسی شرط اور قید کا لحاظ نہیں ہوتا، قطرے کو دریا، رائی کو پہاڑ، سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ثابت کرنا جھوٹے انسان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔ بہت سارے قصہ گو، جگت باز اور مجلس آرائی کرنے والے اپنے بیان اور گفتگو کو دلچسپ بنانے کے لئے جھوٹ ہی کا سہارا لیتے ہیں۔

٣۔ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو محض عداوت، نفرت اور بغض وکینہ کی وجہ سے جھوٹ بولتے ہیں، دشمن پر الزام تراشی اور ناکردہ گناہوں کی اس کی طرف نسبت کرنا ان کے مسلک میں جائز ہوتا ہے۔

٤۔ ایسے بدنصیب بھی ہوتے ہیں کہ غلط صحبت، ناقص تربیت اور اپنی فطری کمزوریوں کی وجہ سے جھوٹ بولنا ان کی عادت بن جاتا ہے، انہیں سچ بولنے کے لئے تو شاید تکلف کرنا پڑتا ہو لیکن جھوٹ بولنے کے لئے انہیں کوئی تکلف نہیں کرنا پڑتا، وہ بلاوجہ بھی جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔

٥۔ حبِ جاہ بھی ان اسباب میں سے ایک ہے جو انسان کو جھوٹ بولنے پر آمادہ کرتے ہیں، جو شخص حبِ جاہ کی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ کبھی اپنی کمزوری یا جہالت کا اقرار نہیں کرتا خواہ اسے جھوٹ ہی بولنا پڑے اسے دوسروں پر اپنی علمی اور عملی برتری ثابت کرنے کا خبط ہو جاتا ہے۔ (الذریعة : ٢٧٥)

اگر ہم کتاب وسنت کے ان نصوص پر نظر رکھیں جن میں جھوٹ بولنے والے کی مذمت کی گئی ہے تو ہمارے لئے جھوٹ سے بچنا آسان ہو جائے گا، قرآن کریم کے مطالعہ سے

ثابت ہوتا ہے کہ جھوٹ بولنا کافروں، یہودیوں اور منافقوں کا شیوہ تھا، کتنی بری بات ہے کہ مسلمان ایسی صفت اختیار کرے جو لعنتی لوگوں کی پہچان ہے، کافروں نے اللہ کے نبیوں کو (معاذ اللہ!) جھوٹا قرار دیا حالانکہ انہیں جھوٹا قرار دینے میں وہ خود جھوٹے تھے۔

یہود کا دعویٰ تھا کہ ہمیں تاکید کی گئی ہے کہ ہم صرف اس کتاب پر ایمان رکھیں جو ہم پر نازل کی گئی ہے حالانکہ ان کا یہ دعویٰ خلافِ واقعہ تھا، منافق زبان سے مومن ہونے کا اقرار کرتے تھے لیکن اس اقرار میں وہ سو فیصد جھوٹے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں جھوٹ بولنے کی مذمت اور جھوٹ چھوڑنے کی فضیلت بیان فرمائی ہے چند ایک کا مطالعہ آپ بھی فرمالیں۔

☆ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے اندر چار صفات پائی جائیں وہ خالص منافق ہے اور جس کے اندر ان میں سے کوئی ایک صفت پائی جائے اس کے اندر نفاق کی ایک خصلت پائی گئی جب تک کہ وہ اسے چھوڑ نہ دے، منافق کی خصلتیں یہ ہیں:

- جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کرتا ہے
- جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے
- جب وعدہ کرتا ہے تو وعدہ خلافی کرتا ہے
- اور جب جھگڑا ہو جائے تو گالی گلوچ پر اتر آتا ہے۔" (بخاري : ٣٤)

☆ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں جنت کے قریب گھر کی ضمانت دیتا ہوں اس شخص [illegible] پر ہونے کے باوجود جھگڑا نہ کرے اور جنت کے وسط میں محل کی [illegible] اس کے لئے جو مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولے اور جنت کے اعلی درجے میں محل کی ضمانت دیتا ہوں اس شخص

کے لئے جس کے اخلاق اچھے ہوں۔ (ابو داود: ٤٨٠٠)

☆ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کی ایک تفصیلی حدیث کے آخر میں ہے: ''اگر بائع اور مشتری عیب چھپائیں اور جھوٹ بولیں تو ان کی تجارت میں برکت ختم ہو جاتی ہے۔''

(بخاري: ٢٠٧٩)

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین آدمیوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ تو بات کرے گا اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا (وہ تین بدنصیب یہ ہیں) بوڑھا زانی، جھوٹا بادشاہ اور متکبر فقیر۔ (مسلم: ١٠٧)

☆ بعض ایسے لاپرواہ اور جھوٹے بھی ہوتے ہیں جو اور تو اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی جھوٹ بولنے سے باز نہیں آتے، ایسوں کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھ پر جھوٹ بولنا دوسروں پر جھوٹ بولنے کی طرح نہیں ہے جس نے مجھ پر عمداً جھوٹ بولا اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے۔ (بخاري: ١٢٩١)

قابلِ احترام قارئین وقاریات! ایک طرف ان احادیث کا مطالعہ کیجئے! اور دوسرے طرف اپنی انفرادی اور معاشرتی زندگی کا جائزہ لیجئے! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم جھوٹ کی فضا میں زندگی بسر کر رہے ہیں، سیاست سے تجارت تک، عدلیہ سے انتظامیہ تک، تعلیمی اداروں سے سرکاری دفاتر تک، محلات سے جھونپڑوں تک، دکانوں سے فیکٹریوں اور کارخانوں تک کہاں کہاں جھوٹ نہیں بولا جا رہا، شاید اسی لئے ہم اللہ تعالیٰ کی لعنت کی زد میں ہیں، نہ گھروں میں سکون ہے، نہ رزق میں برکت ہے، نہ دلوں میں ایمان کا نور ہے، نہ عالمی سطح پر ہماری عزت ہے، جھوٹ بول بول کر ہم نے اپنا اعتماد اور وقار کھو دیا ہے، ہر جگہ ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

ایک وقت تھا جب مسلمان کے بارے میں خیال یہ تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتا آج تصور یہ ہے کہ وہ سچ نہیں بولتا چنانچہ ہماری مصنوعات، مشروبات، ملبوسات اور دوائیوں وغیرہ پر خود ہمارے اپنے ہم مذہب بھی اعتماد نہیں کرتے جبکہ اغیار کی مصنوعات پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کر لیتے ہیں۔ اللہ کرے کہ ہم جھوٹ سے توبہ کر لیں اور سچ بولنے کی عادت ڈالیں۔

تکبر

جب ہم تکبر کے بارے میں قرآن پاک کا مطالعہ کرتے ہیں تو پہلے ہی پارے میں جو بات سب سے پہلے ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات میں سب سے پہلے جو گناہ کیا گیا وہ تکبّر تھا، ابلیس فرشتوں کے ساتھ رہتا تھا اور بظاہر بڑا عبادت گزار تھا مگر جب آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو ان کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو ابلیس نے تکبّر کی بناء پر سجدہ کرنے سے انکار کر دیا، اس نے کہا میں آدم سے افضل ہوں کیونکہ میرا مادۂ تخلیق آگ ہے جبکہ آدم کا مادہ تخلیق مٹی ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ افضل، مفضول کے سامنے سجدہ کرے۔

دوسری بات جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ تاریخ میں گم راہ قومیں گزری ہیں ان میں سے اکثر کی گم راہی کا سبب تکبر ہی بنا، ان قوموں میں سے نمایاں ترین نام بنی اسرائیل کا ہے، تکبر کی وجہ سے انہوں نے کئی انبیاء کے معصوم خون سے اپنے ہاتھ رنگے اور تکبر ہی کی وجہ سے یہ بدبخت، نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے محروم رہے، اللہ تعالیٰ کا دستور بھی یہ ہے کہ وہ تکبر کرنے والوں کو ہدایت سے محروم رکھتا ہے، ہدایت کے چشمۂ صافی پر پہنچ کر بھی وہ تشنہ ہی رہتے ہیں، سورۂ اعراف میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ”جو لوگ زمین میں ناحق غرور کرتے ہیں میں انہیں اپنی آیات سے پھیر دوں گا۔“

(سورة الأعراف: ١٤٦)

تکبر کا معنیٰ ہے اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو اپنے مقابلے میں چھوٹا اور حقیر سمجھنا، تکبر بہت بڑی آفت، شقاوت کی کنجی، حرماں نصیبی کی علامت اور غضبِ الٰہی کو دعوت دینے کا سبب ہے۔

تکبّر کی تین قسمیں ہیں:

پہلی قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے تکبر کرنا، یہ تکبر کی قسموں میں سے بدترین قسم ہے، فرعون اور نمرود کا تکبر اسی قسم کا تھا۔

دوسری قسم ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تکبر کرنا، جو شخص اس میں مبتلا ہوتا ہے وہ آپ کی اتباع اور اطاعت سے محروم رہتا ہے، کفارِ مکّہ کو تکبر ہی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے محروم رکھا۔

تیسری قسم یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھے۔

یہ آخری قسم اگرچہ پہلی دو قسموں کے مقابلے میں ہلکی ہے مگر اس کا گناہ بھی بہت بڑا ہے کیونکہ کبر اور عظمت صرف اللہ تعالیٰ کی شان اور صفت ہے، اسی کو تکبر جچتا ہے، انسان کو تکبر جچتا ہی نہیں، (الزواجر: ۹۰) انسان تکبر کیسے کرتا ہے جبکہ اس کا حال یہ ہے کہ وہ پانی کے گندے قطرے سے پیدا ہوتا ہے، ہر وقت اپنے پیٹ میں نجاست اٹھائے پھرتا ہے، اس کے پیٹ میں انتہائی نفیس اور خوشبودار چیزیں جا کر بدبودار بن کر نکلتی ہیں، زندگی بھر قدم قدم پر دوسروں کا محتاج رہتا ہے، کوئی بیماری یا حادثہ پیش آجائے تو اس کی بیچارگی دیکھنے کی ہوتی ہے، مرتا ہے تو اس کا جسم کیڑوں مکوڑوں کی غذا بنتا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں تکبر کی مذمت بیان فرمائی ہے۔ خواہ وہ تکبر حسب نسب کی بناء پر ہو یا مال ودولت کی بناء پر، اسی طرح آپ نے متکبروں والا لباس اور رنگ ڈھنگ اختیار کرنے سے بھی منع فرمایا ہے، چادر ٹخنوں سے نیچے رکھنا متکبروں کا شیوہ تھا، آپ نے عمومی طور پر مسلمان مردوں کو ایسا کرنے سے منع کردیا۔

☆ بخاری اور مسلم میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نہیں دیکھے گا جو تکبر کی وجہ سے اپنا کپڑا نیچے لٹکائے گا۔“ (بخاري: ۵۷۸۳، مسلم: ۲۰۸۵)

☆ بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص اپنی دو چادروں میں اکڑتا ہوا جا رہا تھا، اسے اپنے آپ پر بڑا ناز محسوس ہو رہا تھا، اللہ نے اسے زمین میں دھنسا دیا، چنانچہ اب وہ قیامت کے دن تک زمین میں دھنستا رہے گا۔''

(بخاري : ٥٧٨٩)

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت اور دوزخ کا آپس میں مباحثہ ہوا، جنت نے کہا میرے اندر کمزور اور مساکین داخل ہوں گے، دوزخ نے کہا میرے ہاں ظالم اور متکبر آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے (فیصلہ کرتے ہوئے) دوزخ سے فرمایا تو میرا عذاب ہے میں تیرے ذریعے جسے چاہوں گا عذاب دوں گا اور جنت سے فرمایا تو میری رحمت ہے میں تیرے ذریعے جس پر چاہوں گا رحم کروں گا......اور تم میں سے ہر ایک کو بھر دیا جائے گا۔ (صحیح بخاری : ٧٤٤٩)

☆ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ ایک شخص نے عرض کیا، انسان کی چاہت ہوتی ہے کہ اس کے کپڑے بھی اچھے ہوں، جوتے بھی عمدہ ہوں، (کیا یہ بھی تکبر ہے؟) آپ نے فرمایا اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے، تکبّر کہتے ہیں حق بات کے ٹھکرانے اور انسانوں کو حقیر سمجھنے کو۔''

(صحيح مسلم : ٩١)

تکبر حقیقت میں باطنی اور قلبی بیماری ہے، ممکن ہے ایک شخص انتہائی قیمتی لباس پسند کرتا اور پہنتا ہو مگر اس کے دل میں تکبر نہ ہو، اس کے برعکس دوسرے شخص نے بظاہر فقیرانہ لباس پہن رکھا ہو مگر اس کا دل تکبّر کی آماجگاہ ہو۔

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے: ''تکبر میری چادر اور عظمت میرا ازار ہے، جو شخص ان دونوں میں سے کوئی ایک چیز بھی مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا میں اسے دوزخ میں ڈال دوں گا۔''

(مسلم : ۲٦۲۰)

تکبر کی قباحت کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے تکبر کو کفر کے چار ارکان میں سے ایک رکن شمار کیا ہے، باقی تین یہ ہیں: حسد، غضب اور شہوت۔

(الفوائد لابن قیم : ۲۰٦)

ابن قدامہ رحمہ اللہ نے تکبر کے تین درجات بیان فرمائے ہیں:

پہلا یہ کہ کسی انسان کے دل میں تکبر ہو اور وہ اپنے آپ کو دوسرے سے بہتر بھی سمجھتا ہو لیکن وہ دوسروں کے سامنے اپنے آپ کو متواضع ظاہر کرتا ہو، گویا اس کے دل میں شجرِ کبر کی جڑیں تو ہیں مگر اس نے شاخیں کاٹ رکھی ہیں۔

دوسرا یہ کہ اس کے عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ وہ دوسروں کو کمتر اور اپنے آپ کو ان سے بہتر سمجھتا ہے، اس کی چال ڈھال، اندازِ گفتگو اور نشست و برخاست سے اس کے دل میں چھپی ہوئی کبر وغرور کی نجاست چھلکتی دکھائی دیتی ہے۔

تیسرا یہ کہ وہ اپنی زبان سے کبر کا اظہار کرے، لمبے چوڑے دعوے، اپنے تزکیہ اور پاکیزگی کی باتیں، فخریہ حکایات، مال و دولت، علم و فضل اور حسب نسب کا مبالغہ آمیز اور متکبرانہ تذکرہ۔ (نظرة النعيم : ۱۱/۵۳۰٤)

آخر میں تکبر کے نقصانات پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے!

۱- تکبر اللہ تعالیٰ کے غضب اور ناراضگی کا سبب ہے۔

۲- یہ انسان کو اللہ تعالیٰ سے بھی دور کر دیتا ہے اور اس کے بندوں سے بھی۔

۳- تکبر کی وجہ سے علم وعمل اور زندگی سے برکت اٹھ جاتی ہے۔

۴۔ تکبر انسان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے محروم کر دیتا ہے۔

۵۔ متکبر کو باری تعالیٰ اپنی آیات سے دور ہٹا دیتا ہے، اس کی بصارت اور بصیرت جواب دے دیتی ہے اور وہ حق کو دیکھ بھی نہیں پاتا۔

۶۔ متکبر دوزخ کے عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے۔

(نضرة النعيم : ١١/٥٣٨٠)

غرور

اردو زبان میں غرور کا لفظ، فخر اور تکبر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جبکہ عربی میں غَرور (غین کے فتح کے ساتھ) ہر اُس چیز کو کہا جاتا ہے جو انسان کو دھوکے میں ڈال دے، خواہ وہ مال ہو یا اقتدار، جوانی ہو یا قوت وطاقت، شہرت اور شہوت ہو یا نفس اور شیطان۔ اور (غین کے ضمہ کے ساتھ) غرور کا اطلاق جہالت کی بعض قسموں پر ہوتا ہے کیونکہ جہالت یہ ہے کہ انسان کسی چیز کے بارے میں اس کی حقیقت کے برعکس اعتقاد رکھے، حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھے، لیکن ہر جہالت غرور نہیں ہے۔

قرآنِ کریم میں دنیا کی زندگی کو ''متاع الغرور'' (دھوکے کا سامان) قرار دیا گیا ہے کیونکہ انسان اس کی ظاہری چمک دمک، کشش اور زیب وزینت سے متاثر ہو کر آخرت کو بھول جاتا ہے اور دنیا ہی کے کمانے، بنانے، سنوارنے اور جمع کرنے میں زندگی جیسی قیمتی پونجی ضائع کر دیتا ہے۔ قیامت کے دن جب کفار کو دوزخ میں ڈالا جائے گا تو ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا جائے گا کہ تمہیں یہ عذاب اس لئے دیا جا رہا ہے کہ ''تم نے اللہ کی آیتوں کو مذاق بنا رکھا تھا اور دنیا کی زندگی نے تمہیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا۔''

سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۸۵ اور سورۂ حدید کی آیت ۲۰ میں بھی دنیا کی زندگی کو دھوکے کا سامان بتایا گیا ہے۔ سورۂ حدید کی آیت ۴ اور سورۂ فاطر کی آیت ۵ میں شیطان پر غرور کا اطلاق کیا گیا ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''احیاء علوم الدین'' میں غرور کی تین بڑی قسمیں بیان کی ہیں:

☆ پہلی قسم وہ ہے جس میں کفار مبتلا ہیں، ان میں سے بعض کو شیطان نے اور بعض کو

دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے، ان کا خیال ہے کہ دنیا نقد اور آخرت ادھار ہے اور نقد ادھار سے بہتر ہے بلکہ یہ بد بخت یہاں تک کہنے سے بھی نہیں چوکتے کہ دنیا کی لذتیں یقینی اور آخرت کی لذتیں مشکوک ہیں لہٰذا یقینی چیز کو مشکوک کی خاطر نہیں چھوڑا جا سکتا۔

☆ غرور کی دوسری قسم وہ ہے جس میں گناہ گار مسلمان مبتلا ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم اور بڑا کریم ہے لہٰذا نیک اعمال کرنے اور گناہوں کے بارے میں زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، اس میں شک نہیں کہ رب تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت کی کوئی انتہا نہیں اور ہر مسلمان کو اس کی امید رکھنی چاہیے لیکن رحمت کی امید پر گناہ پر گناہ کرتے چلے جانا سچے مسلمان کی شان نہیں۔ گناہ بہر حال گناہ ہے چاہے مسلمان کرے یا کافر کرے، اللہ کا کلام بتاتا ہے کہ باری تعالیٰ کی رحمت کے حقیقی امیدوار کون ہیں، سورۂ بقرہ میں ہے "بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا یہی ہیں وہ لوگ جو اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔"

☆ غرور کی تیسری قسم وہ ہے جس میں ایسے مسلمان مبتلا ہیں جو اگرچہ اپنے دامنِ زندگی میں نیکیوں کا ذخیرہ بھی رکھتے ہیں مگر ان کے گناہ ان کی نیکیوں سے کہیں زیادہ ہیں لیکن وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ قیامت کے دن ہمارا نیکیوں کا پلڑا بھاری ہو جائے گا۔

(احیاء علوم الدین: ۳/ ۴۰۰۔۴۰۸)

غرور کے بعد امام غزالی رحمہ اللہ نے غرور زدہ انسانوں کی بھی چار قسمیں بیان کی ہیں:

☆ پہلی قسم اہل علم کی ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے علم و عمل کی وجہ سے دھوکے کا شکار ہیں، ان کا خیال ہے کہ ہم ایسے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں جہاں ہماری بخشش یقینی ہے بلکہ بے شمار انسانوں کو ہماری سفارش کی وجہ سے جنت میں جگہ ملے گی، ان میں ایسے حضرات کی کمی نہیں ہوتی جو کبر و حرص، بغض و حسد، طلبِ جاہ اور ریا جیسی باطنی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔

☆ غرور زدہ انسانوں کی دوسری قسم وہ عبادت گزار ہیں جو یوں تو ماشاء اللہ کثرت سے ذکر و تلاوت اور ہر طرح کی عبادت کرتے ہیں لیکن کثرتِ عبادت کی وجہ سے وہ دھوکے کا شکار ہو جاتے ہیں۔

☆ تیسری قسم وہ صوفیاء ہیں جو اپنے لباس، اپنی شکل و صورت اور گفتگو سے دوسروں سے ممتاز نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں، ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے لئے احکامِ شریعت کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے۔

☆ چوتھی قسم مالداروں کی ہے، ان غرور کا شکار ہونے والوں کے مختلف گروہ ہیں، جو چیز ان سب گروہوں میں تقریباً قدرِ مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے وہ ریا ہے، شیطان ان کے اعمال مزیّن بنا کر پیش کرتا ہے۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو دولت و ثروت کو رضاءِ الٰہی کی علامت اور اپنی مقبولیت اور محبوبیت کی دلیل سمجھتے ہیں۔

(احياء علوم الدين: ٣/٤٢٩۔٤٣٥)

وہ تمام احادیث جن میں مذکورہ بالا افراد اور ظاہری اور باطنی اعمال کی مذمّت کی گئی ہے، انہیں غرور کی مذمّت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

صحابہ کرام اور مشائخِ عظام نے غرور کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اسے سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا خلاصہ اور نچوڑ ہی کہا جاسکتا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ مسلمانوں سے کہا کرتے تھے: ''تم میں سے ہر ایک سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تنہائی میں سوال کرے گا اے ابن آدم! تمہیں کس چیز نے میرے بارے میں دھوکے میں ڈالا؟ تمہارے پاس جو علم تھا اس پر تم نے کتنا عمل کیا؟

(بحواله قرطبي: ١٠/١٦١)

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ جب شام میں تشریف لائے تو آپ نے فرمایا: اے اہلِ

شام! اپنے ایسے بھائی کی بات سنو جو تمہارا خیر خواہ ہے۔ جب شام والے آپ کے سامنے جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا ''میں دیکھ رہا ہوں تم ایسے مکان بنا رہے ہو جن میں تمہیں رہنا نصیب نہیں ہوگا اور اتنا مال جمع کر رہے ہو جسے تم کھا نہیں سکتے، تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں انہوں نے پختہ عمارتیں بنائیں، لمبی امیدیں قائم کیں اور بہت سارا مال جمع کیا، ان کی امیدیں دھوکہ ثابت ہوئیں، ان کا جمع کردہ مال باعثِ ہلاکت بنا اور قبریں ان کا مسکن بنیں۔'' (ادب الدنیا و الدین: صـ ۱۲۸)

خوفِ خدا رکھنے والا اور دین کی حقیقت سمجھنے والا مسلمان کبھی غرور کا شکار نہیں ہوتا کیونکہ غرور کے درجِ ذیل نقصانات اس کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتے:

۱- غرور، نفس کے فساد اور فطرت کی خباثت کی علامت ہے۔

۲- باری تعالیٰ کی شانِ رحیمی کی وجہ سے دھوکہ انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔

۳- علماء کا اپنے علم پر غرور انہیں عمل سے غافل کر دیتا ہے۔

۴- غرور، انسان کو کفر و فسق اور بغاوت و سرکشی کی طرف لے جاتا ہے۔

۵- غرور دنیا میں خسارہ اور آخرت میں عذاب کا باعث بنتا ہے۔

۶- مغرور شخص اپنی حقیقت سے بے خبر اور جاہل ہوتا ہے، اسے یاد نہیں رہتا کہ میرا مادۂ تخلیق کوئی حقیر اور ضعیف چیز ہے۔

۷- غرور کی وجہ سے کبر و عجب جیسے بہت سارے قلبی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔

۸- عبادت گزاروں کا غرور ان کے نیک اعمال کو باطل کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

۹- غرور، امتوں کی ہلاکت اور افراد کو خطرناک بیماریوں میں مبتلا کرنے کا سبب ثابت ہوتا ہے۔

۱۰- غرور، بندگی اور عبودیت کے منافی ہے۔ (نظرة النعيم: ۱۱/۵۰۶۸)

غصّہ

قرآن کریم کی وہ آیات جن میں حلم و وقار اور صبر و رضا کا حکم دیا گیا ہے ان سے غصّہ کی قباحت سمجھ میں آتی ہے، اسی طرح جن مقامات پر ان ظالموں اور جابروں کی مذمت کی گئی ہے جو ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر کمزوروں پر ستم ڈھاتے تھے وہاں سے غصّہ کی برائی ظاہر ہوتی ہے ورنہ قرآن کریم میں باری تعالیٰ کی نسبت سے غضب (غصہ) کا ذکر تو متعدد مقامات پر ہے مگر بندوں کے حوالے سے اس کا صراحۃً ذکر نہیں ہے لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہر غصّہ قابلِ مذمت نہیں ہے بلکہ اس کے تین درجات ہیں: تفریط، افراط اور اعتدال۔

☆ تفریط یہ ہے کہ انسان کو بالکل غصہ نہ آئے یا بہت کم آئے، ایسے شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے اندر حمیت اور غیرت نہیں ہے۔ اسی جیسے انسان کے بارے میں امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جسے غصّہ دلایا جائے پھر بھی اسے غصّہ نہ آئے وہ گدھا ہے۔

☆ افراط یہ ہے کہ کوئی شخص مغلوب الغضب ہو یہاں تک کہ وہ عقل، دین اور اطاعت کے دائرے سے نکل جائے اور اس کے اندر بصیرت اور نظر و فکر باقی نہ رہے۔

☆ اعتدال یہ ہے کہ انسان عقل اور دین کے اشارے کا منتظر رہے جہاں حمیت کا تقاضا ہو وہاں وہ غضبناک ہو جائے اور جہاں حلم و وقار اور صبر کا موقع ہو، وہاں اپنے جذبات کو قابو میں رکھے۔

اس تقسیم سے ثابت ہوا کہ مطلقاً غصّہ مذموم نہیں، اگر بالفرض ایسے ہوتا تو باری تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت نہ ہوتی، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی آتا ہے کہ بعض اوقات آپ کو غصہ آجاتا تھا لیکن یہ غصّہ اپنی ذات کی خاطر نہیں ہوتا تھا بلکہ شریعت کے

احکام کی پامالی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہوتا تھا۔ ایسے غصہ کی آپ نے مذمت بیان فرمائی ہے جو محض اپنی ذات کے لئے یا شیطانی اشارے کے تحت ہو۔

(كشاف اصطلاح الفنون : ۱۰۸۹/۳)

☆ ابوداؤد میں حضرت عطیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''غصہ شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے، آگ کو پانی سے بجھایا جا سکتا ہے لہٰذا جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اسے چاہئے کہ وہ وضو کر لے۔''

(ابو داؤد : ٤٧٨٤)

☆ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے اور وہ کھڑا ہو تو اسے چاہئے کہ بیٹھ جائے اگر غصہ جاتا رہے تو فبہا ورنہ اسے لیٹ جانا چاہئے۔'' (ابو داؤد : ٤٧٨٢)

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھے وصیت فرمائیے، آپ نے فرمایا: غصہ نہ کیا کرو، اس نے بار بار درخواست کی آپ نے ہر بار یہی فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو۔''

(بخاري : ٦١١٦)

☆ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''پہلوان وہ نہیں جو کشتی میں دوسرے کو پچھاڑ دے بلکہ حقیقی پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے اوپر قابو رکھے۔''

(صحيح بخارى : ٦١١٤)

احیاء العلوم میں حضرت ذوالقرنین کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے کہ فرشتوں میں سے ایک فرشتے کے ساتھ ان کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس سے درخواست کی کہ مجھے کوئی ایسی بات سکھاؤ جس سے میرے ایمان اور یقین میں اضافہ ہو انہوں نے کہا غصہ نہ کیا کرو

کیونکہ شیطان کو ابن آدم پر سب سے زیادہ قدرت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ غصے میں ہوتا ہے، لہٰذا غصہ پی جایا کرو اور حلم ووقار سے اسے ٹھنڈا کر دیا کرو اور دیکھو عجلت سے بچا کرو کیونکہ جب تم عجلت سے کام لو گے تو اپنے نصیب سے محروم ہو جاؤ گے۔ ہر قریب اور بعید کے ساتھ نرم خوئی سے پیش آؤ اور جابر اور معاندنہ بنو۔''

(احیاء علوم الدین: ۱۷۷/۳)

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لوگ دوزخ میں تین دروازوں سے داخل ہوں گے: پہلا دروازہ شبہات کا ہے، کیونکہ شبہات کی وجہ سے اللہ کے دین میں شک پیدا ہوتا ہے، دوسرا دروازہ شہوت کا ہے جس کی وجہ سے خواہشات کو اللہ کی اطاعت اور مرضیات پر مقدم کیا جاتا ہے، تیسرا دروازہ غصے کا ہے جس کی وجہ سے انسان اللہ کی مخلوق پر ظلم اور زیادتی کا مرتکب ہوتا ہے۔ (الفوائد: ۵۹)

حقیقت یہ ہے کہ جب غصے کی آگ بھڑکتی ہے تو بہت کچھ جلا کر رکھ دیتی ہے، عقلی قویٰ کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں، انسان پر شیطان سوار ہو جاتا ہے، اسے اپنے اوپر اختیار باقی نہیں رہتا، اس غصے نے نہ معلوم کتنے گھر اجاڑ دیئے، میاں بیوی میں طلاق اور جدائی کا سبب اگر معلوم کیا جائے تو وہ عام طور پر غصہ ہی ہوتا ہے، چھوٹی سی بات پر میاں بیوی بھڑک اٹھتے ہیں، دونوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بولنے کی کوشش کرتے ہیں، طعنے دیتے ہیں، گالی گلوچ پر اتر آتے ہیں اور پھر شوہر صاحب آپے سے باہر ہو کر ''طلاق، طلاق، طلاق'' کہہ دیتے ہیں، بعد میں ایسے شوہروں کو نادم اور شرمندہ ہو کر روتا ہوا دیکھا گیا ہے، وہ مفتیانِ کرام کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جو کچھ ہوا غصے کی وجہ سے ہوا ورنہ میرا طلاق دینے کا کوئی ارادہ نہ تھا، حالانکہ طلاق تو بہر حال واقع ہو جاتی ہے چاہے ہنسی مذاق میں دی جائے یا غصے کی حالت میں۔

قتل وقتال کی بنیادی وجہ تلاش کی جائے تو وہ بھی غصہ ہی ہوگی، ایسے واقعات بھی پیش آئے ہیں جب معمولی تو تکار کے بعد ایک شخص طیش میں آ گیا اور اس نے گولی چلا کر یا خنجر گھونپ کر دوسرے کو قتل کر دیا۔

اہلِ علم نے غصے کی آگ ٹھنڈی کرنے اور اسے اعتدال میں رکھنے کے لیے مختلف علاج یہاں بیان فرماتے ہیں:

۱- جب غصہ آئے تو اللہ کو یاد کرے، اس سے دل میں اللہ کا خوف پیدا ہوگا اور یہ خوف اسے اللہ کی اطاعت پر آمادہ کر دے گا۔

۲- ان احادیث میں غور و فکر کرے جو غصہ پی جانے، عفو و درگزر اور حلم و وقار کی فضیلت کے بارے میں وارد ہیں۔

۳- اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرائے کیونکہ اللہ کہتا ہے اے میرے بندے تجھے جتنی قدرت میرے بندوں پر حاصل ہے، اس سے زیادہ قدرت مجھے تیرے اوپر حاصل ہے، اگر تم نے میرے بندوں پر غصے کی وجہ سے زیادتی کی تو قیامت کے دن تجھے میرے غضب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

۴- یہ سوچے کہ غصے میں آپے سے باہر ہو جانا حملہ آور کتوں اور درندوں کے مشابہ ہے وہ بھی طیش میں آ کر وہی کچھ کرتے ہیں جو انسان کرتا ہے۔

۵- یہ جان لے کہ اسے غصہ اس لئے آ رہا ہے کہ فلاں کام اللہ کی مرضی کے مطابق کیوں ہوا ہے، میری مرضی کے مطابق کیوں نہیں ہوا، کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ کی مرضی اس کی مرضی سے بہتر ہے۔

۶- غصے کے بعد جو ندامت اور شرمندگی ہوگی اسے یاد رکھنے کی کوشش کرے۔

۷- یہ سوچ لے کہ میں یونہی غصے کے ہاتھوں کھلونا بنا رہا تو ہر کوئی مجھ سے نفرت کرنے

لگے گا اور میرے اپنے بھی پرائے بن جائیں گے۔

۸- غصہ آنے کے بعد اپنی حالت بدل دے، کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، بیٹھا ہو تو لیٹ جائے یا وضو کرے اور اپنے اوپر پانی چھڑکے۔

۹- شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگے۔

(ادب الدنیا والدین: ۲۵۰-۲۵۲، مختصر منہاج القاصدین: ۱۸۰،۱۸۱)

غلو

غلو کا معنی ہے حد سے تجاوز کر جانا' غلو بہر حال ناپسندیدہ ہے، خواہ کسی بھی معاملے میں ہو، دین میں ہو یا دنیا میں، عقیدہ میں ہو یا عبادت میں، خورونوش میں ہو یا لباس اور مکان میں، محبت اور دوستی میں ہو یا کہ نفرت اور دشمنی میں۔

غلو کا انجام اچھا نہیں ہوتا، غلو کرنے والا یا تو گمراہی کے راستے پر چل پڑتا ہے یا وہ فرائض سے محروم ہو جاتا ہے، اولیاء کو انبیاء اور انبیاء کو خدا کے مرتبے تک پہنچا دینا غلو ہی کی وجہ سے ہوتا ہے، ایسا کرنے والوں کے دل میں یوں تو محبت اور عظمت کا جذبہ ہوتا ہے لیکن محبت اور عظمت میں غلو کی وجہ سے وہ بدترین قسم کی گمراہی کا شکار ہو جاتے ہیں، فرق مراتب کو ملحوظ نہ رکھنا بعض اوقات انسان کو زندیق بنا دیتا ہے، بعض لوگ نفلی عبادت پر اتنا غلو کرتے ہیں کہ فرائض سے غافل ہو جاتے ہیں، وہ ساری ساری رات ذکر اور وعظ کی مجلس میں یا محفل شبینہ میں شریک رہتے ہیں پھر آخر شب تھک ہار کر بستر پر لیٹ جاتے ہیں، نیند کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ نماز ہی قضا ہو جاتی ہے ورنہ جماعت سے اور مستحب وقت میں نماز پڑھنے سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اہلِ کتاب بھی غلو ہی کی وجہ سے گمراہ ہوئے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کو لے لیجیے! ان کے بارے میں یہود نے غلو یوں کیا کہ معاذ اللہ! ان کی والدہ کو پاکدامن اور شریف خاتون تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا اور نصاریٰ نے یوں غلو کیا کہ انہیں خدا کا بیٹا قرار دے دیا، سورۂ نساء میں باری تعالیٰ نے اہل کتاب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے: "اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں حد سے نہ بڑھو اور اللہ کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہو، مسیح مریم کے بیٹے عیسیٰ (نہ خدا تھے نہ خدا کے بیٹے بلکہ) خدا کے رسول اور اس کا کلمہ (بشارت) تھے جو اس نے مریم کی طرف بھیجا تھا اور اس کی طرف سے ایک روح تھے، تو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان

لاؤ اور یہ نہ کہو کہ خدا تین ہیں، اس (غلط) عقیدے سے باز آ جاؤ کہ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، اللہ ہی معبود واحد ہے اور اس سے پاک ہے کہ اس کے اولاد ہو، جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اس کا ہے اور اللہ ہی کارساز کافی ہے۔" (النسآء : ۱۷۱)

اس سے اگلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اور اللہ کے مقرب فرشتوں میں سے کوئی بھی بندگی رب میں عار محسوس نہیں کرتا، یہ سوچ صرف حضرت مسیح علیہ السلام تک محدود نہیں تھی بلکہ سارے ہی انبیاء اور اولیاء کا یہ حال تھا اور ہوتا ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کی بندگی میں عار نہیں، عزت محسوس کرتے ہیں بلکہ انہیں جو عزت حاصل ہوتی ہے وہ بندگی ہی کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے ان کے غالی عقیدت مند انتہائی نادانی کا ثبوت دیتے ہیں جب وہ انہیں عابد کے درجے سے اٹھا کر معبود کی مسند پر بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے احمق خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں، سورۂ مائدہ میں ہے:

"فرما دیجیے! اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ایسے لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلو جو خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسرے بہت سوں کو بھی گمراہ کر گئے اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔" (المآئدة : ۷۷)

نسائی اور ابن ماجہ وغیرہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم دین میں غلو سے بچو کیونکہ تم سے پہلے لوگوں کو دین میں غلو نے ہلاک کر دیا۔" (النسائي : ۲٦۸ ، ابن ماجه : ۳۰۲۹)

مشکوٰۃ میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بعد میں آنے والوں میں سے عادل لوگ علم دین کے حامل اور وارث ہوں گے اور اسے غلو کرنے والوں کی تعریف، باطل پرستوں کی نسبت اور جاہلوں کی تاویل سے پاک کر دیں گے۔" (مشکوٰۃ : ۸۲) اللہ کی عبادت یعنی صوم

وصلوٰۃ اور حج وعمرہ میں مشغول رہنا کتنی بڑی سعادت ہے؟ لیکن سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان عبادات میں ایسا انہماک جس کی وجہ سے دوسرے فرائض اور حقوق متاثر ہوجائیں یا یہ کہ انسان کی صحت پر نا قابلِ برداشت بوجھ پڑجائے، جائز نہیں ہے، اس حوالے سے چند احادیث کا مطالعہ چشم کشا ثابت ہوگا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جو اپنے دونوں بیٹوں کے درمیان (کندھوں پر ہاتھ رکھ کر) لڑھکتا ہوا جارہا تھا، آپ نے لوگوں سے پوچھا یہ صاحب ایسے کیوں کررہے ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا انہوں نے پیدل چلنے کی نذر مانی ہے، آپ نے فرمایا: اللہ اس سے غنی ہے کہ یہ شخص اپنے آپ کو عذاب میں ڈالے، پھر آپ نے سواری پر سوار ہونے کا حکم دیا۔ (مسلم: ١٦٤٢)

تفصیلی روایات میں آتا ہے کہ یہ صاحب پیدل حج کرنے کے لیے جارہے تھے کیونکہ انہوں نے اس کی نذر مانی تھی، مگر چونکہ پیدل چلنے میں انہیں بے پناہ مشقت کا سامنا کرنا پڑرہا تھا، اس لیے آپ نے انہیں سوار ہونے کا حکم دیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس ایسے وقت تشریف لائے جب میرے پاس ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی، آپ نے ان کے بارے میں سوال کیا کہ کون ہیں، تو میں نے عرض کیا کہ فلاں عورت ہے اور اپنی (کثرت) صلوٰۃ کا ذکر کررہی ہے، آپ نے فرمایا چھوڑو اور اتنی ہی عبادت کرو جتنی طاقت رکھتے ہو، اللہ کی قسم! اللہ تنگ نہیں آئے گا یہاں تک کہ تم تنگ آجاؤ گے، اللہ کو سب سے پسندیدہ عبادت وہ ہے جس کا کرنے والا اس پر مداومت کرے۔ (بخاري: ٤٣)

جب حسبِ استطاعت عبادت ہوگی تو اسے ہمیشہ نبھانا ممکن ہوگا لیکن اگر عبادت میں غلو کیا گیا تو ممکن ہے چند دن تو نوافل بھی فوت نہ ہوں اور جوش سرد ہونے کے بعد فرائض کی

ادائیگی میں بھی کوتاہی ہونے لگے۔

ایک حدیث اور سن لیجئے!

حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہما کے درمیان رشتہ مواخات قائم کیا، ایک دن حضرت سلمان، حضرت ابو درداء سے ملاقات کے لیے تشریف لائے تو ان کی اہلیہ کو پراگندہ حالی میں دیکھا، ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے بتایا کہ تمہارا بھائی ابو درداء نہ میری طرف توجہ کرتا ہے، نہ اسے دنیا کی کوئی حاجت ہے، بعد میں حضرت ابو درداء نے آکر کھانا مہمان کے سامنے رکھا، حضرت سلمان نے کہا آپ بھی کھائیں، انہوں نے عذر پیش کیا کہ میں تو روزے سے ہوں، آپ نے فرمایا: میں بھی نہیں کھاؤں گا جب تک آپ نہیں کھائیں گے، چنانچہ انہیں کھانا ہی پڑا، رات ہوئی تو حضرت ابو درداء نے قیام کا ارادہ کیا، حضرت سلمان نے فرمایا سوجاؤ! وہ سو گئے، دوبارہ اٹھنے لگے تو انہوں نے پھر سوئے رہنے کا حکم دیا، جب رات کا آخری پہر شروع ہوا تو حضرت سلمان نے فرمایا اب اٹھو چنانچہ دونوں نے نماز (تہجد) ادا کی پھر آپ نے حضرت ابو درداء سے فرمایا دیکھو تمہارے اوپر تمہارے رب کا بھی حق ہے، تمہارے نفس کا بھی حق ہے، تمہارے اہل وعیال کا بھی حق ہے۔ لہٰذا سب حق والوں کے حق ادا کرو، پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کو یہ سارا واقعہ سنایا تو آپ نے فرمایا: ''سلمان نے (جو کچھ کہا) سچ کہا۔''

(صحيح بخاري : ١٩٦٨)

اسلام نے غلو کے مقابلے میں اعتدال کی تعلیم دی ہے، ہر شعبے اور ہر چیز میں اعتدال، عقائد میں بھی، اعمال اور اخلاق میں بھی، غلو ہلاکت کا سبب اور جہالت کی دلیل ہے، غالی شخص پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے۔

غیبت

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ غیبت یہ ہے کہ کسی شخص کے ایسے عیب کو پیٹھ پیچھے ذکر کیا جائے جس کے ذکر کو وہ پسند نہ کرتا ہو، خواہ وہ عیب اس کے بدن میں ہو یا دین اور دنیا میں، اس کے نفس میں ہو یا اخلاق اور مال میں۔ (فتح الباري : ٤٨٤)

امام غزالی رحمہ اللہ نے غیبت کے کئی اسباب بیان فرمائے ہیں:

۱۔غیبت کرنے والے کے دل میں اپنے ہدف کے بارے میں جو غیظ وغضب ہوتا ہے، برائیوں کے ذکر کرنے سے اسے سکون ملتا ہے۔

۲۔اپنے دوستوں اور ہم نشینوں کی دیکھا دیکھی غیبت میں مشغول ہو جاتا ہے۔

۳۔غیبت کرنے والا دوسروں کے بارے میں بدگمان ہوتا ہے، یہی بدگمانی اسے غیبت میں مبتلا کر دیتی ہے۔

۴۔اسے اپنی تعریف اور دوسرے کی تنقیص میں مزہ آتا ہے۔

۵۔وہ لوگوں کی زبان سے جب کسی کی تعریف سنتا ہے تو حسد میں مبتلا ہو کر اس کے عیوب بیان کرنے لگتا ہے۔

٦۔استہزاء اور تحقیر کی وجہ سے غیبت کا ارتکاب کرتا ہے۔ (الاحیاء : ١٥٦،١٥٥)

غیبت کا اصل علاج علم وعمل ہے، اس گناہ میں مبتلا شخص کو چاہئے کہ غیبت کے بارے میں کتاب وسنت میں وارد وعیدوں کا استحضار کرے اور ان نقصانات کو سامنے رکھے جو غیبت پر مرتب ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ:

۱۔ غیبت کرنا ایسے ہے جیسے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا، سورۂ حجرات میں ہے: ”اے ایمان والو! بہت بدگمانیوں سے بچو، یقیناً بعض بدگمانیاں گناہ ہیں اور ٹوہ میں نہ

لگا کرو اور نہ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت کرے، کیا تم میں سے کوئی بھی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرتا ہے؟ تم کو اس سے گھن آئے گی اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔" (سورة الاحجرات : ۱۲)

۲- غیبت کرنے والے کو عذابِ قبر دیا جائے گا۔ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر دو قبروں کے پاس ہوا، آپ نے فرمایا ان دونوں کو عذاب دیا جارہا ہے اور کسی بڑے گناہ کی وجہ سے عذاب نہیں دیا جارہا، ان میں سے ایک کو پیشاب (میں احتیاط نہ کرنے) کی وجہ سے اور دوسرے کو غیبت کی وجہ سے عذاب دیا جارہا ہے۔" (مسند أحمد : ٥/٣٥،٣٦.)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ اچانک سخت بدبو آئی۔ آپ نے دریافت فرمایا: "تم لوگ جانتے ہو یہ کس چیز کی بدبو ہے؟ (پھر خود ہی جواب دیا) یہ ان لوگوں کی بدبو ہے جو ایمان والوں کی غیبت کرتے ہیں۔" (الترغيب و الترهيب : ٣/٥١٥)

۳- جو دوسروں کی غیبت کرکے انہیں ذلیل اور رسوا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے ذلیل اور رسوا کرے گا۔ حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے وہ لوگو! جو زبان سے تو ایمان لائے ہو لیکن ان کے دل میں ایمان داخل نہیں ہوا، مسلمانوں کی غیبت نہ کرو، نہ ان کے عیوب تلاش کرو کیونکہ جو شخص ان کے عیوب تلاش کرے گا، اللہ اسے خود اس کے اپنے گھر میں رسوا کردے گا۔"

(ابو داؤد : ٤٨٨٠)

۴- غیبت میں مشغولیت کی وجہ سے ایمان کے انوار اور اسلام کے آثار جاتے رہتے ہیں، دل میں قساوت محسوس ہوتی ہے، ذکر و عبادت کی طرف رغبت کم ہوجاتی ہے،

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ غیبت انسان کے تدین وتقویٰ کو جسم میں پھیل جانے والے زہریلے پھوڑے سے بھی زیادہ تیزی سے نقصان دیتی ہے۔ یہ بھی حضرت ہی کا ارشاد ہے کہ اے ابن آدم! جس عیب میں تم خود مبتلا ہو، اس کے حوالے سے اگر تم دوسروں کی برائی کرتے ہو اور اس کی اصلاح کی ابتداء اپنی ذات سے نہیں کرتے ہو تو تمہیں ایمان کی حقیقت حاصل نہیں ہوسکتی اور اگر تمہارے اندر اپنی اصلاح کی فکر پیدا ہوگئی تو پھر تمہیں دوسروں کے عیوب بیان کرنے کی فرصت ہی نہیں ملے گی اور اللہ کو اپنے بندوں میں سے سب سے زیادہ محبوب بندہ وہی ہے جسے دوسروں کی اصلاح سے زیادہ اپنی اصلاح کی فکر ہو (الاحیاء: ۱۵۲/۳) اور جو دوسروں کی اصلاح کے بارے میں بڑا فکر مند رہتا ہے بظاہر اس کے اندر بڑا درد اور کڑھن پائی جاتی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا، اسے تو بس برائیوں کی جستجو اور ان کے بیان کرنے میں مزہ آتا ہے، جیسے گندگی کا کیڑا ہمیشہ گندگی کی طرف مائل ہوتا ہے، خوشبو، طہارت اور نظافت سے اسے طبعاً کراہت محسوس ہوتی ہے یونہی جسے کمزوریوں اور برائیوں کی ٹوہ کا چسکا لگ جائے اسے ہر کسی میں صرف برائیاں ہی دکھائی دیتی ہیں، اچھائیوں کی طرف اس کی نظر جاتی ہی نہیں، اگر وہ تھوڑی سی کوشش کرلیتا تو اسے اپنے مخالف میں بہت ساری خوبیاں بھی مل جاتیں، حالانکہ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسے چاہئے تھا کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی عزت وآبرو کا محافظ بنتا، اگر اس کے سامنے کوئی اس کی عزت سے کھیلنے اور اسے بدنام کرنے کی کوشش کرتا تو یہ اس کا دفاع کرتا ایسا کرنے سے وہ ایسے اجر وثواب کا مستحق ہوتا جو اس کے تصور سے بھی بالا ہے، حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی عزت کا دفاع کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے چہرے (اور ذات) کو آگ سے بچائے گا۔" (ترمذي: ۱۹۳۱)

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص غیبت کی بناء پر ہونے والی تذلیل سے مسلمان بھائی کو بچائے گا، اللہ پر لازم ہے کہ اسے دوزخ سے آزاد کردے۔'' (الترغیب والترھیب: ۵۱۷/۳)

سوچیے! جو مسلمان بھائی اور بہنیں اللہ تعالیٰ کے کلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی سچائی پر یقین رکھتے ہیں وہ کبھی غیبت کا ارتکاب کر سکتے ہیں؟ یہ وعیدیں اور بشارتیں پڑھ کر ان کے اندر غیبت سے نفرت اور اپنے اسلامی بھائی بہنوں کی عزت وآبرو کے تحفظ کا احساس پیدا نہیں ہوگا؟

۵- غیبت کا گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتا جب تک کہ وہ شخص خود معاف نہ کرے جس کی غیبت کی گئی ہو، نہ معلوم ہم نے اپنی زندگی میں کتنے لوگوں کی غیبتیں کی ہوں گی، اگر ہمارے دل میں توبہ کا خیال آ بھی جائے تو صرف استغفار کرنے سے توبہ قبول نہیں ہوگی، ہمیں صاحبِ معاملہ سے معافی مانگنی ہوگی لیکن سارے اصحابِ معاملہ کو ہم کہاں کہاں تلاش کرتے پھریں گے، ان میں سے کتنوں کے نام ہمارے ذہن سے اتر چکے ہوں گے اور کتنے دنیا ہی سے جا چکے ہوں گے۔

چند مواقع ایسے ہیں کہ علماء نے وہاں غیبت کی اجازت دی ہے مثلاً:

- مظلوم شخص اپنی مظلومیت کی داستان ایسے شخص کے سامنے بیان کرسکتا ہے جو انصاف دلانے کی قدرت رکھتا ہو۔
- اگر کوئی شخص برائی یا بدکاری وغیرہ میں ملوث ہو تو اس کی صاحبِ اختیار کے سامنے شکایت کی جاسکتی ہے جو برائی کو روکنے کی قدرت رکھتا ہو۔
- طلبِ فتویٰ کے لئے مفتی کے سامنے سارا معاملہ بیان کیا جاسکتا ہے مگر بہتر یہی ہے کہ فرضی نام لے کر مسئلہ معلوم کیا جائے۔

- محدثین کے لئے جھوٹے یا کمزور راویوں کا کچھا چٹھا بیان کرنا جائز ہے۔
- اگر رشتے یا کاروباری اشتراک اور امانت وغیرہ رکھنے کے سلسلے میں کوئی مشورہ طلب کرے تو جو کچھ معلوم ہو بلا کم وکاست بیان کر دینا چاہئے۔
- اگر لوگ کسی بدعتی، بدعقیدہ اور فاسق فاجر کے پاس حصولِ علم کے لئے جاتے ہوں تو انہیں اس شخص کی حقیقت بتا دینی چاہئے۔
- جو شخص علانیہ فسق وفجور میں مبتلا ہو، اس کے فسق وفجور کا ذکر پیٹھ پیچھے جائز ہے۔
- جو شخص کسی لقب میں ایسا معروف ہو کہ اس کے بغیر اس کی شناخت نہ ہوتی ہو جیسے اعمی (اندھا) اصم (بہرا) اور اعرج (لنگڑا) وغیرہ تو تعارف کی نیت سے اس کا لقب ذکر کیا جاسکتا ہے مگر تنقیص اور تحقیر کی نیت سے ایسا کرنا جائز نہیں ہوگا۔

(رياض الصالحين: ٤٥٠، ٤٥١، الزواجر لابن حجر: ٣٨٣، ٣٨٤)

قطع رحمی

عام حالات میں صلہ رحمی واجب اور قطع رحمی بہت بڑا گناہ ہے، لیکن صلہ رحمی کے مختلف درجات ہیں، ان میں سے بعض واجب اور بعض مستحب ہیں۔

سورۂ بقرہ کی آیت (۲۷) میں اللہ تعالیٰ نے فاسقوں کی تین علامتیں بیان فرمائی ہیں جن میں سے ایک علامت یہ ہے کہ ''جس تعلق کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے وہ اسے توڑ دیتے ہیں'' اس تعلق میں وہ تعلق بھی داخل ہے جو بندے کا اللہ کے ساتھ یا امتی کا نبی کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ تعلق بھی داخل ہے جو ایک انسان کا اپنے رشتہ داروں، مسلمانوں اور عام انسانوں کے ساتھ ہونا چاہئے۔

سورۂ رعد کی آیت (۱۹، ۲۰، ۲۱) میں عقل والوں کی پانچ نشانیاں ذکر کی گئی ہیں، ان میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ ''وہ ان تعلقات کو قائم رکھتے ہیں، جنہیں اللہ نے قائم رکھنے کا حکم دیا ہے۔''

سورۂ محمد کی آیت (۲۲، ۲۳) میں قطع رحمی کرنے والوں کی شدید مذمت کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''اگر تم ہدایت سے اعراض کرو تو عجب نہیں کہ تم ملک میں خرابی کرنے لگو اور اپنے رشتوں کو توڑ ڈالو، یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور ان کے کانوں کو بہرا اور آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں صلہ رحمی کی جو اہمیت تھی اس کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات جب کسی نو مسلم نے آپ سے نیک اعمال کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے ایمان کے بعد صلہ رحمی کا ذکر فرمایا۔

قبیلہ خثعم سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب کہتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی خدمت میں ایسے وقت میں حاضر ہوا جب آپ اپنے چند اصحاب کے ساتھ تشریف فرما تھے، میں نے سوال کیا، کیا آپ ہی ہیں جو رسول اللہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں؟ آپ نے اثبات میں جواب دیا، میں نے پوچھا یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ پسندیدہ عمل کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا، اللہ پر ایمان لانا، میں نے پوچھا پھر کون سا؟ آپ نے فرمایا صلہ رحمی کرنا، میں نے عرض کیا یارسول اللہ! پھر کون سا؟ آپ نے فرمایا: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا) میں نے دریافت کیا یارسول اللہ! اللہ کے ہاں اعمال میں سب سے قابلِ نفرت عمل کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، میں نے پوچھا پھر کون سا؟ آپ نے فرمایا: قطع رحمی کرنا، میں نے عرض کیا اس کے بعد کون سا عمل قابلِ نفرت ہے؟ آپ نے فرمایا برائی کی دعوت دینا اور نیکی سے روکنا۔ (الترغیب و الترھیب : ۳۳۶،۳۳۵/۳)

قطع رحمی ایسا سخت گناہ ہے کہ اس کی وجہ سے دوسرے اعمال بھی اللہ کے ہاں قبولیت سے محروم رہتے ہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بنی آدم کے اعمال جمعہ کی رات اللہ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں پھر قطع رحمی کرنے والے کے اعمال قبول نہیں کیے جاتے۔'' (مجمع الزوائد ۱۵۱/۸)

بخاری اور مسلم کی ایک حدیث میں آپ نے جس انداز میں صلہ رحمی کی فضیلت اور اہمیت بیان فرمائی ہے، اس سے زیادہ موثر انداز میں اس کی فضیلت کو بیان کیا ہی نہیں جاسکتا، آپ نے فرمایا: ''اللہ نے مخلوق کو پیدا فرمایا یہاں تک کہ جب اس کی تخلیق سے فارغ ہوگیا تو رحم کھڑا ہوگیا (اس کے کھڑا ہونے کی کیفیت اگرچہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی لیکن ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں) اور اس نے عرض کیا، یہ قطع رحمی سے پناہ مانگنے والے کا مقام ہے، اللہ نے جواب میں فرمایا: کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ میں بھی اس سے تعلق

رکھوں جو تمہیں ملاتا ہے اور اس سے قطع تعلق کرلوں جو تمہیں کاٹتا ہے، رحم نے اس پر رضامندی ظاہر کی تو باری تعالیٰ نے اسے یہ حق دینے کا اعلان فرمایا۔

(بخاري : ٥٩٨٧)

حقیقت یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے دل سے صلہ رحمی کی اہمیت نکل گئی ہے، وہ نماز، روزہ اور حج عمرہ کو تو عبادت سمجھتے ہیں مگر پڑوسیوں، قرابت داروں اور عام مسلمانوں کے حقوق کی ادائیگی کو عبادت ہی نہیں سمجھتے، اسی طرح شراب نوشی، بدکاری، چوری چکاری اور ترکِ نماز کو تو گناہ سمجھتے ہیں مگر قطع رحمی، دل آزاری اور ایسی حرکتوں کو اتنا بڑا گناہ نہیں سمجھتے جن کی وجہ سے آپس میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں۔ حالانکہ اسلام میں باہمی بغض، حسد اور تعلقات کی خرابی سے بھی بڑا گناہ ہے۔

ایک موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے سوال کیا کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جو (نفلی) نماز، روزے اور صدقے سے بھی افضل ہے، عرض کیا گیا یا رسول اللہ! ضرور بتائیے آپ نے فرمایا'' آپس کے تعلقات کی درستگی اور باہمی تعلقات میں فساد پیدا کرنے کے بارے میں فرمایا کہ یہ چیز دین کو مونڈ دینے والی ہے۔

جب ہم نمازیوں اور بظاہر دین داروں کو قطع رحمی میں مبتلا دیکھتے ہیں تو ہم بدگمانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یہ کیسے نمازی ہیں جو قرابت داروں کے حقوق بھی ادا نہیں کرتے اور بعض لوگ تو ان کی بے رخی، حق تلفی اور زیادتیوں کی آڑ میں نماز ہی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ یہ انتہا درجہ کی حماقت ہے جو زبان سے کلمۂ کفر تک کہنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ نماز اچھائی کا حکم دیتی ہے، برائی کا نہیں۔ برائی سے تو نماز روکتی ہے، اگر کوئی نمازی انسان برائی میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ اس کا ذاتی فعل ہے اسے اس کے نمازی ہونے کا نتیجہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

جو لوگ قطع رحمی جیسے کبیرہ گناہ میں ملوث ہیں خواہ وہ نمازی ہوں یا بے نماز، اگر وہ مذکورہ بالا تصریحات اور گزارشات کے علاوہ درجِ ذیل احادیث کو بھی پیشِ نظر رکھیں تو ان شاء اللہ! انہیں اس گناہ سے توبہ کی توفیق نصیب ہو جائے گی:

- بیہقی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جن کاموں میں اللہ کی اطاعت کی جاتی ہے ان میں سب سے جلدی صلہ رحمی کا ثواب دیا جاتا ہے اور سب سے جلدی قطع رحمی پر عذاب دیا جاتا ہے۔''

(بيهقي : ١٠/٦٢)

- مشاہدہ اور تجربہ کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ صلہ رحمی کرنے والوں کی زندگی اور کاروبار میں برکت دیتا ہے اور قطع رحمی کرنے والوں کے رزق اور عمر سے برکت اٹھ جاتی ہے۔
- حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوسکتا۔''

(ترمذي : ١٩٠٩)

- حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کوئی مسلمان اللہ سے کوئی دعاء کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ یا تو اسے اس کی مطلوبہ چیز عطا فرما دیتا ہے یا اس سے اس کی مثل تکلیف دور فرما دیتا ہے شرط یہ ہے کہ وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعاء نہ کرے۔'' (ترمذي : ٣٥٧٣)

اُمید ہے کہ ان زریں ارشادات وفرمودات کا مطالعہ ہمارے قارئین اور قاریات کے دلوں میں قطع رحمی کی نفرت پیدا کرنے کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

قتل

قتلِ عمد کبیرہ گناہوں میں سے ایک گناہ ہے، خواہ مسلمان کا قتل ہو یا ذمی کا، اسلام ہر کلمہ گو مسلمان کے خون کو دوسرے مسلمان کے لیے حرام قرار دیتا ہے، جو شخص ایمان قبول کر لے اس کے خون کو وہ حرمت حاصل ہو جاتی ہے جو حرمت ذوالحجہ کے مہینے کو، عرفہ کے دن کو اور مکہ مکرمہ بلکہ کعبہ مشرفہ کو حاصل ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا اور آخری حج تھا، ذوالحجہ کا مہینہ، عرفہ کا دن اور عرفات کا میدان تھا، انبیاء علیہم السلام کے بعد کائنات کے مقدس ترین انسانوں کا جم غفیر اسی تاریخی میدان میں چاروں طرف پھیلا ہوا گوش بر آواز تھا، اس جم غفیر کے بیچ میں رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ناقہ پر سوار یہاں پر اپنی زندگی کا آخری اور تاریخی خطبہ ارشاد فرما رہے تھے، آپ نے پہلے ہی سے ہمہ تن گوش مجمع کو مزید متوجہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''لوگو! یہ کونسا دن، کونسا شہر اور کونسا مہینہ ہے؟'' صحابہ نے خیال کیا کہ شاید آپ ان کے نام بدلنا چاہتے ہیں ورنہ ایک بدیہی چیز کے بارے میں سوال کرنے کا کیا مطلب! اس لیے صحابہ نے عرض کیا ''اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں'' پھر آپ نے خود ہی فرمایا: ''کیا آج یوم عرفہ نہیں؟ کیا یہ مکہ مکرمہ نہیں؟ کیا یہ ماہ ذوالحجہ نہیں؟'' اس کے بعد جو اصل مقصود تھا، وہ بیان فرمایا:

''سنو! اللہ نے تمہارا خون اور تمہارا مال اسی طرح محترم قرار دیا ہے جس طرح تمہارا یہ دن، یہ مہینہ اور یہ شہر محترم ہیں۔'' اس کے بعد قدسیوں کے مجمع سے سوال کیا ''کیا میں نے تم کو (اللہ کا دین) پہنچا دیا۔'' اپنے وقت کے بزرگ ترین اور رشکِ ملائکہ انسانوں پر مشتمل ہزاروں انسانوں کا مجمع بیک زبان پکار اٹھا '' نعم اديت و نصحت '' (ہاں آپ نے

پہنچایا ہی نہیں پہنچانے کا حق ادا کر دیا) پھر آپ کی انگشت مبارک آسمانوں کی جانب اٹھی اور آپ نے اپنے رب کو پکار کر تین بار فرمایا: " اللّٰھم اشھد " (اے اللہ گواہ رہنا) اس کے بعد آپ دوبارہ مجمع کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

" دیکھو! میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ تم مسلمان ہو کر آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے صحابی اور آپ کے متبنیٰ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے حضور ہی کے حکم سے جب قبیلہ جہینہ پر حملہ کیا تو ان میں سے ایک شخص نے "لا الہ الا اللہ" پڑھنا شروع کر دیا، حضرت اسامہ نے سمجھا کہ یہ شخص محض جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھ رہا ہے (اور بظاہر تھا بھی ایسا ہی) اس لیے آپ نے اسے قتل کر دیا، جب یہ لشکر مدینہ واپس آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے واقعہ کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا:

" کیا تم نے اسے لا الہ الا اللہ کہنے کے باوجود قتل کر دیا؟" حضرت اسامہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ تو جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھ رہا تھا، آپ نے پھر فرمایا: "ارے! تم نے اس کی زبان سے لا الہ الا اللہ سننے کے باوجود اسے قتل کر دیا۔" اسامہ کہتے ہیں آپ نے یہ بات اتنی بار ارشاد فرمائی کہ میں تمنا کرنے لگا۔

اے کاش! میں نے آج سے پہلے اسلام قبول نہ کیا ہوتا۔ (یعنی کاش! یہ عمل مجھ سے قبول اسلام کے بعد نہیں بلکہ زمانہ کفر میں صادر ہوا ہوتا) (بخاري : ٦٨٧٢)

اگر یہ شخص مسلمان تھا بھی تو چند لمحوں کا مسلمان تھا، اس نے حال ہی میں اسلام قبول کیا تھا، مگر چند لمحوں کے مسلمان کے قتل کو بھی آپ نے برداشت نہ فرمایا، اس سے ان لوگوں کی سنگدلی اور شقاوت کا اندازہ لگایئے جو ساٹھ اور ستر سال کے مسلمان کا خون بہانے سے بھی

نہیں چوکتے بلکہ آج کل تو علماءِ حق کے قتل کا سلسلہ بھی زوروں پر ہے، حالانکہ انبیاء اور صلحاء کو قتل کرنا، یہود جیسی لعنتی قوم کا شیوہ ہے۔

ابوداؤد کی ایک روایت میں سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کے قتل کو نا قابل معافی جرم قرار دیا ہے، حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ''امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر گناہ معاف فرمادے گا، سوائے اس شخص کے جس کا حالت شرک میں انتقال ہوا یا وہ مسلمان جس نے دوسرے مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کیا۔'' (ابو داؤد : ٤٢٧٠)

چونکہ یہ بات بھی آیات اور احادیث ہی سے ثابت ہے کہ ہر مسلمان کو بالآخر جنت میں جگہ مل بھی جائے گی خواہ وہ کتنا ہی گناہگار کیوں نہ ہو، اس لیے علماء نے مذکورہ بالا حدیث کے بارے میں پہلی بات تو یہ فرمائی ہے کہ مسلمان کے قاتل کو اللہ تعالیٰ اس وقت تک معاف نہیں فرمائیں گے جب تک کہ مقتول خود اپنے قاتل کو معاف نہ کردے، دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ یہ وعید ان لوگوں کے بارے میں ہے جو کسی مسلمان کے قتل کو جائز سمجھتے ہیں، نسائی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے نزدیک پوری دنیا کا ختم ہوجانا ایک مسلمان کے قتل کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے۔ (النسائي : ٨٢)

مسلمان کو قتل کرنا تو بہت بڑی بات ہے، مسلمان پر صرف ہتھیار اٹھانے والے کے بارے میں بھی ایسی شدید وعید آئی ہے کہ اسے سن کر ایک سچے مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے ہمارے اوپر ہتھیار اٹھایا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

(بخاري : ٦٨٧٤)

احادیث کے علاوہ قرآنی آیات کا مطالعہ کریں تو ان میں بھی مومن کے قتل کی شدید مذمت کی گئی ہے بلکہ جتنے سخت الفاظ مومن کے قاتل کے بارے میں استعمال کیے گئے ہیں شاید کسی بھی دوسرے گناہ کے مرتکب کے بارے میں استعمال نہیں کیے گئے۔

سورہ نساء میں ہے: ''جو شخص مسلمان کو قصداً قتل کرے گا تو اس کی سزا دوزخ ہے، جس میں وہ ہمیشہ جلتا رہے گا' اللہ کا اس پر غضب ناک ہوگا اور اس پر لعنت کرے گا اور ایسے شخص کے لیے اس نے بڑا سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔'' (النسآء : ۹۳)

جیسے مسلمان کو قتل کرنا حرام ہے اسی طرح اس کے قتل میں اعانت کرنا، کسی کو اس پر آمادہ کرنا، بڑھکانا یا کوئی بھی ایسی بات کہنا جو اس کے قتل کا سبب بن جائے یہ بھی حرام ہے۔

آخر میں یہ بھی جان لیں کہ اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے نوزائیدہ بچے کو قتل کرنا یا جان پڑ جانے کے بعد اسقاط حمل کرنا یہ بھی ایک مسلمان کا قتل ہے اس لیے کہ ہر بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔

لہو ولعب

عربی زبان میں لہو کا اطلاق ہر ایسی چیز پر ہوتا ہے جو انسان کو غافل کر دے اور لعب کا لفظ سنجیدگی کی ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے یعنی ہر ایسا عمل جس سے کوئی قابلِ لحاظ نفع مقصود نہ ہو۔ قرآن کریم میں دنیا کی زندگی کو لہو ولعب قرار دیا گیا ہے، سورۂ عنکبوت میں ہے:

"دنیا کی زندگی تو بس لہو ولعب ہے، اصل زندگی تو آخرت کا گھر ہے، کاش یہ لوگ سمجھتے۔"

(سورة العنكبوت : ٦٤)

جس انسان کے پیشِ نظر کوئی اعلیٰ نصب العین اور مقصد نہ ہو اس کی زندگی لہو ولعب اور کھیل تماشا ہوتی ہے اور جو کسی بڑے مقصد کو سامنے رکھ کر زندگی گزارے اس کا کھیل کود بھی اجر وثواب کا باعث بن جاتا ہے، ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزوں کے علاوہ ہر لہو کو باطل قرار دیا ہے یعنی انسان کا اپنے گھوڑے کو سدھانا، اپنے اہل وعیال کے ساتھ کھیل کود اور ہنسی مذاق کرنا اور تیر اندازی کرنا۔ گھوڑے کی تعلیم وتربیت اور تیر اندازی میں مہارت جہاد کے لئے ضروری ہے اس لئے اس میں جو وقت لگے گا وہ عبادت میں شمار ہوگا، اسی طرح انسان پر اہل وعیال کے جو حقوق شریعت نے لازم کیے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ ان کی دلجوئی اور موانست کے لئے بھی کچھ وقت فارغ کیا جائے غالی شخص شریعت کے مزاج کو نہیں سمجھتا اسے بظاہر یہ کام لغو اور فضول دکھائی دیتا ہے لیکن ہمارے سامنے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ موجود ہے، باوجودیکہ آپ کے قلب ودماغ پر امت اور پوری انسانیت کی فکر مسلط تھی اور آخرت کے تصور سے آپ لرزہ براندام رہتے تھے پھر بھی آپ اپنی تمام ازواج کے حقوق کی ادائیگی اور دلبستگی کے لئے کچھ وقت ضرور فارغ فرماتے تھے، یہاں تک کہ تمام ازواج کو جمع فرما کر بعض اوقات ایسی مجلس بھی آراستہ فرماتے تھے

جس میں قصے کہانیاں اور ہلکے پھلکے لطائف وظرائف سنے اور سنائے جاتے تھے۔

لا یعنی، فضول اور بے مقصد کاموں میں خداداد صلاحیتوں کو ضائع کرنے کی جو قباحت ہے اسے سمجھانے کے لئے ہم اپنے قارئین اور قاریات کی خدمت میں سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی چند احادیث پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ''عرج'' کے مقام پر جا رہے تھے کہ ایک شاعر سے ملاقات ہوگئی جس نے از خود ہی اپنے اشعار سنانا شروع کر دیئے، آپ نے فرمایا: ''پکڑو! اس شیطان کو یا یہ کہ روکو اس شیطان کو، کسی انسان کے پیٹ کا پیپ سے بھرا ہونا اشعار سے پُر ہونے سے بہتر ہے۔''

(بخاري : ٦١٥٤، ٦١٥٥)

یقیناً جس شاعری کی آپ نے مذمت فرمائی ہے اس سے مراد لغو، بیہودہ اور ایسی شاعری ہے جو مقصدیت سے خالی ہو۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل دنیا میں ایسی ہی شاعری کا چلن تھا، عالی دماغ شعراء اپنی ادبی اور ذہنی صلاحیتیں عشق وفسق کی ترویج کیلئے استعمال کرتے تھے یا ستم پیشہ بادشاہوں کا قرب حاصل کرنے اور جنگ وجدل کے شعلوں کو ہوا دینے کے لئے، انسانیت کی فلاح و بہبود، خیر کی اشاعت اور شر کی روک تھام عام طور پر ان کے پیش نظر نہیں تھی، ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں کے فطری ادبی ذوق کی حوصلہ شکنی نہیں فرمائی بلکہ اس کا رخ موڑ دیا جس کے نتیجے میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ جیسے ثناخواں اور نعت گو شاعر پیدا ہوئے، گویا جو چیز محض لہو ولعب تھی آپ نے اسے دعوتِ حق کا موثر ذریعہ بنا دیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو کبوتر کا تعاقب کرتے ہوئے دیکھا تو فوراً فرمایا ایک شیطان ہے جو دوسرے شیطان

کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ (ابو داؤد: ٤٩٤٠)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کبوتر بازی بڑا قدیم کھیل ہے زمانۂ جاہلیت میں بھی اس کا رواج تھا، ہمارے زمانے میں بھی اس کا شوق پایا جاتا ہے، جو لوگ اس میں دلچسپی رکھتے ہیں بسا اوقات وہ اپنا سب کچھ اس شوق کی نذر کر دیتے ہیں، کبوتروں کو اڑانے کے مقابلے ہوتے ہیں جن میں شرطیں لگا کر حصہ لیا جاتا ہے کبوتر بازوں کی نظریں آسمان پر رہتی ہیں چھتوں کا پھلانگنا بلکہ چھتوں سے گر کر ٹانگیں تڑوانا بھی ان کے شوقِ فضول کا حصہ ہوتا ہے۔

اگر ہم اسلامی تعلیمات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کریں تو بعض مروجہ کھیلوں خصوصاً کرکٹ کو بھی ''لہو ولعب'' میں شمار کرنا ہوگا، جن نوجوانوں کی رگ رگ میں اس کا شوق سما جاتا ہے وہ بھی کبوتر بازوں کی طرح اپنا سب کچھ اس پر قربان کر دیتے ہیں، انہیں نہ حقوق اللہ کی فکر ہوتی ہے نہ حقوق العباد کی، خود کرکٹ کھیلنا تو خیر بڑی بات ہے جن حضرات وخواتین کو کرکٹ کمنٹری سننے یا دیکھنے کا چسکا لگ جائے ان کا حال یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ نماز وغیرہ کو بھول جاتے ہیں، اگر پڑھتے بھی ہیں تو ذہن مسلسل کھیل کے اتار چڑھاؤ ہی کی طرف متوجہ رہتا ہے۔

حضرت شرید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''جو شخص بلا مقصد کسی چڑیا کا شکار کرے گا وہ چڑیا قیامت کے دن اللہ کے حضور شکایت کرے گی کہ یا رب! مجھے فلاں نے بلاوجہ مارا تھا، کوئی فائدہ اس کے پیش نظر نہیں تھا۔'' (النسائي: ٢٣٩)

اگر کسی جانور یا پرندے کا شکار گوشت کے حصول کے لیے کیا جائے تو جائز ہے لیکن محض نشانہ بازی کے لیے ایسا کرنا ہرگز جائز نہیں، بعض نقلی سورما جانور کو باندھ کر اس پر چاند ماری کرتے ہیں تو یہ ایسا ''لہو لعب'' ہے جو اللہ کی ناراضگی کا سبب ہے۔

ایک مسلمان کی سوچ یہ ہونی چاہئے کہ زندگی کا ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، اس

امانت کو وہیں استعمال ہونا چاہیۓ جہاں استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے' جو لوگ ''لہو ولعب'' پر اپنا وقت ضائع کرتے ہیں وہ امانت میں خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس شخص کا بیٹھنا اور لیٹنا اس حال میں ہو کہ وہ اللہ کو یاد نہ کرے تو اس پر اللہ کی طرف سے گناہ اور بوجھ ہوگا۔'' (ابو داؤد: ٤٨٥٦)

گویا مسلمان کو چاہیۓ کہ وہ ہر وقت اللہ کی یاد اور اس کے احکام کی تعمیل میں لگا رہے، جو شخص ظاہر و باطن کے اعتبار سے مومن ہے اس کی تجارت اور سیاست، نیند اور بیداری ''اللہ تعالیٰ کی یاد'' ہی میں شمار ہوگئی۔

آیات واحادیث کے مطالعہ سے لہو ولعب کے جو نقصانات سامنے آتے ہیں، اجمالی طور پر انہیں ذہن میں ضرور رکھ لیجیے!

١......لہو ولعب میں لگنے سے بتدریج بندے اور اس کے رب کے درمیان تعلق کمزور ہوتا جاتا ہے' یہاں تک کہ بعض اوقات یہ تعلق ختم ہی ہو جاتا ہے۔

٢......ایسا شخص شیطان کے جال میں پھنس کر رحمٰن کے ذکر سے دور ہو جاتا ہے۔

٣......انسان کو لہو ولعب' کشاں کشاں باطل کی طرف لے جاتا ہے۔

٤......یہ ناجائز مصرف پر مال کے ضائع کرنے کا سبب بنتا ہے۔

٥......لہو ولعب مسلمان کے اوقات کو بلا فائدہ ضائع کرتا ہے اور اسے طاعات اور حسنات سے محروم کر دیتا ہے۔

٦......اس کی وجہ سے دل میں نفاق کی کاشت ہوتی ہے۔

٧......لہو ولعب میں جی لگانے والے کی شخصیت لوگوں کی نظر میں کھلونا بن جاتی ہے اور اسے حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ (نضرة النعیم: ١١/٥٥٣٩)

قساوت

قساوت کا معنٰی ہے دل کا سخت اور حق کی اتباع سے دور ہو جانا۔ جاحظ رحمہ اللہ نے قساوت کا مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ دوسروں کو تکلیف اور پریشانی میں دیکھ کر متأثر نہ ہونا اور اسے معمولی بات سمجھنا۔ (تهذيب الاخلاق : ۳۰)

ایک حدیث میں قساوت کی چار نشانیاں بتائی گئی ہیں:

- جمودِ عین...... خوفِ خدا کی وجہ سے آنکھوں سے آنسو نہ بہیں، آنکھیں خشک ہو کر رہ جائیں۔
- صلابتِ قلب...... دل سخت ہو جائیں اور ان میں رقت اور نرمی باقی نہ رہے۔
- طولِ امل...... لمبی امیدیں اور پروگرام۔
- حرصِ دنیا...... دنیا کا کمانا ضرورت کی بناء پر نہ ہو بلکہ محض حرص و ہوس اس کی بنیاد ہو۔

آج ہم امت کی اکثریت میں یہ چاروں نشانیاں دیکھ رہے ہیں، وہ امت جس کی آہ و بکا سے مسجدوں کے گوشے اور خلوت گاہیں گونجا کرتی تھیں، آخرِ شب میں صرف شبنم ہی گلوں کا منہ نہیں دھلایا کرتی تھی، چشمِ مسلم سے گرنے والے اشک ہائے ندامت بھی چمنستانِ قلب کو معطر کیا کرتے تھے، اس امت کا حال یہ ہے کہ ہزاروں مسلمانوں سے بھری ہوئی مسجد میں شاید ہی اللہ تعالیٰ کا کوئی ایسا بندہ دکھائی دے جو بارگاہِ عالی میں آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرے حالانکہ یہ وہ نذرانہ ہے جو کبھی ٹھکرایا نہیں جاتا...... یہی حال بقیہ تین نشانیوں کا ہے کہ وہ مسلمانوں کی اکثریت میں بتمامہ پائی جاتی ہیں، دل ایسے سخت ہو گئے ہیں کہ نہ قرآنی آیات سے متاثر ہوتے ہیں، نہ احادیثِ نبویہ سے۔

ہماری آنکھوں کے سامنے روزانہ جنازے اٹھتے ہیں بلکہ ہمیں انہیں کندھا دینے کی ''سعادت'' بھی حاصل ہوتی ہے مگر اپنی قبر یاد نہیں آتی، ذکر و دعاء اور نماز میں نہ جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں نہ دل میں رقت پیدا ہوتی ہے، بھری مسجد میں شاید ہی کوئی خشوع اور خضوع کے ساتھ نماز پڑھنے والا دکھائی دے، ہم درد والم میں مبتلا امت کو دیکھتے ہیں مگر اس کا درد اپنے سینے میں محسوس نہیں کرتے۔

طولِ امل کا حال یہ ہے کہ ہمارے اکثر بھائی بہنوں نے ایسے لمبے منصوبے اور پروگرام بنا رکھے ہیں کہ اگر انہیں عمرِ نوح بھی مل جائے تو منصوبوں کی تکمیل سے پہلے ختم ہو جائے، حرصِ دنیا کا بھی یہی حال ہے، شاید ہی کوئی سعادت منداس سے پاک ہو ورنہ جدھر نگاہ اٹھائیں حرص وہوس کا جادو سرچڑھ کر بول رہا ہے، اس بیماری نے ذلت اٹھانا، حرام کمانا اور ایک دوسرے کا خون بہانا آسان کر دیا ہے۔

غرضیکہ قساوتِ قلبی کی چاروں علامات ہمارے اندر پائی جاتی ہیں۔ یہ قساوت کوئی معمولی بیماری نہیں، یہود میں یہی بیماری پیدا ہوگئی تھی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نشانیاں کھلی آنکھوں سے دیکھیں، نعمتوں کی موسلا دھار بارش ان پر برستی رہی لیکن نہ شکر کی توفیق ملی نہ عبادت اور عبودیت کی، نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔ سورۃ بقرہ/۷۴ میں ہے: ''پس وہ پتھروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت، بعض پتھر ایسے ہوتے ہیں جن سے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو پھٹتے ہیں تو ان سے پانی نکل آتا ہے اور بعض ایسے ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔''

یہود کے سامنے پتھروں کے پھٹنے، ان سے چشمے بہنے اور خوفِ خدا سے گرنے کی جو کیفیات ذکر کی گئیں تو ان کے لئے ان ساری حالتوں کا سمجھنا بہت آسان تھا اس لئے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس پتھر کو بھی دیکھ چکے تھے جس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے تھے اور اس

پہاڑ کا بھی نظارہ کر چکے تھے جس پر تجلیِ الٰہی پڑی تھی تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔

اہلِ علم کہتے ہیں کہ تین قسم کے پتھروں کا ذکر فرما کر سمجھایا گیا ہے کہ جو لوگ کتاب اور علمِ کتاب کے حامل ہوں، ان کا حال یہ ہونا چاہئے کہ دور دور کے لوگ ان سے استفادہ کریں، اگر ایسا ممکن نہ ہو تو قرب وجوار والے تو ضرور مستفید ہوں، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم صاحبِ علم کی اپنی زندگی میں تو علم کا اثر ضرور دکھائی دینا چاہئے لیکن جب کثرتِ گناہ کی وجہ سے دلوں پر قساوت چھا جائے تو پھر ان میں سے کوئی صورت بھی رو بعمل نہیں آتی۔

دل کی قساوت کتنی بڑی شقاوت اور غضبِ الٰہی ہے؟ اس کا اندازہ ترمذی کی اس روایت سے ہوتا ہے جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ذکر اللہ کے علاوہ زیادہ کلام نہ کیا کرو کیونکہ ذکر اللہ کے علاوہ کثرتِ کلام دل کی قساوت کا سبب ہے اور انسانوں میں اللہ سے سب سے زیادہ دور وہ شخص ہے جس کا دل سخت ہو۔'' (ترمذي : ٢٤١١)

عام لوگ آسمان سے پتھر برسنے، زمین سے چشمے ابلنے اور شکلوں کے مسخ ہونے ہی کو اللہ تعالیٰ کا عذاب کہتے ہیں حالانکہ عذابِ الٰہی کی بے شمار صورتیں ہیں:

یہ عدل وانصاف کا فقدان، یہ فرقہ واریت کا جنون، یہ ظالم حکمرانوں کا تسلط، یہ کفار اور مشرکین کا استیلاء، یہ مہنگائی کا طوفان، یہ گھر گھر میں لڑائی جھگڑے، یہ دلوں کی قساوت اور سختی عذاب ہی کی مختلف صورتیں ہیں، بنی اسرائیل نے جب اللہ تعالیٰ سے کیے گئے وعدوں کا لحاظ نہ کیا اور عہد شکنی کو انہوں نے اپنی عادت بنالیا تو ان پر عذاب کی دوسری صورتوں کے علاوہ قساوتِ قلبی کا عذاب بھی نازل کیا گیا تھا، سورۂ مائدہ میں ہے: ''بنی اسرائیل کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔''

(سورة المائدة : ١٣)

ہم میں سے ہر ایک کو اپنا اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ کہیں ہم بھی تو قساوتِ قلبی کی بیماری میں مبتلا نہیں ہو گئے؟ اگر خدانخواستہ ایسا ہے تو ہمیں اس بیماری کے علاج پر سنجیدگی سے توجہ دینی چاہئے، قرآن کریم کی تلاوت، موت کو یاد کرنا اور ذکر اللہ کی کثرت قساوت کا بہترین علاج ہیں۔

مسند احمد کی ایک حدیث میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دل کی سختی کا علاج بتلایا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک صاحب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی قساوتِ قلبی کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: ''اگر تم اپنے دل کو نرم کرنا چاہتے ہو تو مسکین کو کھانا کھلاؤ اور یتیم کے سر پر ہاتھ رکھو!'' (مسند أحمد : ۲/۲۶۳)

ظاہر ہے قساوت کا علاج صرف ان دو اعمال میں منحصر نہیں بلکہ علاج تو اور بھی ہیں مگر ممکن ہے جن صاحب نے سوال کیا تھا ان کے حال کے مناسب یہی علاج ہو اس لئے کہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم حکیم بھی تھے اور مزاج شناس بھی تھے، نفسیات پر بھی آپ کی نظر خوب گہری تھی، اس لئے ہر شخص کو اس کے حالات کے مطابق جواب عنایت فرماتے تھے۔

اس ساری بحث سے ثابت ہوا کہ:

- قساوت دل کی نرمی، رحمت اور خشوع کو ختم کر دیتی ہے۔
- قساوت والا انسان اللہ تعالیٰ سے بھی دور ہوتا ہے اور انسانوں سے بھی۔
- قساوت نعمتوں سے محروم کر دیتی ہے اور انسان کو غضب کا مستحق بنا دیتی ہے۔

(نضرة النعيم : ۱/۵۳۲۸)

علانیہ گناہ

انبیاء تو معصوم ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کا مزاج اور طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ وہ گناہ سے دور رہتے ہیں، انبیاء کے علاوہ ہر کسی سے گناہ ہوسکتا ہے، انسان سے گناہ کا صدور انہونی بات نہیں، اگر وہ نادم ہوکر توبہ کرلے تو پھر وہ زبانِ نبوت میں ''بہترین گناہ گار'' ہے، لیکن انسان کا علانیہ گناہ کرنا اس کی بے باکی، اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں جرأت اور شرم وحیا کے فقدان کی دلیل ہے، اسی لئے سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ناقابلِ معافی جرم قرار دیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میری امت کے ہر فرد کو معاف کردیا جائے گا سوائے علانیہ گناہ کرنے والوں کے، علانیہ گناہ میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان رات کو کوئی برا عمل کرے اللہ اس پر پردہ ڈال دے لیکن وہ اپنی پردہ دری کرتے ہوئے خود ہی لوگوں کو بتاتا پھرے کہ میں نے آج رات فلاں گناہ کیا ہے۔''

''مجاہرت'' یعنی علانیہ گناہ کی علماء نے تین صورتیں بیان کی ہیں:

☆ پہلی صورت یہ ہے کہ سب کے سامنے گناہ کرنا جیسا کہ وہ لوگ کرتے ہیں جو بے حیا ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی حدود کے بارے میں لاپرواہ ہوتے ہیں، ایسا شخص جو حرام کاموں کا مرتکب ہوتا ہے، ایک معصیت کا اظہار اور دوسرے بے حیا انسانوں کے ساتھ مشابہت...... یہ کون نہیں جانتا کہ حیا اور ایمان لازم ملزوم ہیں، ایسا ہو نہیں سکتا کہ ایمان تو ہو مگر حیا نہ ہو، جب حیا باقی نہ رہے تو انسان کو معاصی کے ارتکاب سے روکنے والی صفت باقی نہیں رہتی۔

☆ دوسری صورت یہ ہے کہ انسان کے جن گناہوں پر اللہ تعالیٰ نے پردہ ڈال رکھا ہو وہ دوسروں کے سامنے ان گناہوں کو فخریہ طور پر بیان کرے، جب وہ دنیا میں اپنے آپ کو عریاں کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے تو قیامت کے دن بھی اسے سب کے سامنے عریاں کردیا جائے گا۔

☆ تیسری صورت یہ ہے کہ فاسق وفاجر لوگ آپس میں علانیہ معصیت پر مشتمل باتیں کریں۔ (نظرة النعيم : ١١/٥٥٤٨)

چھٹے پارے کی پہلی آیت کا مفہوم ہے: ''اللہ تعالیٰ بری بات کے اظہار کو پسند نہیں کرتا سوائے اس شخص کے جو مظلوم ہو۔''

یوں تو اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں مفسرین نے بہت کچھ لکھا ہے مگر ایک بات یہ بھی لکھی ہے کہ جو شخص علانیہ گناہ میں مبتلا ہو اس کی غیبت کرنا جائز ہے حالانکہ کون نہیں جانتا کہ غیبت بدترین گناہ ہے، قرآن کریم میں غیبت کرنے کو مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن علانیہ گناہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کی نظر میں ایسا حقیر اور لعنتی ہے کہ اس کی غیبت کرنے کی اجازت دی گئی ہے، ظاہر ہے جسے خود اپنی عزت وناموس اور شرعی حدود کا احساس نہیں، اس کی عزت دوسرے کیا کریں گے۔

جو شخص علانیہ گناہ کرتا ہے وہ حقیقت میں گناہ کی سراپا دعوت بن جاتا ہے، وہ گویا سارے معاشرے کو معصیت کی غلاظت میں آلودہ کرنا چاہتا ہے اور جو بدبخت ایسا کرتے ہیں باری تعالیٰ نے ان کے لئے دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ سورۂ نور میں ہے: ''جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی پھیلے، ان کے لئے دنیا اور آخرت میں دکھ دینے والا عذاب ہوگا اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔'' (سورة النور : ١٩)

کتنے دکھ کا مقام ہے کہ آج مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کے آئیڈیل وہی لوگ ہیں جو ٹی وی، اسٹیج اور فلموں کے ذریعے بے حیائی پھیلاتے ہیں اور برسرِ عام اللہ تعالیٰ کے احکام کی بے حرمتی اور گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں، اپنے عشق اور فسق کی اسٹوریاں اخبارات میں شائع کروا کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے غلاظت اور معصیت سے اَٹی ہوئی راہ منتخب کی ہے، اس پر پوری قوم کو چلانا چاہتے ہیں، وہ شاید اپنی کج فہمی اور جہالت کی وجہ سے نہیں جانتے کہ جس قوم میں فسق و فجور عام ہو جائے اس قوم پر صلحاء اور علماء کی موجودگی کے باوصف اللہ کا عذاب نازل کیا جاتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اس امت کے آخری دور میں خسف، مسخ اور قذف (زمین میں دھنسا دینے، صورتیں بگاڑ دینے اور پتھر برسنے) کے واقعات پیش آئیں گے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا صلحاء کی موجودگی کے باوصف ہم ہلاک ہو جائیں گے؟ آپ نے فرمایا ہاں جب خباثت عام ہو جائے گی!'' (ترمذي : ٢٦٤١)

پہلی قوموں میں بھی ایسا ہی ہوا، جب ان کے فساق و فجار نے علی الاعلان احکامِ الٰہیہ کو پامال کرنا شروع کیا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والوں نے بتدریج حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے اپنی زبانوں پر تالے ڈال لیے تو کیا نیک اور کیا بد سب ہی آسمانی عذاب کی لپیٹ میں آکر رہے۔ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیش گوئی کو ہم اپنی آنکھوں سے پورا ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، جس میں آپ نے فرمایا تھا: ''میری امت پر ویسا ہی وقت آکر رہے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر آیا (دونوں میں وہی مشابہت ہوگی) جیسے ایک جوتا دوسرے کے مشابہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان میں سے کسی نے اپنی ماں کے ساتھ علانیہ زنا کیا ہوگا تو میری امت میں سے بھی کوئی ایسا کرے گا۔''

(الموطا: ۹۹۱/۲)

کتاب وسنت کی تصریحات کے بعد مستند علماء اور محدثین کے چند اقوال بھی ملاحظہ فرمائیں:

☆ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اہلِ علم کا یہ قول نقل فرمایا کرتے تھے "اللہ تعالیٰ خواص کے گناہوں کی وجہ سے عام لوگوں کو عذاب نہیں دیتا لیکن جب علانیہ گناہ کیے جائیں تو سب سزا کے مستحق ہو جاتے ہیں۔" (الفتح: ۵۰۲/۱۰)

☆ امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "جو شخص معصیت کے اظہار اور کھلے عام کرنے کا ارادہ کرتا ہے وہ اپنے رب کو ناراض کر دیتا ہے پھر اللہ بھی اس کی پردہ پوشی نہیں کرتا اور جو شخص اللہ سے اور انسانوں سے حیا کرتے ہوئے گناہ کو چھپاتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس پر پردہ ڈال دیتا ہے۔" (الفتح: ۵۰۲/۱۰)

☆ ابن بطال رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "علانیہ معصیت کے ارتکاب میں اللہ، اللہ کے رسول اور صلحاء مؤمنین کا استخفاف اور ان کے ساتھ ایک قسم کا عناد بھی ہے (کہ تم گناہ سے روکتے ہو میں کھلے عام کر کے دکھاؤں گا) لیکن گناہ کو چھپانے میں کم از کم استخفاف والی صورت نہیں پائی جاتی۔ اگر دنیا میں اللہ تعالیٰ گناہ کی پردہ پوشی کرے تو اس کی رحمت سے امید رکھنی چاہیے کہ وہ آخرت میں بھی پردہ پوشی فرمائے گا، لیکن علانیہ گناہ کرنے والا پردہ پوشی کا حقدار نہیں ہے۔" (نضرة النعيم: ۵۰۰٤/۱۱، ۵۰۰۵)

جو شخص علانیہ گناہ کے درج ذیل نقصانات پر نظر رکھے گا، امید ہے کہ وہ کھلم کھلا گناہ کرنے سے ضرور بچے گا:

۱- علانیہ گناہ کرنے والا بے حیا ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرتا ہے۔

۲- وہ اپنے آپ کو باری تعالیٰ کے عفو ودرگزر سے محروم کر لیتا ہے۔

۳- کھلے عام اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والے انسانوں کی نظر میں حقیر اور ذلیل ہوجاتے ہیں، صلحاء نہ تو ان سے بات چیت کرتے ہیں نہ انہیں سلام کرتے ہیں۔

۴- برسرِعام گناہوں کے ارتکاب سے سوسائٹی پر ناقابلِ تصور برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

۵- قیامت کے دن اسے برسرِ محشر ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

آخر میں یہ بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بے پردگی، مردوزن کا آزادانہ اختلاط اور ڈاڑھی منڈانا بھی ''علانیہ گناہوں'' میں شامل ہیں۔

نا اُمیدی

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کو کسی حالت میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ وہ ملاح جس کی کشتی طوفانی موجوں میں پھنس چکی ہو، وہ مریض جو کسی لاعلاج مرض میں مبتلا ہو اور اسے ڈاکٹروں اور حکیموں نے جواب دے دیا ہو، وہ غریب اور بیروزگار انسان جسے چاروں جانب روزگار کے دروازے بند ہوتے محسوس ہوں، وہ لاولد جوڑا جس کی شادی کو کئی برس گزر گئے ہوں مگر نخلِ تمنّا کے بارآور ہونے کی کوئی صورت دکھائی نہ دے، وہ سپہ سالار جسے طاقتور حریف کا سامنا ہو اور اسے فتح کوسوں دور دکھائی دیتی ہو، وہ گناہ گار بوڑھا جس کے شب و روز گناہوں میں بسر ہوئے ہوں اور اب موت کی آہٹ بہت قریب سنائی دیتی ہو، اسلام ان سب کے دل میں امید کا چراغ روشن کرتا ہے اور انہیں مایوسی سے پناہ مانگنے کی تلقین کرتا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب اپنے گم گشتہ بیٹے کے بارے میں اپنے دوسرے بیٹوں کو مایوسی کی باتیں کرتے ہوئے سنا تو فرمایا: "اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ بے شک اللہ کی رحمت سے صرف کافر ہی ناامید ہوتے ہیں۔"

حضرت زکریا علیہ السلام کی عمر ۹۵ سال ہو چکی تھی، داڑھی اور سر کے بال سفید ہو گئے، جسم میں طاقت باقی نہ رہی تھی، اہلیہ بھی بوڑھی اور بانجھ تھی، خود انہیں بھی بڑھاپے نے آلیا تھا، مگر اس کے باوجود مایوس نہ ہوئے اور رب العلمین کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے عرض کیا: "اے میرے پروردگار! میری ہڈیاں بڑھاپے کے سبب کمزور ہو گئی ہیں اور سر شعلہ مارنے لگا ہے اور اے میرے پروردگار! میں تجھ سے مانگ کر کبھی محروم نہیں رہا۔"

(سورة المريم : ٤)

چنانچہ اس بار بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں محروم نہ کیا اور انہیں بیٹے کی خوشخبری سنادی، اس خوشخبری نے خود انہیں تعجب میں مبتلا کر دیا، انہوں نے شدید خوشی کے عالم میں سوال کیا:

''انہوں نے کہا میرے پروردگار! میرے ہاں کس طرح لڑکا ہوگا جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ گیا ہوں۔'' (سورۃ المریم : ۸)

مقصد یہ تھا کہ کیا جوانی لوٹا کر بیٹا عطا کیا جائے گا یا بڑھاپے ہی کی حالت میں جھولی بھر دی جائے گی۔ جواب آیا ''اسی طرح ہوگا، تمہارے پروردگار نے فرمایا ہے کہ میرے لئے یہ آسان ہے اور میں تم کو پہلے بھی تو پیدا کر چکا ہوں اور تم کچھ چیز نہ تھے۔''

(سورۃ المریم : ۹)

اگر چہ تمام انبیاء کرام نے رحمتِ باری سے امید ہی کا سبق دیا تھا، لیکن انبیاء کی حقیقی تعلیمات سے محروم ہونے اور ان کے اندر اپنی خواہشات کی آمیزش اور تحریفات کر دینے کی وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوسی کی ایک عام فضا چھائی ہوئی تھی، ہندوستان میں تناسخ (آواگون) کا فلسفہ ایک اٹل عقیدہ کی حیثیت رکھتا تھا، جس کی رو سے ہر انسان کو اپنے پہلے جنم کے گناہوں کی سزا بھگتنی ضروری ہے، عیسائیت کی تعلیم کے زیرِ اثر مسیحیوں کے ذہن میں یہ بات بٹھادی گئی تھی کہ ہر انسان پیدائشی گناہگار ہوتا ہے، مایوسی کی اس عمومی فضا میں سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری طاقت اور صفائی سے اعلان کیا کہ ہر بچہ معصوم پیدا ہوتا ہے، کوئی بھی انسان دوسرے کے عمل کا ذمہ دار یا جواب دہ نہیں ہے، بڑے سے بڑا گناہ گار بھی اگر اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے ان پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے اللہ سے معافی مانگ لے تو اسے گناہوں سے ایسے پاک کر دیا جاتا ہے گویا اس نے کبھی گناہ کیا ہی نہیں تھا، آپ نے توبہ کے فضائل اور خدا کے دریائے رحمت کے جوش کا اس انداز میں بیان کیا کہ سالہا سال کے پاپی بھی توبہ کرنے پر

آمادہ ہو گئے، انہوں نے محسوس کیا کہ باری تعالیٰ اس بندے کا منتظر اور مشتاق ہے جو بغاوت کے بعد اطاعت اور معصیت کے بعد عبادت کے راستے پر چلنا چاہتا ہے، سورۂ زمر میں ہے: ''کہہ دیجئے! اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنے حق میں زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہ معاف کر دیتا ہے، بے شک وہ بڑا بخشنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔'' (سورۃ الزمر: ۵۳)

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں عجیب انداز میں خطا کاروں کو توبہ کی ترغیب اور مایوسی سے دور رہنے کی تلقین کی ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''اللہ کو اپنے مومن بندے کی توبہ سے اس شخص سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے جو کسی چٹیل اور خوفناک علاقے میں تھا اس کے ساتھ اس کی سواری بھی تھی جس پر اس کا سامانِ خورونوش تھا، وہ سو گیا، جب بیدار ہوا تو سواری دکھائی نہ دی، وہ اسے تلاش کرتا رہا، یہاں تک کہ اسے سخت پیاس لگ گئی، اس نے سوچا میں اس جگہ چلتا ہوں، جہاں میں پہلے سو رہا تھا، وہیں لیٹا رہتا ہوں یہاں تک کہ مجھے موت آ جائے، اس نے موت کے انتظار میں اپنا سر اپنے بازو پر رکھا اور سو گیا، آنکھ کھلی تو اس کی سواری سامنے موجود تھی، اس کا زادِ راہ اور خورونوش کا سامان بھی اس پر موجود تھا (گمشدہ سواری کے ملنے سے جتنی خوشی اسے ہوتی ہے) اس سے زیادہ خوشی اللہ تعالیٰ کو اپنے مومن بندہ کے توبہ کرنے سے ہوتی ہے۔

بعض اوقات انسان کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے یا غربت وغیرہ کی وجہ سے ایسا دل شکستہ ہو جاتا ہے کہ اسے موت ہی کی صورت میں ایک پناہ گاہ دکھائی دیتی ہے، بالخصوص ہمارے دور میں جبکہ ہر شخص پریشان دکھائی دیتا ہے، کوئی بیروزگاری کی وجہ سے اور

کوئی خاندانی اور گھریلو تنازعات کی وجہ سے مایوس ہو کر خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے یا کم از کم موت کی آرزو کرنے لگتا ہے مگر اسلام ان حالات میں بھی نہ تو خودکشی کی اجازت دیتا ہے اور نہ موت کی تمنا اور دعاء کی، کیونکہ یہ دونوں چیزیں مایوسی اور اللہ کی رحمت سے ناامیدی کو ظاہر کرتی ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی بھی کسی پریشانی کی وجہ سے موت کی آرزو نہ کرے، اگر بہت زیادہ مجبور ہو تو یوں دعاء کرے اے اللہ! جب تک میرے لئے زندگی بہتر ہے، مجھے زندہ رکھنا اور جب میرے لئے موت بہتر ہو تو مجھے موت دے دینا۔'' (صحیح بخاری)

ایک غزوہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے صاحب کے بارے میں اہلِ جہنم میں سے ہونے کی پیش گوئی فرمائی جو بظاہر بڑی جرأت سے مشرکوں کے ساتھ جنگ کر رہے تھے، چنانچہ صحابہ نے دیکھا کہ انہوں نے زخمی ہونے کے بعد خودکشی کر لی۔ (صحیح بخاری)

اسلام مصائب وآلام کے ہجوم میں راہِ فرار اختیار کرنے، شکستہ دلی اور خودکشی کی بجائے مردانہ وار ان کا مقابلہ کرنے کی تلقین کرتا ہے، اگر انسان حوادث اور امراض کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی عادت اپنا لیتا تو میڈیکل سائنس اور دوسرے شعبوں میں اس نے جو ترقی کی ہے وہ کبھی نہ کر پاتا، آپ نے زندگی کے میدان میں کتنے ہی معذوروں، بیماروں اور شدید زخمیوں کو دیکھا ہوگا جو محض قوتِ ارادی اور امیدِ فردا کے بل پر باعزت اور طویل زندگی گزار گئے اور کتنے ہی گناہ گار ہیں جو توبہ کرنے کے بعد منصبِ ولایت و ہدایت پر فائز ہو گئے، کتنے ہی ناممکن معرکے تھے جو انسان نے چراغِ امید کی روشنی میں سر کر لیے، ان سارے کارناموں کا سہرا اس مذہب کے ماتھے پر بندھتا ہے جس نے محض قنوطیت اور

یاسیت سے بچنے کی ترغیب پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ اسے گناہِ کبیرہ قرار دیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے سوال کیا یا رسول اللہ! کبائر کون سے ہیں؟ آپ نے فرمایا ''اللہ کے ساتھ شریک کرنا اور اس کی رحمت سے ناامید ہونا۔'' (ذكره الهيثمي في المجمع: ١/١٠٤)

آج جبکہ امت چاروں طرف سے حوادث میں گھری ہوئی ہے جس کے نتیجے میں مایوسی کے سائے دن بدن گہرے ہوتے چلے جارہے ہیں، اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر طرف امید کی شمع روشن کی جائے، ان شاء اللہ! اس شمع کی روشنی میں منزل تک پہنچنا آسان ہوجائے گا۔

وسوسہ

لغت میں وسوسہ انتہائی خفیہ آواز کو اور اصطلاح میں اس خیال کو کہتے ہیں جو شیطان کسی کے دل میں ڈال دیتا ہے راہِ راست سے ہٹانے کے لیے۔ وسوسہ شیطان کا ایک موثر ہتھیار ہے، حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام کے خلاف بھی اس نے یہی ہتھیار استعمال کیا تھا، ان دونوں کو جنت میں ٹھہرا کر اجازت دی گئی تھی کہ جو چاہو اور جتنا چاہو، کھاؤ پیو مگر فلاں) درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے، ابلیس نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا کہ تمہیں اس درخت کے قریب جانے سے اس لیے منع کیا گیا ہے کہ اگر تم نے اس درخت کا پھل کھالیا تو تم یا تو فرشتے بن جاؤ گے یا تمہیں جنت میں دائمی سکونت دے دی جائے گی، چنانچہ اپنی سادگی اور جنت کی محبت کی وجہ سے وہ اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گئے اور انہوں نے وہ پھل کھالیا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کے خلاف بھی شیطان یہی ہتھیار استعمال کرتا رہتا ہے، اسے تکبر اور حسد کی بناء پر جب راندہ درگاہ کیا جارہا تھا تو اس نے یہ کام کرنے کے لیے قیامت تک کی مہلت مانگی تھی جو کہ اسے دے دی گئی تھی لیکن انسان کو بھی اللہ تعالیٰ نے بے یارومددگار نہیں چھوڑا بلکہ اسے ایمان کی ڈھال اور ذکرِ الٰہی کا اسلحہ فراہم کیا گیا ہے، اگر وہ یہ ڈھال اور اسلحہ استعمال کرتا رہے اور اللہ کی مضبوط پناہ گاہ میں داخل ہو جائے تو ابلیس اس کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”شیطان انسان کے قلب پر چھا جاتا ہے، جب ابن آدم اللہ کو یاد کرتا ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب وہ غافل ہو جاتا ہے تو پھر وسوسہ اندازی کرتا ہے۔“

(بخاري بحواله ابن كثير : ٤/٥٧٥)

وسوسہ اندازی، کتنی مؤثر اور خطرناک چیز ہے؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ باری تعالیٰ نے قرآن کریم کی آخری سورت میں اپنی تین صفات سے ذکر فرما کر وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ''آپ فرما دیجئے میں پناہ مانگتا ہوں، انسانوں کے رب کی، انسانوں کے بادشاہ کی، انسانوں کے معبود کی، اس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو چھپ جاتا ہے، جو انسانوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے ہو۔'' (سورة الناس : ١ـ٦)

یہ سورت بتاتی ہے کہ صرف جنات اور شیاطین ہی وسوسہ اندازی نہیں کرتے بلکہ یہ کام انسان بھی کرتے ہیں۔ اہم مناصب پر فائز شخصیات کے مشیروں ہی کو لے لیجئے جو انہیں ظلم و ستم اور فتنہ وفساد پر اکساتے رہتے ہیں۔ انسان کے برے دوست گناہ کو اس کی نظروں میں پرکشش بنا کر پیش کرتے ہیں۔

آج کا میڈیا وسوسہ اندازی میں سب سے مؤثر کردار ادا کر رہا ہے، اس کا سب سے بڑا ہدف ایمان اور حیا ہے، فحاشی اور عریانیت اور اخلاقی قدروں سے بغاوت کو نئی نسل کی نظر میں مزین کر کے پیش کیا جاتا ہے، اخبارات اور رسائل اٹھا کر دیکھیں تو وہ بھی وسوسہ اندازی کی تحریک کے سرگرم کارکن دکھائی دیتے ہیں، ایسی رپورٹیں بھی آپ کی نظروں سے گزری ہوں گی جن میں بتایا گیا ہوگا کہ فلاں ملک اور علاقے میں ہزاروں بلکہ لاکھوں مسلمان دین حق سے برگشتہ ہو کر عیسائی بن گئے۔

یہ رپورٹیں اکثر و بیشتر جھوٹ پر مبنی ہوتی ہیں اور ان کا مقصد عام مسلمانوں کو ایمان کے بارے میں شکوک و اوہام میں مبتلا کرنا ہوتا ہے، آج کل انٹرنیٹ وسوسہ اندازی کی مہم میں پیش پیش ہے، اس کے ذریعے بے حیائی اور اخلاق باختگی کے علاوہ اسلامی تاریخ کی محسن

شخصیات کے بارے میں غلیظ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے، ایسا مواد پیش کیا جاتا ہے جس کے مطالعے کے بعد قرآن مجید، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے بارے میں بدگمانی پیدا ہو۔

وسوسہ کے بارے میں زبانِ نبوت سے نکلے ہوئے درج ذیل فرمودات کا مطالعہ بصیرت افروز ثابت ہوگا: صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وسوسہ کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ''یہ تو خالص ایمان ہے۔'' (مسلم: ۱۳۳)

اس جواب کا پس منظر یہ ہے کہ بعض صحابہ کرام غیر اختیاری طور پر دل میں برائی کا خیال آ جانے سے بہت پریشان ہو جاتے تھے (حالانکہ جو چیز انسان کے اختیار میں نہ ہو اس پر مواخذہ نہیں ہوتا) وہ برا خیال آنے پر کڑھتے تھے اور اس خیال کے روبعمل آنے سے اللہ کی پناہ مانگتے تھے، ایسے ہی لوگوں کو تسلی دینے کے لیے آپ نے فرمایا کہ تمہارا برائی کا خیال آنے پر پریشان ہونا ایمان کی نشانی ہے، جب تک اسے اپنے قول و عمل میں نہیں آنے دو گے، تم سے مواخذہ نہیں ہوگا۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ میری امت کے دلوں میں آنے والے وسوسوں سے درگزر فرماتا ہے جب تک کہ ان پر عمل نہ کریں یا انہیں زبان سے نہ نکالیں۔'' (بخاري: ۲۵۲۸)

بہت سے نمازیوں پر دوران نماز وساوس کی یلغار ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں انہیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ انہوں نے کتنی رکعت پڑھی ہیں اور کتنی باقی ہیں'' ایسے لوگوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو شیطان اسے اشتباہ میں ڈال دیتا ہے چنانچہ اسے یاد نہیں رہتا کہ اس نے کتنی رکعات

پڑھی ہیں، اگر کسی کو یہ صورتحال پیش آئے تو اسے بیٹھے بیٹھے (سہو کے طور پر) دو سجدے کر لینے چاہئیں۔'' (بخاري : ۱۲۳۲)

غیر اختیاری وسوسہ ایک ایسی چیز ہے جو برے انسان کے دل میں بھی آ سکتا ہے اور نیک انسان کے دل میں بھی آ سکتا ہے لہٰذا جسے وسوسہ کا سامنا کرنا پڑے اسے یہ ہرگز نہیں سوچنا چاہئے کہ میں ایمان سے محروم ہو گیا ہوں، نہ ہی اپنی اصلاح کے بارے میں مایوس ہونا چاہئے۔

ایک موقع پر جبکہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے دل میں وسوسہ آ گیا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ''کیا تمہارے پاس تمہارا شیطان آ گیا تھا؟ انہوں نے پوچھا: ''یارسول اللہ! کیا میرے ساتھ بھی شیطان ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں! انہوں نے عرض کیا، کیا ہر انسان کے ساتھ شیطان ہوتا ہے؟ آپ نے اس سوال کا جواب بھی اثبات میں دیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا، کیا آپ کے ساتھ بھی ہے؟ آپ نے فرمایا میرے ساتھ بھی ہے لیکن میرے رب نے میری خصوصی مدد فرمائی، جس کی وجہ سے وہ میرے تابع ہو گیا ہے۔'' (مسلم : ۲۸۱۵)

کئی دوسری احادیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ابلیس انبیاء اور صلحاء کے دلوں میں بھی وسوسہ اندازی کی کوشش کرتا ہے، جب اللہ کے مخصوص بندے محفوظ نہیں تو ہم آپ کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

غیر اختیاری طور پر برائی کا وسوسہ آ جانا اتنی خطرناک چیز نہیں کہ اس کی وجہ سے انسان مایوس اور دل شکستہ ہو کر بیٹھ جائے، خطرے کی بات یہ ہے کہ اس وسوسہ کو زبان پر لے آئے یا اسے عملی شکل دیدے یا یہ کہ بالقصد برائی کے بارے میں سوچتا اور اسکے منصوبے بناتا رہے۔

وسوسہ کا ایک علاج تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے حفاظت کی دعاء کی جائے، دوسرا علاج یہ ہے کہ انسان امور خیر کے بارے میں سوچتا رہے اگر اس کے باوجود وسوسہ آ جائے تو زیادہ پریشان نہ ہو، تجربہ یہ ہے کہ انسان جتنا پریشان ہوتا ہے شیطان اتنا ہی اس پر مسلط ہوتا ہے۔

فتنہ

''ف،ت،ن'' کا مادہ ابتلاء اور امتحان کے معنی پر دلالت کرتا ہے، قرآن کریم میں فتنہ کا لفظ کفر وشرک، ابتلاء وآزمائش، عذاب وسزا، ضلالت وگمراہی، معذرت اور گناہ، آگ میں جلائے جانے اور بیماری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''فتن'' کا اصل معنی یہ ہے کہ سونے کو آگ میں ڈال دیا جائے تا کہ کھوٹا اور کھرا، جودت اور رداءت الگ الگ ہو جائے۔

(المفردات للراغب)

فتنہ کا اطلاق مال، اولاد، عہدہ ومنصب اور قوت وطاقت پر بھی کیا جاتا ہے کیونکہ ان کے ذریعے انسان کی آزمائش ہوتی ہے اور پتہ چل جاتا ہے کہ وہ عدل وتقویٰ کی راہ پر قائم رہتا ہے یا ظلم اور فسق وفجور کا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: فتنہ کی بڑی قسمیں دو ہیں: فتنۂ شبہات اور فتنۂ شہوات۔ شبہات کا فتنہ زیادہ خطرناک ہے، ایسے بدنصیب بھی ہوتے ہیں جو بیک وقت شبہات اور شہوات کے فتنہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ شبہات کا فتنہ، ضعفِ بصیرت اور قلتِ علم کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے بالخصوص جبکہ ایسا شخص نیت کے فساد اور خواہش پرستی میں بھی مبتلا ہو تو وہ انتہائی قابلِ رحم ہوتا ہے۔

اس فتنہ کا انجام کفر ونفاق ہے، حقیقت میں یہ منافقوں اور اہلِ بدعت کا فتنہ ہے، وہ بدعت کا راستہ ان شبہات کے فتنہ کی وجہ سے اختیار کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان پر حق اور باطل، ہدایت اور ضلالت مشتبہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اس فتنہ میں ابتلا کبھی فہم کی خرابی، کبھی جھوٹی روایات، کبھی فاسد اعتراض اور باطل

خواہشات اور کبھی انسان پر حق کے اوجھل ہو جانے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

فتنۂ شبہات سے نجات کی صرف ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی جائے اور آپ کو دین کے ہر معاملے میں حکَم تسلیم کرلیا جائے خواہ وہ خفی ہو یا جلی، ظاہر ہو یا باطن، عقائد ہوں یا اعمال...... جب ایسا کیا جائے گا تو شبہات کی بیماری سے نجات مل جائے گی اور ایمان کی حقیقت اور اسلامی شریعت کی معیت نصیب ہوگی۔

فتنہ کی دوسری قسم فتنۂ شہوات ہے، باری تعالیٰ نے ان دونوں فتنوں کا ذکر سورۂ توبہ کی اس آیتِ کریمہ میں کیا ہے: ''(تم منافق لوگ) ان لوگوں کی طرح ہو جو تم سے پہلے ہو چکے ہیں، وہ تم سے بہت طاقتور اور مال واولاد میں کہیں زیادہ تھے تو وہ اپنے حصے سے بہرہ یاب ہو چکے جس طرح تم سے پہلے لوگ اپنے حصے سے فائدہ اٹھا چکے ہیں اسی طرح تم نے اپنے حصہ سے فائدہ اٹھالیا اور جس طرح وہ باطل میں ڈوبے رہے اسی طرح تم باطل میں ڈوبے رہے۔''

باطل میں ڈوبنے سے مراد شبہات میں مبتلا ہونا ہے، یہ آیت اس سبب کی نشاندہی کرتی ہے جس کی وجہ سے دلوں میں فساد اور دین میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور وہ سبب ہے اپنے حصے سے فائدہ اٹھانا اور باطل میں ڈوب جانا۔ اس لئے کہ دین میں فساد یا تو باطل اعتقاد کی وجہ سے آتا ہے یا علمِ صحیح کے خلاف عمل کرنے کی وجہ سے، باطل اعتقاد کو بدعت کہا جاتا ہے اور علم کے خلاف عمل کرنے کو فسق و فجور کہتے ہیں۔

پہلی قسم کا فساد شبہات کی جہت سے اور دوسری قسم کا فساد شہوات کی جہت سے آتا ہے، اسی لئے سلف کہا کرتے تھے: ''دو قسم کے لوگوں سے بچ کر رہو ایک تو خواہش کا بندہ جسے خواہشات نے فتنے میں ڈال رکھا ہے۔ دوسری دنیا کا غلام جسے دنیا کی محبت نے اندھا کر رکھا ہے۔''

اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے: ''فاسق وفاجر عالم اور جاہل عابد سے بچ کر رہو کیونکہ ان کا فتنہ ہر کمزور شخص کو فتنے میں مبتلا کرسکتا ہے۔''

ہر فتنے کی اصل اور بنیاد رائے کو شریعت پر اور خواہش کو عقل پر مقدم کرنا ہے۔ پہلی قسم کو ہم شبہات کا اور دوسری قسم کو شہوات کا فتنہ کہہ سکتے ہیں، شبہات کے فتنے کا علاج یقین اور فتنۂ شہوات کا علاج صبر سے کیا جاسکتا ہے۔ اسی لئے باری تعالیٰ نے دین کی امامت کی بنیاد صبر اور یقین پر رکھی ہے، سورۂ سجدہ میں ہے ''اور ان میں سے ہم نے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے، جب وہ صبر کرتے تھے اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔'' (اغاثة اللهفان : ۲/۱۶۰-۱۶۲) اس آیت سے ثابت ہوا کہ صبر اور یقین ہی سے امامت فی الدین کا درجہ حاصل ہوسکتا ہے۔

مذکورہ بالا عنوان کی وضاحت کے لئے درجِ ذیل آیات اور احادیث کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ ان تمام آیات اور احادیث میں ''فتنہ'' کا لفظ آیا ہے:

- سورۂ انفال میں ہے: ''اور جان لو کہ بے شک تمہارے اموال اور اولاد فتنہ (بڑی آزمائش) ہیں اور یہ کہ اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔'' (سورة الأنفال : ۲۸)
- سورۂ انبیاء میں ہے: ''ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور ہم تم لوگوں کو سختی اور آسودگی میں فتنہ (آزمائش) کے طور پر مبتلا کرتے ہیں اور تم ہماری طرف ہی لوٹ کر آؤ گے۔'' (سورة الأنبياء : ۳۵)
- سورۂ زمر میں ہے: ''انسان کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارنے لگتا ہے پھر جب ہم اسے اپنی طرف سے کوئی نعمت عطا فرمادیں تو کہنے لگتا ہے کہ یہ تو مجھے محض میرے علم کی وجہ سے دی گئی ہے بلکہ یہ آزمائش (فتنہ) ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ بے عمل ہیں۔'' (سورة الزمر : ۴۹)

اموال اور اولاد، سختی اور آسودگی، مصیبت اور راحت، بیماری اور صحت، نعمت اور نقمت یہ سب چیزیں اور کیفیات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہوتی ہیں، مومن بندہ موافق حالات میں شکر اور ناموافق حالات میں صبر کرتا ہے جبکہ نافرمان اور سرکش انسان آسودگی، صحت اور نعمت ملنے پر تکبر اور غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے جبکہ مصیبت، بیماری اور نقمت میں بے صبرا بن جاتا ہے۔

- صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''عنقریب فتنے ظاہر ہوں گے ان میں بیٹھنے والا، کھڑا ہونے والے سے اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے اور چلنے والا کوشش کرنے والے سے بہتر ہوگا، جو شخص اس فتنہ کی طرف جھانک کر دیکھے گا وہ اسے اپنی طرف کھینچ لے گا، جس شخص کو کوئی پناہ گاہ ملے اسے اس میں پناہ لے لینی چاہیے۔'' (بخاري : ۷۰۸۱)
- مسند احمد میں حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دو چیزیں ایسی ہیں جنہیں انسان ناپسند کرتا ہے، وہ موت کو ناپسند کرتا ہے حالانکہ مومن کے لئے موت فتنہ سے بہتر ہے، وہ قلتِ مال کو ناپسند کرتا ہے حالانکہ قلتِ مال کی صورت میں حساب ہلکا پھلکا ہوگا۔'' (مسند أحمد : ۵/۴۲۷، ۴۲۸)
- ابن ماجہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''دنیا میں صرف بلاء اور فتنہ ہی باقی رہ گیا ہے تو تم بلاؤں پر صبر کے لئے تیار ہو جاؤ۔'' (ابن ماجه : ۴۰۳۵)
- صحیح بخاری میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے اپنے بعد مردوں کے لئے عورتوں سے زیادہ خطرناک فتنہ نہیں چھوڑا۔'' (بخاري : ۵۰۹۶)

- حضرت کعب بن عیاض رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''ہر امت کے لئے کوئی فتنہ ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔'' (ترمذي: ۲۳۳۶)
- حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ جنہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ''صاحبِ سرّ'' (رازدار) بھی کہا جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سب سے پہلا اور دجال کا ظہور سب سے آخری فتنہ ہوگا۔'' (البداية والنهاية: ۲۱۱/۷)

چونکہ ہمارا دور فتنوں کی کثرت کا دور ہے اس لئے ہمیں ہر قسم کے فتنوں سے حفاظت کی دعاء کا اہتمام کرنا چاہئے، خصوصاً شہوات اور شبہات کے فتنہ سے کیونکہ ان کی زد براہِ راست ایمان پر پڑتی ہے۔

اِرتداد

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ کسی کافر اور مشرک کو ایمان قبول کرنے پر مجبور نہ کیا جائے، سورۂ بقرہ آیت ۲۵۶ میں ہے: ''دین (اسلام) میں زبردستی نہیں ہے۔'' ایمان کی دعوت تو ہر انسان کو دی جائے گی اور یہ دعوت اطرافِ عالم میں پہنچانے کی کوشش کی جائے گی لیکن اس سلسلہ میں کسی پر جبر واکراہ نہیں کیا جائے گا، دارالاسلام میں رہنے والے ذمیوں کے مذہبی جذبات کا احترام کیا جائے گا، ان کے عبادت خانوں کو تحفظ دیا جائے گا، حدود کے دائرے میں رہتے ہوئے انہیں اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی دی جائے گی لیکن اگر کوئی شخص برضا و رغبت ایمان قبول کرلے تو اسے ارتداد یعنی دین سے پھرنے اور دوبارہ ظلمتِ کفر میں جانے کی اجازت نہیں دی جائیگی۔ ارتداد ان تین جرائم میں سے ایک ہے جن کی سزا قتل ٹھہرائی گئی ہے۔

شہیدِ مظلوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے مکان کا جب باغیوں نے محاصرہ کرلیا تو ایک دن انہوں نے باغیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''میں تمہیں اللہ کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں، کیا تم نہیں جانتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''کسی انسان کا خون صرف تین گناہوں کی وجہ سے حلال ہوتا ہے:

(۱) شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے۔

(۲) اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہوجائے۔

(۳) یا کسی کو ناحق قتل کرے پھر اسے قصاص پر قتل کیا جائے۔''

(یہ حدیث سنانے کے بعد) آپ نے فرمایا: اللہ کی قسم! میں نے نہ تو جاہلیت میں کبھی زنا کیا نہ زمانۂ اسلام میں'' جب سے میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت

کی ہے، میں مرتد نہیں ہوا اور نہ ہی میں نے کسی نفس کو قتل کیا ہے جس کے قتل کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے (جب میں نے ان تینوں میں سے کسی جرم کا بھی ارتکاب نہیں کیا) تم مجھے کیوں قتل کرتے ہو۔" (النسائي : ۹۲)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ارتداد کا مشہور واقعہ پیش آیا تھا جب قبیلہ عرینہ کے کچھ لوگوں نے مدینہ منورہ میں حاضر ہو کر ایمان قبول کیا، یہاں ان کی طبیعت ناساز ہوگئی، آپ نے انہیں اس چراگاہ میں بھیج دیا جہاں بیت المال کے اونٹ چرتے تھے اور انہیں اونٹوں کا دودھ اور پیشاب پینے کا حکم دیا (پیشاب پینے کے بارے میں تفصیلی بحث شرحِ حدیث میں دیکھی جاسکتی ہے) یہ لوگ جب تندرست ہوگئے تو انہوں نے چرواہوں کو قتل کر ڈالا، اسلام سے مرتد ہوگئے اور اونٹوں کو ہنکا کر لے گئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپ نے اپنے جاں نثاروں کو انکا تعاقب کرنے کا حکم دیا، انہیں گرفتار کر کے آپ کے حضور پیش کیا گیا (آپ نے ان کے ساتھ وہی سلوک کرنے کا حکم دیا جو سلوک انہوں نے چرواہوں کے ساتھ کیا تھا) چنانچہ ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے گئے، ان کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیر دی گئیں اور انہیں حرہ کے مقام پر چھوڑ دیا گیا، یہاں تک کہ وہ مرگئے۔

(بخاري : ٦٨٠٢)

مسیلمہ کذّاب کا فتنہ یوں تو سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے آخری دور میں ظاہر ہوگیا تھا مگر اس نے زور پکڑا آپ کے وصال کے بعد، نہ صرف مسیلمہ کذّاب بلکہ کئی دوسرے مدعیانِ نبوت نے بھی ارتداد کا جھنڈا بلند کر دیا، ایک عورت کو بھی جرأت ہوئی اور اس نے بھی اپنے اوپر نزولِ وحی کا دعوئ کر دیا، جھوٹے نبیوں کے علاوہ بھی مختلف صورتوں میں فتنۂ ارتداد پھیلنے لگا اور سفینۂ امت ڈگمگاتا سا محسوس ہوا۔

اللہ تعالیٰ پوری امت کی طرف سے جزائے خیر دے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو

جنہوں نے خلیفہ اول اور جانشینِ رسول ہونے کا حق ادا کر دیا، آپ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے جب تک آپ نے اس فتنہ کے آخری سرغنہ کا قلع قمع نہیں کر دیا، آپ مرتدین کی جماعت کی طرف جب مجاہدین کا کوئی لشکر بھیجتے تھے تو اسے تلقین کرتے تھے کہ پہلے ان سرپھروں کو قبولِ اسلام کی دعوت دی جائے اگر وہ یہ دعوت قبول کر لیں تو ان سے تعرّض نہ کیا جائے اور انہیں اسلامی برادری کا حصہ سمجھا جائے، اگر بالفرض وہ اس دعوت کو رد کر دیں تو پھر ان کے نجس وجود سے فرشِ زمین کو پاک کر دیا جائے کہ سڑے ہوئے عضو کا کاٹ دینا ہی بہتر ہوتا ہے وگرنہ اس کا زہر پورے جسم میں پھیل سکتا ہے، جسمِ انسانی کی طرح جسدِ ملّی کے بھی اعضا ہوتے ہیں، ایک ہاتھ یا پاؤں صرف ایک جسم کی ہلاکت کا سبب بنتا ہے جبکہ گلے سڑے افراد پوری ملّت کے لئے خطرہ ہوتے ہیں، اگر کسی ڈاکٹر کے کہنے پر ہاتھ یا پاؤں کا کاٹنا جائز ہو سکتا ہے تو حکیمِ مطلق کے ارشاد پر سڑے ہوئے افراد کی گردن بھی کاٹی جا سکتی ہے۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اگر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ امتِ اسلامیہ کے لئے اس نازک ترین وقت میں استقامت نہ دکھاتے اور مرتدین کو من مانی کرنے کی اجازت دے دیتے تو بظاہر سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تیئس سالہ محنت پر دشمنانِ دین نے پانی پھیرنے کا عزمِ مصمم کر لیا تھا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی ایسے اہلِ ارتداد کو نمونۂ عبرت بنا دیا تھا جو بظاہر آپ سے محبت وعقیدت کے دعوے کرتے تھے، لیکن ان کی عقیدت ارتداد کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی، یہ وہ لوگ تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا رب اور رازق کہتے تھے آپ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ میں تمہارے جیسا بندہ ہوں، جیسے تم کھاتے پیتے ہو یونہی میں کھاتا پیتا ہوں، اگر میں اللہ کی اطاعت کروں تو ممکن ہے مجھے وہ ثواب دے، اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے عذاب دے لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور اپنی یاوہ گوئی

اور کفریہ کلمات سے باز آجاؤ! اگلے دن آپ نے پھر فہمائش کی، جب تین دن کی مسلسل تفہیم کے باوجود وہ باز نہ آئے تو آپ نے ان کے لئے خندقیں کھدوا کر ان میں آگ جلا کر انہیں زندہ جلا دیا (چونکہ اللہ کے سوا کسی کو آگ سے عذاب دینے کا حق نہیں ہے اس لئے اس پر بحث ہوئی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں جلانے کا حکم کیوں دیا؟ ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ آپ کو اس مسئلہ کا علم نہیں تھا)

ساری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ارتداد ایک بدترین عمل ہے، اس کا مرتکب دین سے خارج اور قتل کا مستحق ہو جاتا ہے، اس کے سارے نیک اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔ سورۂ بقرہ آیت ۲۱۷ میں ہے: "اور تم میں سے جو کوئی دین سے پھر گیا، پھر کفر ہی کی حالت میں اسے موت آگئی تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو جاتے ہیں اور یہی ہیں دوزخ والے، یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

قرآنِ کریم میں ایمان والوں کو یہ حقیقت بھی سمجھائی گئی ہے کہ تمہارے مرتد ہونے سے اللہ کا دین ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو قبولِ ایمان کی توفیق دے دے جو اعمال اور اخلاق ہر اعتبار سے تم سے بہتر مسلمان ثابت ہوں۔ (دیکھئے المائدۃ: آیت ۵۴)

ہمارا دور ارتدادی اور الحادی فتنوں کی کثرت کا دور ہے، اس خطرناک دور میں ایمان کے بارے میں بڑی حساسیت کی ضرورت ہے، نعمتِ ایمان کی قدر، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر، کتاب وسنت سے اعتصام اور تعلق مع اللہ ہی وہ امور ہیں جن کے ذریعے ایمان کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔

یہ حقیقت ایک لمحہ کے لئے بھی ہمارے ذہن سے اوجھل نہیں ہونی چاہئے کہ اگر ہمارا خاتمہ ایمان پر ہوگا تو ہم دنیا کے سب سے خوش قسمت انسان ہیں اور اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہوا تو گندی گلیوں میں آوارہ پھرنے والا خارشی کتا بھی ہم سے بہتر ہے۔

شک

شک ایک نفسیاتی بیماری ہے جو انسان کی ساری زندگی کو متاثر کر دیتی ہے، اس کے لیے معمول کی زندگی گزارنا محال ہو جاتا ہے، ایسے شخص سے عجیب وغریب حرکتیں صادر ہوتی ہیں۔

ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی جو شک اور وسوسہ کی بیماری میں مبتلا تھا، اس نے بتایا میں گھنٹوں غسل کرتا رہتا ہوں مگر مجھے یہ شک ستاتا رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے جسم کا کوئی حصہ خشک رہ گیا ہو، چنانچہ شک دور کرنے کے لیے بار بار جسم پر پانی ڈالتا ہوں مگر پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا، میں نے کئی بار قسم کھائی کہ اب تین بار سے زائد جسم پر پانی نہیں ڈالوں گا مگر شک کے ہاتھوں مجبور ہو کر قسم توڑ ڈالی، ایک بار مجھے اپنے اوپر سخت طیش آ گیا چنانچہ میں نے کہہ دیا کہ ''اگر آج کے بعد تین بار سے زائد میں نے پانی استعمال کیا تو مجھ پر میری بیوی حرام'' اس حلف کے بعد میں نے غسل کیا تو مجھے اس بات کا تو یقین ہے کہ میں نے چوتھی بار پانی سے بھرا جگ اپنے اوپر انڈیلنے کے لیے اٹھالیا تھا لیکن اپنے اوپر انڈیلا یا نہیں، اس بارے میں مجھے شک ہے، وہ نوجوان یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میری بیوی مجھ پر حرام تو نہیں ہو گئی؟

شک، وہم اور وسوسہ کا مریض نہ صرف یہ کہ اپنے لباس، سامانِ خورونوش، وضو اور طہارت اور اپنی ذات کے بارے میں شکوک واوہام میں مبتلا رہتا ہے بلکہ وہ دوسروں کو بھی شک کی نظر سے دیکھتا ہے، اسے کسی پر بھی اعتماد نہیں رہتا ہے، اہل وعیال، متعلقین اور احباب غرضیکہ اس کی نظر میں ہر کوئی مشکوک ہو جاتا ہے۔ اسے نہ کسی کے کردار پر اعتماد رہتا ہے، نہ معاملات پر۔

اخبارات میں ہم جو روزانہ قتل وغارت گری کی خبریں پڑھتے ہیں، ان میں کئی واقعات

ایسے ہوتے ہیں جن کی بنیاد محض شک پر ہوتی ہے، کہیں شوہر کو بیوی پر اور کہیں باپ کو بیٹی یا بھائی کو بہن پر شک ہو جاتا ہے تو وہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے، حالاں کہ اسلامی حدود کے جو اصول وضوابط وضع کیے گئے ہیں ان میں یہ بات طے کر دی گئی ہے کہ شبہات کی وجہ سے حد ساقط ہو جاتی ہے، گویا شک کی وجہ سے حد کا اجراء نہیں ہوتا بلکہ اس کا سقوط ہو جاتا ہے، جب قاضی اور جج کو شک کی وجہ سے حد جاری کرنے کا اختیار نہیں تو کسی دوسرے کو یہ اختیار کیسے دیا جا سکتا ہے۔

شک، انسان کے ایمان کو کمزور کر دیتا ہے...... اللہ پر ایمان، انبیاء کرام اور ملائکہ پر ایمان، آسمانی کتابوں، آخرت کے دن اور تقدیر پر ایمان غرضیکہ ایمان کی جڑیں کھوکھلی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ظاہر ہے ایمان کا بیج دل کی زمین میں بویا جاتا ہے، جب وہ زمین شور اور شک زدہ ہوگی تو یہ بیج اس میں کیسے قرار پکڑ سکے گا۔

یورپ کے میڈیا کی کارستانیاں اور حرکتیں آپ سے مخفی نہیں ہوں گی ان کا پورا زور اس پر صرف ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کے دلوں سے یقین نکال دیا جائے اور شکوک وشبہات بھر دیئے جائیں تاکہ وہ کافر نہ بنیں تو مسلمان بھی نہ رہیں۔چنانچہ آپ کو بے شمار ایسے مسلمان نوجوان مل جائیں گے جو برملا اسلامی عقائد، ایمانی حقائق اور مشہور تاریخی شخصیات کے بارے میں شبہات کا اظہار کریں گے، ان میں سے اکثر اندر سے کھوکھلے ہو چکے ہیں۔جب بنیادی عقائد تک کے بارے میں دل میں شک آ گیا تو ایمان کہاں باقی رہا جب کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں شک کو شرکِ اکبر کہا گیا ہے۔

جو شخص شک کی بیماری میں مبتلا ہو جائے وہ کسی بھی حال اور کیفیت پر استقامت نہیں دکھا سکتا، دین تو رہا ایک طرف، اسے کارہائے دنیا میں بھی کامیابی نہیں ہو سکتی، بے شمار لوگ ہیں جو تہی دست ہیں، مگر دولتِ یقین واعتماد سے مالا مال ہونے کی وجہ سے زندگی کا سفر

کامیابی سے طے کررہے ہیں لیکن جن کا سینہ یقین اوراعتماد سے خالی ہوتا ہے، انہیں کسی بھی میدان میں کامیابی نہیں ہوتی، ان کی زندگی ٹھوکریں کھاتے اور نت نئے تجربات کرتے گزر جاتی ہے۔

شک، انسان کی کمزوری اوراس کے اوپر شیطان کے تسلط اور غلبے کی علامت ہے اور جس انسان پر شیطان قابو پالے وہ اسے جس طرف چاہے لے جاتا ہے۔

قرآن کریم کی متعدد آیات اور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں شک کا ذکر آیا ہے، ہم ان میں سے چند کے ترجمہ پر اکتفاء کرتے ہیں:

سورۂ ابراہیم میں اللہ تعالیٰ نے قومِ نوح، عاد اور ثمود سمیت مختلف اقوام کا ذکر کیا ہے، جن کے پاس اللہ تعالیٰ کے رسول مختلف معجزات لے کر آئے اورانہیں ایمان کی دعوت دی لیکن انہوں نے یہ کہہ کر اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کردیا کہ جو کچھ تمہیں دے کر بھیجا گیا ہے، ہم اس کے منکر ہیں اور جس چیز کی طرف تم ہمیں بلا رہے ہو ہم اس کے بارے میں بھاری شک میں ہیں۔"

اس پر انبیاء کرام علیہم السلام نے ان سے کہا: "کیا اللہ تعالیٰ کے بارے میں تمہیں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کے بنانے والا ہے۔" (سورة ابراهيم : ٩)

اس کے بعد کی زندگی اور قیامت کا معاملہ ایسا ہے کہ دنیا کی بھول بھلیوں اور عیش و عشرت میں کھوئے ہوئے شخص کو اس پر یقین نہیں آتا، سورۂ نمل میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا علم محدود ہے اور یہ اس کے وقوع کو جاننے سے عاجز ہیں اور یہ اس کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے "بلکہ آخرت کے بارے میں ان کا علم ختم ہو چکا ہے بلکہ یہ اس کی طرف سے شک میں ہیں بلکہ یہ اس سے اندھے ہیں۔" (سورة النمل : ٦٦)

یہاں یہ حقیقت بھی جان لیں کہ قرآن کریم ایسی کتاب ہے جو ازاول تا آخر یقینیات پر مشتمل ہے اس میں کوئی ایک بات بھی شک والی نہیں ہے، سورۂ فاتحہ کے بعد قرآن کریم کے آغاز میں ہی یہ بتادیا گیا ہے کہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں یہ پرہیزگاروں کو راہ دکھانے والی ہے۔"

شک کے بارے میں ایک حدیث بھی ملاحظہ فرمالیجئے! ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بنوفزارہ کے ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ (میں اور میری بیوی سرخ وسفید ہیں جب کہ) بچہ کالے رنگ کا پیدا ہوا ہے (لہٰذا یہ میرا بچہ نہیں ہے) آپ نے دریافت فرمایا کیا تمہارے پاس اونٹ ہیں؟ اس نے کہا جی ہیں! آپ نے فرمایا ان کا رنگ کیسا ہے؟ عرض کیا سرخ رنگ کے ہیں، آپ نے پوچھا کیا ان میں نیلے رنگ کے بھی ہیں؟ عرض کیا جی نیلے رنگ کے بھی ہیں، آپ نے فرمایا یہ کہاں سے آ گئے؟ اس نے جواب دیا ممکن ہے ان کے آباء واجداد میں کوئی اونٹ اس رنگ کا گزرا ہو، آپ نے فرمایا "یہی امکان اس بچے کے بارے میں بھی تو ہوسکتا ہے۔" (ابو داؤد : ٢٦٦٠)

اس حدیث میں سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھا دیا کہ محض بچے کا مختلف رنگ دیکھ کر اس پر شک کرنا اور بیوی کے کردار کو مشکوک سمجھنا غلط ہے، جب تک کوئی واضح ثبوت نہ ہو، محض سطحی چیزوں کی بناء پر اپنا گھر اجاڑنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

بعض اوقات انسان کو وضو ٹوٹنے کے بارے میں شک ہوجاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے نبی نے سمجھایا کہ جب تک یقینی طور پر نواقضِ وضو میں سے کوئی ناقض نہ پایا جائے، محض شک کی وجہ سے وضو نہیں ٹوٹے گا۔ شک کا سب سے مؤثر علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعاء کی جائے کہ وہ ہمیں اس بیماری سے نجات دے دے۔

مکر

خفیہ حیلہ اور تدبیر کو مکر کہا جاتا ہے، دھوکہ اور فریب کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، اس لئے مکر کی دو قسمیں کی گئی ہیں: مکرِ محمود اور مکرِ مذموم۔ اگر کسی اچھے کام کے لئے خفیہ تدبیر کی جائے تو اسے مکرِ محمود کہا جائے گا اور اگر برے کام کے لئے تدبیر ہو تو یہ مکرِ مذموم ہوگا، اسی لئے قرآنِ کریم میں باری تعالیٰ کی طرف بھی مکر کی نسبت کی گئی ہے اور کفار کی طرف بھی اسے منسوب کیا گیا ہے، سورۂ آلِ عمران میں ہے ''اور انہوں نے تدبیر کی اور اللہ نے بھی تدبیر کی اور اللہ سب تدبیریں کرنے والوں سے بہتر ہے۔''

(سورة آلِ عمران : ٥٤)

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو جہاں کہیں مکر کی صفت کے ساتھ موصوف کیا ہے تو اس سے مراد ایسا مکر ہے جو اس کی شان کے لائق ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سزا دے گا جو اس کے اولیاء اور رسولوں کے ساتھ مکر و فریب کرتے ہیں گویا مکرِ مذموم کا بدلہ مکرِ محمود کے ساتھ دیا جائے گا، کفار کا مکر کرنا بدترین شی ہے اور اللہ کا مکر کرنا بہترین معاملہ ہے اس لئے کہ یہ اس کے عدل پر مبنی ہوگا۔

(الفوائد لابن قیم : ٢١٣)

علامہ جرجانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حق تعالیٰ کی جانب سے مکر یہ ہے کہ وہ بندے کے گناہوں اور نافرمانیوں کے باوجود اپنی نعمتوں کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔

(التعریفات : ٢٤٥، الكليات : ٧٧١)

ہر دور کے باطل پرست، حق اور اہلِ حق کو مغلوب کرنے اور ان کا نام و نشان مٹانے کی تدبیریں کرتے رہے، مکہ کی تیرہ سالہ اور مدینہ کی دس سالہ زندگی پر نظر ڈالئے آپ کو قدم

قدم پر کفار اور منافقین کے مکر وفریب کے بکھیرے ہوئے کانٹے دکھائی دیں گے، انہوں نے بارہا نورِ حق کو اپنی ناپاک پھونکوں سے بجھانے کی کوشش کی مگر ان کے دلوں کے راز اور ان کی خلوتوں کی سرگوشیاں جاننے اور سننے والے اللہ نے انہیں بار بار ذلت ورسوائی اور ناکامی سے دوچار کیا۔

شبِ ہجرت، حق کے سراجِ منیر کو ہمیشہ کے لئے بجھا دینے کی کیسی زبردست تدبیر کی گئی تھی، سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ مبارکہ کو مختلف قبائل کے سورماؤں نے اپنے محاصرہ میں لے رکھا تھا، انہیں یقینِ کامل تھا کہ آج تو آپ کسی طور پر بھی ان کی خون آشام تلواروں کی زد میں آنے سے نہیں بچ پائیں گے مگر وہ نہیں جانتے تھے کو بچانے والا ان سے کہیں زیادہ طاقتور ہے، دشمنوں نے بھی تدبیر کی اور اللہ نے بھی تدبیر کی مگر اللہ کی تدبیر غالب رہی۔

مدینہ منورہ تشریف آوری کے بعد یہود اور منافقین کی سازشوں، مکر وفریب اور دسیسہ کاریوں کا سامنا کرنا پڑا، ان دونوں گروہوں کی تو گویا ساری زندگی بھی اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف خفیہ تدبیروں سے عبارت تھی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو ذہنی اور قلبی اذیت پہنچانے، امتِ مسلمہ میں افتراق وانتشار کے بیج بونے اور اسے معاشی اعتبار سے تباہ کرنے کے لئے کون سا حربہ ہے جو انہوں نے اختیار نہیں کیا، کون سی خفیہ تدبیر ہے جسے وہ روبہ عمل نہیں لائے، وہ بھی مکر کرتے رہے اللہ بھی تدبیر کرتا رہا ایک طرف مکرِ محمود تھا اور دوسری جانب مکرِ مذموم، تاریخ گواہ ہے مکرِ محمود کے مقابلہ میں مکرِ مذموم کو شکستِ فاش ہوئی۔

امام غزالی رحمہ اللہ نے گناہوں کے اسباب کے بارے میں جو نفیس بحث کی ہے اس میں اگرچہ مکر کا ذکر ضمنی طور پر آیا ہے لیکن اس بحث کا خلاصہ ہم یہاں اس لئے نقل کر رہے

ہیں کہ اس کا مطالعہ قارئین اور قاریات کے لئے خاصا چشم کشا اور علم افزا ثابت ہوگا۔

حجۃ الاسلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یوں تو انسان کے بہت سارے اخلاق اور اوصاف ہیں لیکن انسان کو گناہ پر آمادہ کرنے والے اسباب چار صفات میں منحصر ہیں:

۱- ربوبیت کی صفات...... تکبر، فخر، مدح وثنا کی محبت، طلبِ جاہ وغیرہ یہ حق تعالیٰ کی صفات ہیں، لیکن بندے کے لئے یہ انتہائی مہلک گناہ ہیں۔

۲- شیطانی صفات...... بغض وحسد، سرکشی اور حیلہ سازی، مکر وفریب دھوکہ اور منافقت، یہ سب شیطانی صفات ہیں۔

۳- حیوانی اور بہیمی صفات...... شکم اور فرج کی شہوت پوری کرنے کے لئے شدید حرص کا ہونا بہیمیت کے غلبہ کی نشاندہی کرتا ہے جس کی وجہ سے انسان، زنا، لواطت، رشوت اور چوری چکاری کا راستہ اختیار کرتا ہے۔

۴- سبعی (درندوں جیسی) صفات...... غضب اور کینہ، ظلم وستم، قتل وغارت گری اور اموال کی چھینا جھپٹی کو صفاتِ سبعیہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

اعضاء سے گناہ صادر ہونے کے بڑے سرچشمے یہ چار ہی ہیں پھر ان میں سے کسی گناہ کا تعلق دل سے ہے جیسے کفر ونفاق، کوئی آنکھ سے صادر ہوتا ہے، کوئی کان سے، کوئی زبان سے، کوئی شکم اور فرج سے، کوئی ہاتھوں اور پیروں سے اور کسی گناہ کا اثر پورے بدن پر ہوتا ہے۔'' (مختصر منهاج القاصدين لابن قدامه: ۲۵۲)

اس علمی بحث کا خلاصہ نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ امام غزالی رحمہ اللہ نے مکر وفریب کو شیطانی صفات میں شمار کیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مکر کی شدید مذمت بیان فرمائی ہے۔ حضرت قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ

فرماتے ہوئے نہ سنا ہوتا کہ ''مکر وفریب دوزخ میں لے جانے کا سبب ہوں گے'' تو میں انسانوں میں سب سے زیادہ مکر کرنے والا ہوتا۔ (صحيح الجامع: ١٠٥٧)

ظاہر ہے مکر کے لئے ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے اور حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ انتہائی ذہین انسان تھے، اس لئے آپ فرماتے ہیں کہ اگر شریعت نے مکر کی اجازت دی ہوتی تو میں بھی یہ راستہ اختیار کرتا مگر چونکہ اللہ کے نبی نے مکر اور مکر کرنے والوں کے لئے شدید وعید بیان فرمائی ہے اس لئے میں مکر سے دور رہتا ہوں۔

ترمذی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی دھوکے باز، احسان جتانے والا اور بخیل جنت میں داخل نہیں ہوگا۔''

(ترمذي: ١٩٦٣)

ترمذی ہی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے ایسی مخلوق پیدا کی ہے جن کی زبانیں شہد سے زیادہ شیریں اور دل ایلوے سے زیادہ تلخ ہیں، میں اپنی ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ان پر ایسا فتنہ مسلط کردوں گا جو ان میں سے حلیم اور بردبار کو حیران کرے گا، کیا وہ میری (رحمت کی) وجہ سے دھوکہ کھاتے ہیں یا وہ میرے مقابلہ میں جسارت کرتے ہیں۔''

(ترمذي: ٢٤٠٥)

عام طور پر جو مکار اور فریبی ہوتے ہیں ان کی زبانیں بڑی شیریں ہوتی ہیں، وہ ایسی باتیں کرتے ہیں کہ مخاطب کا دل موہ لیتے ہیں، مگر ان کے دل غیظ وغضب اور جوشِ انتقام سے بھرے ہوتے ہیں۔ ان منافقوں کے حالات پڑھیے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر قسمیں اٹھا اٹھا کر اپنے ایمان، محبت اور وفا کا یقین دلاتے تھے، لیکن درپردہ ایسی سازشوں کے تانے بانے میں لگے رہتے تھے جن کے نتیجہ میں نورِ حق ہمیشہ کے

لئے بجھ کر رہ جائے، وہ نورِ حق کو تو نہ بجھا سکے لیکن خود ہمیشہ کے لئے بجھ کر رہ گئے۔

سورۂ فاطر میں باری تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے: ”بری تدبیر کا وبال، تدبیر کرنے والوں پر ہی پڑتا ہے۔“ (سورة الفاطر : ٤٣)

مکر صرف حق کو دبانے کے لئے نہیں کیا جاتا بلکہ بہت سے لوگ دوسروں کو بے وقوف بنانے کے لئے ذاتی زندگی میں بھی مکر کرتے ہیں، کوئی بیماری کا مکر، کوئی سحر زدہ ہونے اور جنات کے سائے کا مکر...... مکر کی یہ ساری ہی صورتیں مذموم اور قابلِ نفرت ہیں۔

قوتِ اِرادی

قوتِ ارادی کی صفت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے، جس سے بے پناہ فوائد انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔ قوتِ ارادی کی وجہ سے مشکلات پر قابو پانا اور صعوبتوں سے پر راہوں سے گزرنا آسان ہوجاتا ہے، اسی کی وجہ سے عبادات کی ادائیگی اور شرعی احکام کی تعمیل میں مدد حاصل ہوتی ہے، اس کا نتیجہ دین کی صلابت اور دنیا اور آخرت کی سعادت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

قوتِ ارادی سے مالا مال شخص حالات کے بہاؤ میں بہنے اور خواہشات کا غلام بننے سے محفوظ رہتا ہے، ایسا انسان عارضی حوادث، تجارت میں نقصان، فتح وشکست، عزیزوں کی جدائی اور حالات کی ناموافقت سے پریشان نہیں ہوتا۔ اس کے اندر صبر وقناعت، تحمل و عزیمت اور شجاعت واستغناء جیسی صفات پیدا ہوجاتی ہیں۔

قوتِ ارادی کے بل بوتے پر انسان فلک بوس چوٹیوں کو پیروں تلے روند سکتا ہے، سمندروں کو پایاب اور ہواؤں کو مسخر کرسکتا ہے۔ اگر وہ اس قوت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے احکام کے نفاذ میں استعمال کرے تو وہ خلافتِ ارضی کا مستحق بن جاتا ہے۔ اپنے اندر قوتِ ارادی کا پیدا کرنا حقیقت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنا ہے، اس لئے کہ آپ کی پوری زندگی قوت ارادی سے عبارت ہے، آپ کی مکی زندگی کو یاد کیجئے جب آپ نے کفر وشرک کی بدبودار فضا میں دعوتِ توحید کا پرچم بلند کیا۔

آپ یکتا وتنہا تھے، ہر ذرہ آپ کے خون کا پیاسا تھا، ایک چچا تھا جو آپ کا ہم نوا تو نہ بن سکا مگر بہر حال آپ کا ساتھ دے رہا تھا، ایک وقت ایسا آیا کہ چچا کی ہمت بھی جواب دے گئی اور اس نے بڑے سلیقے سے آپ کو سمجھانا چاہا کہ ”بھتیجے مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈال جسے

میں برداشت نہ کرسکوں، چچا کے سامنے سردارانِ قریش کی دھمکیاں بھی تھیں اور تحریص و ترغیب پر مشتمل خوبصورت پیشکش بھی، لیکن آپ کے سامنے مقصدِ رسالت اور اللہ تعالیٰ کی قوت وطاقت کے سوا کچھ نہ تھا، آپ نے پوری مضبوطی کے ساتھ جواب دیا:

''چچا جان! اس اللہ کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند کو رکھ دیں اور مجھے کہیں کہ میں اس دعوت کے کام کو چھوڑ دوں تو میں ہرگز نہ چھوڑوں گا تا آنکہ اللہ تعالیٰ اس کو غالب فرمادے یا میں اس راستے میں مارا جاؤں۔''

اہلِ علم نے ان اسباب کی نشاندہی کی ہے جن کے اختیار کرنے سے انسان کے ارادوں میں قوت اور پختگی پیدا ہوجاتی ہے۔ آیئے! ہم ایک نظر ان اسباب پر ڈالیں:

۱- اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی عظیم صفات، قضاء وقدر اور اس کی حکمتِ عالیہ پر ایمان مضبوط کیا جائے، اسی طرح ایمان جن صفات کا تقاضا کرتا ہے وہ صفات اپنے اندر پیدا کی جائیں یعنی اللہ پر توکل اور اس کے ساتھ حسنِ ظن...... ان عناصر کی تقویت ان بنیادی وسائل میں سے ہے جن کی وجہ سے انسان میں قوتِ ارادی پیدا ہوتی ہے، ایک کمزور اور بے وسیلہ انسان میں بھی توکل حسنِ ظن اور ایمان کی وجہ سے ایسی طاقت آجاتی ہے کہ وہ بڑے بڑے کجکلاہوں کو خاطر میں نہیں لاتا، وہ مایوسی کی دلدل سے نکل آتا ہے اور اس کا دل امید سے بھرجاتا ہے۔

۲- جو شخص مسلسل ریاضت اور اپنی اَخلاقی تربیت کے ذریعے نفس کی ناجائز خواہشات اور شہوات پر قابو پانا سیکھ لے اسے بالآخر قوتِ ارادی حاصل ہوجاتی ہے۔

۳- اسلامی عبادات کا اہتمام اور التزام بھی ان وسائل میں سے ہے جو انسانی ارادوں کی تقویت میں موثر ثابت ہوتا ہے، کتنی ہی نفسانی خواہشات اور حیوانی مرغوبات ایسی ہیں

کہ نماز روزہ کی پابندی کی وجہ سے ان پر قابو پانا آسان ہو جاتا ہے، زکوٰۃ وصدقات کا اہتمام حبِ مال کی بیماری کا علاج ہے اور جو شخص اپنے آپ کو حبِ مال اور حبِ جاہ سے پاک کر لے اس کے عزائم میں ضرور پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔

۴- جن کاموں کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے انہیں بجالانا اور جن سے منع کیا ہے ان سے اپنے آپ کو بچا کر رکھنا، قوت ارادی پیدا کرنے کا اہم سبب اور وسیلہ ہے، احکام باری تعالیٰ پر کان نہ رکھنا اور گناہوں کے سیلاب میں بہتے چلے جانا، ضعفِ ارادہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔

۵- اللہ کے ذکر، خوف، استعانت، استخارہ اور تلاوتِ قرآن کے ذریعے بھی مؤمن اپنے اندر قوت ارادی پیدا کر سکتا ہے کیونکہ ان اعمال اور اوصاف کا حامل شخص اللہ تعالیٰ کی معیت میں ہوتا ہے اور اس کے ایمان اور یقین میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

سورۃ الانفال میں ہے: ''مؤمن تو بس وہ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیات پڑھی جائیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں وہ جو کہ نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے انہیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں''۔

ایمان والے مجاہدین کا ہمیشہ سے یہ شیوہ رہا ہے کہ وہ میدان جنگ میں اپنی زبانوں کو ذکر و دعاء سے تر رکھتے ہیں کیونکہ اس سے دل کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے پارہ کے آخری رکوع میں ہے کہ جب لشکرِ طالوت کا جالوت کی فوج سے آمنا سامنا ہوا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعاء کی: ''اے ہمارے رب! ہم پر صبر انڈیل دے اور ہمیں ثابت قدمی عطا فرما اور قوم کفار کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔'' ذکر و دعاء سے انہیں ایسی تقویت حاصل ہوئی کہ تعداد میں قلت کے باوجود اہلِ ایمان نے جالوت کی کیل کانٹوں سے لیس بہت بڑی فوج کو شکست سے دوچار کیا۔

۶- جو مؤمن ہمیشہ اپنے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ کی رضا کو رکھے اور اسے یقین ہو کہ اس کا سب سے بڑا انعام جنت اور وہ نعمتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے متقین کے لیے تیار کی ہیں، اس کے ارادوں میں بھی پختگی آجاتی ہے، وہ بہار وخزاں کی پرواہ کیے بغیر ''لا الٰہ الا اللہ'' کے نغمے سے اپنے آپ کو سرشار رکھتا ہے۔

۷- گناہوں سے احتراز اور عبادت وطاعت میں سستی اور کاہلی سے اجتناب بھی انسان میں قوتِ ارادی پیدا کرتا ہے۔ (الاخلاق الاسلامیة: ۲/۱۳۲)

اِبتلاء

قرآن کریم کی زبان میں دنیا لہو ولعب کا گھر ہے، دار الغرور ہے، لذتوں، منفعتوں اور عیاشی کی جگہ ہے، شیطان کی گمراہی، اغواء اور کوششوں کو جولان گاہ ہے، دنیا پر فریفتہ ہوجانے والوں اور حد سے تجاوز کر جانے والوں کا ٹھکانہ ہے، حق کے مخالفین اور معاندین کے لیے ذلت اور لعنت کا مقام ہے، مومنوں اور صلحاء کے لیے حسنات کے کمانے اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا موقع ہے۔

لیکن دنیا کا اہم وصف جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی مقامات پر بیان فرمایا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ دار الابتلاء ہے یعنی امتحان گاہ سورۃ الملک کی آیت ۱، ۲، سورۃ الکہف کی آیت ۷، سورۃ البقرہ کی آیت ۱۵۵، سورۃ العنکبوت کی آیت ۲، ۳ اور نہ معلوم کتنے ہی مقامات پر ابتلاؤں، آزمائشوں اور امتحانوں کا ذکر ہے۔

یہ دنیا امتحان گاہ ہے اور یہاں ہر کسی کا امتحان ہوتا ہے، امیر کا بھی اور غریب کا بھی، بادشاہ کا بھی، فقیر کا بھی، جاہل کا بھی عالم کا بھی، چھوٹے کا بھی، بڑے کا بھی، مرد کا بھی، عورت کا بھی، صحت مند کا بھی، بیمار کا بھی، مجاہدین کا بھی، مجاورین کا بھی، امام کا بھی، مقتدی کا بھی، ظالم کا بھی، مظلوم کا بھی، اولاد کا بھی، والدین کا بھی، شکم سیر ہونے والے کا بھی، بھوکا رہنے والے کا بھی۔

امتحان کی صورتیں بھی مختلف ہوتی ہیں، کسی کو دیکر آزمایا جاتا ہے، کسی سے لے کر آزمایا جاتا ہے، ایک ذہین ہے دوسرا غبی ہے، ایک صاحبِ اولاد ہے، دوسرا بے اولاد ہے، ایک ثروت کے عروج پر ہے دوسرا غربت کی انتہاء پر ہے، ایک قابلِ رشک صحت کا مالک ہے، دوسرا متعدد امراض کا شکار ہے، ایک کا حسن چاند کو شرماتا ہے دوسرے کی صورت واجبی سی

ہے، ایک کی آنکھیں روشن ہیں دوسرا بینائی سے محروم ہے، ایک زہد وعبادت کا پیکر ہے، دوسرا معصیت کا چلتا پھرتا اشتہار ہے، ان میں سے ہر فرد امتحان گاہ میں ہے۔

امتحان شروع ہو چکا ہے اور کسی بھی لمحے وقت ختم ہونے کی گھنٹی بج سکتی ہے۔ دنیا کے کسی بھی مذہب کی آسمانی یا غیر آسمانی کتابوں اور اخلاقیات اور نفسیات پر لکھے گئے لٹریچر میں مختلف ابتلاؤں میں مبتلا انسانوں کو اتنی تفصیل کے ساتھ ان ابتلاؤں اور آزمائشوں کے ساتھ نمٹنے کے طریقے نہیں بتائے گئے جتنی تفصیل کے ساتھ آخری آسمانی کتب قرآن حکیم میں بتائے گئے ہیں اور اگر قرآن کی کوئی بات اپنے فہمِ ناقص کی وجہ سے انسانوں کی سمجھ میں نہیں آتی تو اس کی تشریح معلّمِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد آپ کے حقیقی ورثاء یعنی علماء نے کردی ہے۔

ہم آسانی کے لیے ابتلاء کو چار قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

- اگر طبیعت اور مرضی کے مخالف حالات پیش آئیں تو مسلمان کو یقین ورضا، صبر واحتساب، محاسبۂ نفس، دعاء اور توکل کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ مسلمان کا اس حقیقت پر ایمان ہے کہ دنیا کی زندگی اور اس کی تکلیفیں عارضی اور آخرت کی زندگی اور اس کی راحتیں دائمی ہیں، ہم اور ہمارے پاس جو کچھ ہے، سب اللہ تعالیٰ کا ہے؟ جب ملکیت مالک کے پاس چلی گئی تو کیسا غم اور کہاں کا افسوس؟ کہاں کا اعتراض اور کہاں کی ناراضگی؟ اگر ہم اللہ کے فیصلے پر راضی نہ ہوں تو ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟ نہ مردہ کو زندہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی پیش آجانے والے حادثے کا سدِّ باب کر سکتے ہیں۔

کسی بھی آزمائش، پریشانی اور مصیبت کا دوسرا علاج صبر جمیل اور احتساب ہے، صابرین سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے، انہیں اللہ کی معیت اور نصرت حاصل ہوتی ہے، احتساب کا معنیٰ ہے حصولِ ثواب کی نیت...... مومن کو مصائب وآلام پر اللہ تعالیٰ سے ثواب

کی امید رکھنی چاہئے، کیونکہ حدیث میں اس کی بشارت سنائی گئی ہے۔

تیسرا کام جو مسلمان کو کرنا چاہئے وہ محاسبۂ نفس ہے یعنی اسے یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہئے کہ کہیں یہ حوادث میرے گناہوں کا نتیجہ تو نہیں، کیونکہ قرآن پاک یہ بتاتا ہے کہ انسانوں پر مصیبتیں اور پریشانیاں ان کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے آتی ہیں۔ مصائب اور حوادث میں مسلمان کے کرنے کا چوتھا کام یہ ہے کہ وہ خوب خشوع اور خضوع کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور اس سے سلامتی اور عافیت کی دعاء کرے، دعاء کے بعد اللہ پر توکل کیا جائے لیکن توکل کا مطلب ترکِ اسباب نہیں بلکہ جائز اسباب اختیار کرنے کے ساتھ مسبب الاسباب پر نظر رکھنا ہی توکل ہے۔

☆...... ابتلاء کی دوسری قسم یہ ہے کہ طبیعت کے موافق حالات پیش آئیں۔ بدنی صحت، مالی خوشحالی، علمی ترقی، عہدہ و منصب، عزت و وجاہت، اقتدار واختیار اور جائز خواہشات کی تکمیل ...... یہ سب اسی قسم میں داخل ہیں، یہ چیزیں کافر کو بھی ملتی ہیں اور مسلمان کو بھی حاصل ہوتی ہیں، کافر کو مل جائیں تو اس کے دماغ میں خنّاس بھر جاتا ہے، غرور اور تکبر سے اس کی گردن تن جاتی ہے، لیکن مسلمان کو یہ نعمتیں حاصل ہو جائیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور شکر ادا کرتا ہے اور ان نعمتوں میں اللہ تعالیٰ کا جو حق ہوتا ہے، اسے ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

☆...... ابتلاء کی تیسری قسم یہ ہے کہ انسان کسی گناہ میں مبتلاء ہو جائے، ایسے انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے خالق و مالک سے حیا کرے، گناہوں کی سزاؤں کا استحضار کرے، ان سے فوراً کنارہ کشی اختیار کرلے اور خوب توبہ اور استغفار کرے، توبہ ایسا پاک صاف پانی ہے جو گناہوں کی غلاظت کو دھو کر صاف کر دیتا ہے۔

☆...... ابتلاء کی چوتھی قسم یہ ہے کہ مسلمان کی عبادت و اطاعت، ذکر و تلاوت،

تدریس وتبلیغ، صدقہ وخیرات اور دعوتِ جہاد کی توفیق مرحمت ہو جائے، ایسی صورت میں اسے یہ چیز ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ جو کچھ اللہ کی توفیق سے ہوا وہ اگر چاہے تو یہ توفیق سلب بھی کرسکتا ہے، قبولیت کی امید کے ساتھ اسے ڈرتے بھی رہنا چاہیے کہ پتا نہیں عمل بارگاہِ الٰہی میں قبول بھی ہوا یا کہ نہیں ہوا۔

اَدب

سورہ بقرہ آیت ۲۲۴ میں ہے: ''اللہ کے نام کو اس بات کا حیلہ نہ بنانا کہ اسی کی قسمیں کھا کر، اچھا سلوک کرنے، پرہیز گاری کرنے اور لوگوں میں صلح کرانے سے رک جاؤ اور اللہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے۔

سورۂ حجرات کی آیت ۲ میں ہے: ''اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اونچی نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو اس طرح آپ کے سامنے زور سے نہ بولا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔''

سورۂ حجرات ہی کی آیت ۱۱ کا مفہوم ہے: ''اے ایمان والو! کوئی قوم کسی قوم کا مذاق نہ اڑائے، ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں، عورتوں کا مذاق اڑائیں، ممکن ہے کہ وہ ان سے اچھی ہوں اور اپنے مومن بھائی کے عیب نہ نکالو اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو، ایمان لانے کے بعد برا نام رکھنا گناہ ہے اور جو توبہ نہ کریں وہ ظالم ہیں۔''

سورہ لقمان آیت ۱۱ میں ہے: ''تکبر کی بناء پر لوگوں کے سامنے منہ نہ پھلانا اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنا، اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے اور خود پسند کو پسند نہیں کرتا۔''

ان چار آیات میں سے پہلی آیت میں ادب مع اللہ، دوسری میں ادب مع الرسول صلی اللہ علیہ وسلم تیسری میں ادب مع الانسان اور چوتھی آیت میں ادب مع النفس کی تعلیم اور تلقین ہے، عربی زبان میں ادب کا معنی ہے لوگوں کو کھانے کی دعوت دینا، دعوت دینے والے کو ''آدِب'' کہتے ہیں۔

اصطلاح میں نفس کی ریاضت، اچھے اخلاق، اعلیٰ اوصاف، تہذیب و شائستگی، حسنِ

کلام اور ہر قسم کی غلطیوں سے بچنے کا نام ادب ہے۔ (التعریفات للجرجانی : ۱۵)

دینِ اسلام کے پانچ شعبے ہیں: عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور آداب و اخلاق۔ ان پانچوں شعبوں میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والا ہی حقیقت میں کامل مسلمان کہلانے کا حق دار ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جو شخص آداب کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے اسے بطورِ سزا سنتوں سے محروم کر دیا جاتا ہے اور جو سنتوں کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے اسے فرائض سے اور جو فرائض میں سستی کرتا ہے اسے معرفت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔'' (شرح الادب المفرد : ۳۹۷/۲)

یہ بھی انہیں کا قول ہے کہ ''ہمیں بہت زیادہ علم کے مقابلے میں تھوڑے سے ادب کی زیادہ ضرورت ہے۔'' (شرح الادب المفرد : ۳۹۲/۲)

حضرت ابو حفص سہروردی رحمہ اللہ کا قول ہے: ''ظاہر میں حسنِ ادب، باطن میں حسنِ ادب کا عنوان ہے۔'' (مدارج السالکین : ۳۹۲/۲)

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ادب، انسان کی سعادت اور فلاح کی اور قلتِ ادب اس کی شقاوت اور ہلاکت کا عنوان ہے۔'' (مدارج السالکین : ۴۰۷/۲)

یہاں تک کہا گیا ہے کہ " الدین کله ادب "(دین تو حقیقت میں ادب ہی کا نام ہے)

اگر ہم ذخیرۂ احادیث پر نظر ڈالیں تو ہمیں مسجد کے آداب، نماز کے آداب، تلاوت اور مہمان کے آداب، مجلس اور گفتگو کے آداب، لباس اور کھانے پینے کے آداب، سلام کرنے اور راستے کے آداب غرضیکہ ہر حال ہر عمل اور ہر جگہ کے مختلف آداب نظر آئیں گے۔

سارے آداب کی تفصیل عرض کرنے کا موقع نہیں اس لیے صرف ان چار آداب کے ذکر پر آج کے درس کو ختم کیا جاتا ہے، جن کے حوالے سے چار آیات ذکر کی گئی ہیں۔

☆ ان میں سب سے اہم اور مقدس اللہ تعالیٰ کا ادب ہے، امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ادب کی تین قسمیں ہیں:

پہلی قسم یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو بھی معاملہ ہے اسے ہر قسم کے نقص سے بچایا جائے۔

دوسری قسم یہ کہ کسی ایسے کام کا ارادہ نہ کیا جائے جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے۔

گویا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ادب یہ ہے کہ اس نے بندے کو جو بھی دینی علمی اور لسانی صلاحیتیں عطا کی ہیں انہیں اس کی مرضیات میں لگا دیا جائے۔

(تهذيب مدارج السالكين : ٤٥٠، ٤٥١)

☆ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی آدابِ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان فرمائے ہیں، مثلاً یہ کہ آپ کی سنت سے آگے نہ بڑھا جائے، آپ کی سنت سے آگے بڑھنے والا ویسے ہی بے ادب ہے جیسے آپ کی زندگی میں تکبر کی بناء پر آپ سے آگے چلنا والا بے ادب تھا...... جو لوگ بدعات میں مبتلا ہیں انہیں جان لینا چاہیے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھنے کے گناہ میں مبتلا ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا ادب یہ ہے کہ آپ کے ہر حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جائے اور زندگی کے ہر شعبے میں آپ کی اتباع کی جائے۔ (مدارج السالكين : ٤٠٤-٤٠٥)

☆ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ ادب یہ ہے کہ ہر شخص کے ساتھ اس کے مرتبے اور حیثیت کے مطابق معاملہ کیا جائے، ہر شخص کا مرتبہ اور ادب الگ ہے، والدین کا ادب اور ہے، اساتذہ کا ادب اور ہے، علماء کا ادب اور ہے، شیخ کا ادب اور ہے، بزرگوں کا ادب اور ہے، مہمانوں کا ادب اور ہے۔ (مدارج السالكين : ٤٠٦-٤٠٨)

اخلاق وآداب حقیقت میں کمالِ ایمان کی علامت ہیں۔ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''لوگوں میں سب سے اچھا مسلمان وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے

ہوں۔" (مسند أحمد : ۸۹۔۹۹ ، الترغیب و الترھیب : ۴۹/۳)

☆نفس کا ادب یہ ہے کہ اس کی اصلاح اور تہذیب وتربیت کے لیے ہر شخص فکرمندی اور ظاہری اور باطنی آداب سے اپنے آپ کو متصف کرنے کی کوشش کی جائے، ظاہری آداب سے زیادہ باطنی آداب کے حصول کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔

ادب مع النفس اور اپنی اصلاح وتربیت کے لئے جو سب سے مؤثر اور آزمودہ طریقہ ہے وہ کسی سچے، مخلص، صاحبِ نظر اور باعمل اللہ والے سے تعلق ہے۔

جس شخص کے دل میں اپنے آپ کو اسلامی آداب واخلاق کے ساتھ متصف کرنے کی سچی طلب ہوگی اور وہ تضرّع کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعاء بھی کرے گا اسے کریم ورحیم رب محروم نہیں فرمائے گا اس لئے کہ اس کا وعدہ ہے۔

"اور جو لوگ ہمارے لئے کوشش کرتے ہیں ہم انہیں ضرور سیدھا راستہ دکھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔" (سورۃ العنکبوت : ۶۹)

تکریمِ انسان

اللہ تعالیٰ نے انسان کو مکرم ومحترم بنایا ہے، انسان کی تکریم کے کئی پہلو قرآن کریم سے ثابت ہوتے ہیں۔

- انسان کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے (یہ وضاحت ضروری ہے کہ نہ تو ہم اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں کی حقیقت جانتے ہیں اور نہ ہی ان ہاتھوں سے انسان کو بنانے کی حقیقت ہمیں معلوم ہے)

سورۂ ص میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد فرشتوں کو حکم دیا کہ تم ان کے سامنے سجدہ کرو، ابلیس کے سوا سارے فرشتوں نے اس حکم کی تعمیل کی، اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''تمہیں اس کے سامنے سجدہ کرنے سے کس نے منع کیا جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا۔'' (سورة ص : ٧٥)

اسی طرح اللہ فرماتے ہیں کہ انسان کو پیدا کرنے کے بعد میں نے اس کے اندر اپنی روح پھونکی۔ یہ چیز انسان کے علاوہ اس روح کے علوِ مکانی پر بھی دلالت کرتی ہے جو اس کے اندر حلول کیے ہوئے ہے۔

- انسان کی تکریم کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بہترین صورت سے نوازا ہے، سورۂ تغابن میں ہے: ''تمہاری صورتیں اچھی بنائیں۔'' (سورة التغابن : ٣)

سورۂ تین میں ہے: ''بے شک ہم نے انسان کو بڑے عمدہ انداز میں پیدا کیا ہے۔''

(سورة التين : ٤)

انسان کو اللہ نے ایسا بنایا ہے کہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے کھاتا اور ان سے عمل کرتا ہے، پھر اس کی فطرت میں معرفت اور اسبابِ علم رکھ کر اسے ہدایتِ عامہ عطا کی ہے، جس

کے ذریعے وہ حق کو پہچان سکتا ہے اور دنیا اور آخرت کی سعادت حاصل کرسکتا ہے۔

(فتاویٰ ابن تیمیه : ١٤/٢٩٥ ، ابن کثیر : ٤/٥٤٧)

● انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل، نطق اور تمیز جیسی نعمتیں عطا فرمائی ہیں، نورِ عقل سے وہ غلط اور صحیح، حق اور باطل، کھرے اور کھوٹے کے درمیان فرق کرسکتا ہے، نطق سے وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار اور اللہ کا ذکر کرسکتا ہے۔ سورۂ رحمٰن میں ہے: ”وہ بے حد مہربان ہے، اس نے قرآن کی تعلیم دی، انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔“

(سورة الرحمٰن : ١۔٤)

اسی طرح انسان کو خط و کتابت کی قدرت اور صلاحیت سے نوازا گیا، اس صلاحیت کی بناء پر وہ مختلف علوم ایجاد کرسکتا ہے۔ انہیں اوراق میں محفوظ رکھ سکتا اور پوری دنیا میں ان کی نشر و اشاعت کرسکتا ہے۔

● انسان کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسان کا اکرام اتنی بڑی بڑی نعمتوں سے کیا جنہیں شمار نہیں کیا جاسکتا، ان میں سے ایک نعمت یہ ہے کہ انسان کو رزق پہنچانے کے لئے زمین و آسمان کی ہر چیز اسی کے لئے مسخر کردی گئی ہے، دیکھا جائے تو سورج اور چاند، زمین اور ندی نالے، ہوا اور بادل سب انسان کی رزق رسانی میں مصروفِ عمل ہیں اور یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے ہورہا ہے، اگر اللہ نہ چاہے تو انسان کو ایک لقمہ بھی میسر نہ آئے، سورۂ فاطر میں ہے ”کیا اللہ کے سوا کوئی دوسرا خالق بھی ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دے۔“ (سورة الفاطر : ٣)

ان نعمتوں میں سے ایک نعمت آسمان سے بارش کا برسنا بھی ہے، بارش کا کچھ پانی فوری طور پر کھیتی باڑی کے کام آجاتا ہے، کچھ منجمد صورت میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر جمع ہوجاتا ہے اور کچھ سوتوں کے ذریعے زمین کے اندر ذخیرہ ہوجاتا ہے، برف پگھلتی ہے تو ندی نالوں

اور چشموں کے ذریعے وہ پانی انسان تک پہنچ جاتا ہے اور جب ضرورت پیش آتی ہے، انسان زمین کے پیٹ سے پانی کشید کر لیتا ہے، پورے فلکی نظام کو بھی اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت میں لگا رکھا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے ”اور رات دن اور سورج اور چاند کو تمہارے کام میں لگا دیا ہے اور ستارے بھی اسی کے حکم سے کام میں لگے ہوئے ہیں، بے شک اس میں لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو سمجھ رکھتے ہیں۔“ (سورة النحل : ١٢)

آسمان وزمین اور شمس وقمر کی تسخیر یہی ہے کہ انسان ایک پائی خرچ کئے بغیر زندگی کے مختلف میدانوں میں ان سے فائدہ حاصل کر رہا ہے، انسان کے کتنے مفادات ہیں جو سورج اور چاند کی روشنی، حرارت اور برودت گردش اور آمد ورفت سے وابستہ ہیں، مختلف موسموں، ماہ وایام اور سالوں کے حساب کا تعلق انہی سے ہے، سورۂ یونس میں ہے: ”وہی ہے جس نے سورج کو روشن بنایا اور چاند کو منور فرمایا اور چاند کی منزلیں مقرر کیں تا کہ تم برسوں کا شمار اور حساب معلوم کر سکو، یہ سب کچھ اللہ نے تدبیر سے پیدا کیا ہے، وہ اپنی آیتیں سمجھداروں کے لئے کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔“ (سورة يونس : ٥)

- انسان کی تکریم کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبورِ محض نہیں بنایا اور اسے آزادی اور اختیار دیا ہے، اسی اختیار کی بناء پر انسان ہی بارِ امانت کا حق دار ٹھہرا، اس کے علاوہ ارض وسما اور پہاڑوں میں سے کوئی بھی اس بوجھ کو اٹھانے کے قابل نہیں۔
- انسان کی تکریم میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ہدایت اور دنیا اور آخرت کی کامیابی کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث فرمائے، جنہوں نے انسان تک زندگی بخش پیغام پہنچایا۔
- اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسان کی تکریم کے مظاہر میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے انسان کو اپنی محبت اور رضا کا اہل بنایا ہے اور اسے وہ اسباب بتائے ہیں جنہیں اختیار کرنے

سے وہ اس کا محبّ بلکہ محبوب بن جاتا ہے، ان اسباب میں سے سب سے بڑا سبب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہے۔

جب باری تعالیٰ نے انسان کو مکرم ومحترم بنایا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے مقام کو پہچانے اور ایسے طریقے اختیار کرے جن کے ذریعے وہ اپنے آپ کو تکریم اور تعظیم کے قابل بنا سکتا ہے:

ان میں سے پہلا طریقہ علم ومعرفت کا حصول ہے جس کی وجہ سے اس کے نورِ ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔

دوسرا طریقہ اللہ کی عبادت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہے۔

تیسرا طریقہ گناہوں سے بچنا ہے، گناہوں کے ارتکاب سے انسان ذلیل ہوتا ہے اور ان سے دامن بچانے والا عزت کا مستحق ہو جاتا ہے۔

چوتھا طریقہ یہ ہے کہ وہ خلقِ خدا کے سامنے دستِ سوال دراز کر کے اپنے آپ کو ذلیل نہ کرے۔ مختصر یہ کہ جو انسان خود اپنی عزت کرتے اور ذلت کے اسباب سے بچتا رہے وہ اللہ کی نظر میں بھی مکرم ومحترم ہوتا ہے اور انسانوں کی نظر میں بھی۔

(نضرة النعيم ، مضمون تكريم الإنسان)

نیکی

نیکی کیا ہے؟ یہ وہ سوال ہے جو ہر اس شخص کے سامنے آتا ہے جو نیک بننا یا نیکی کرنا چاہتا ہے، اسلام سے قبل چونکہ ذہن بہت تنگ اور علم کا دائرہ محدود تھا اس لئے نیکی کے مفہوم کے بارے میں بھی انسان کی سوچ محدود تھی بلکہ بعض مضحکہ خیز کاموں کو بھی وہ نیکی سمجھتا تھا۔ مثال کے طور پر بعض لوگ جب حج یا عمرہ کے ارادے سے احرام باندھ کر گھر سے نکل جاتے پھر انہیں کسی مجبوری کی وجہ سے گھر واپس آنا پڑتا تو وہ دروازے سے داخل نہیں ہوتے بلکہ گھر کے پچھواڑے سے دیواریں پھلانگ کر اندر آتے تھے اور اسے نیکی کا کام اور اللہ کا حکم سمجھتے تھے ایسے لوگوں سے کہا گیا: ''یہ تو کوئی نیکی نہیں کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑے کی طرف سے آؤ البتہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص تقویٰ اختیار کرے۔''

(سورة البقرة : ١٨٩)

جب تحویلِ قبلہ کا حکم نازل ہوا اور بیت المقدس کی بجائے کعبہ کو مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا گیا تو اس پر یوں تو مشرکوں اور منافقوں سب نے بڑا شور شرابا کیا مگر خاص طور پر یہود اس میں پیش پیش تھے، انہوں نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف بڑھ چڑھ کر باتیں کیں، ان کے انداز سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ نیکی تو بس مخصوص قبلہ کی طرف رخ کرنے میں ہے، یہ مخصوص قبلہ ان کی نظر میں بیت المقدس کے سوا کوئی نہ تھا، جس نے دورانِ عبادت بیت المقدس کی طرف رخ کر لیا وہ کامیاب ہو گیا اور جس نے ایسا نہ کیا وہ نیکی سے محروم اور ناکام ٹھہرا۔ یہود کی اس انتہائی غلط سوچ اور تنگ نظری کی واضح طور پر تردید کرتے ہوئے کہا گیا:

''نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف پھیر لیا کرو بلکہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ اور قیامت کے دن اور فرشتوں اور کتابوں اور نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت میں

مال دے رشتہ داروں کو اور یتیموں، محتاجوں، مسافروں اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور قائم رکھے نماز اور دیا کرے زکوٰۃ (اور نیک لوگ وہ ہیں) جو اپنے اقرار کو پورا کرتے ہیں جب وہ عہد کرلیں اور تنگی اور تکلیف اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے ہیں، یہی لوگ ہیں سچے اور یہی ہیں پرہیزگار۔'' (سورة البقرة : ۱۷۷)

جن آیات کا ترجمہ اوپر نقل کیا گیا ہے ان میں " بِرّ " کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا معنی ''نیکی'' کیا گیا ہے، یہ لفظ نیکی کی تمام قسموں کو شامل ہے، ایمان، تقویٰ، سخاوت، تلاوت، حسنِ اخلاق، نماز، روزہ، صدقہ، خیرات، یتیموں پر شفقت، بیواؤں کی اعانت، بزرگوں کی تعظیم، چھوٹوں سے محبت، مصیبت زدہ کی دل جوئی اور بیمار کی عیادت یہ سارے اعمال ''بِرّ'' میں شامل ہیں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث میں بھی ''بِرّ'' (نیکی کا لفظ مختلف انداز میں آیا ہے) حضرت ابن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی اور گناہ کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا: ''نیکی حسنِ خلق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور تمہیں اس پر لوگوں کا مطلع ہونا پسند نہ ہو۔''

(مسلم : ۲۵۵۳)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم ہمیشہ سچ بولا کرو کیونکہ سچ نیکی کی راہ دکھاتا ہے اور نیکی جنت تک پہنچا دیتی ہے۔''

(بخاري : ٦٠٩٤)

ان جیسی احادیث کے مطالعے سے ہمارے سامنے نیکی کا اسلامی تصور واضح ہوتا ہے اور یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جیسے نماز، روزہ اور ذکر وتلاوت نیکی ہے اسی طرح بھوکے کو کھانا کھلانا، مسلمان کو سلام کرنا، راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹا دینا، پیاسے جانور کو

پانی پلا دینا، مساکین کی مدد کرنا، بے سہاروں کا سہارا بننا، طلبہ اور علماء کی خدمت کرنا، روٹھے ہوئے بھائیوں میں صلح کرا دینا، سایہ دار درخت لگا دینا، پیادہ چلنے والے کو سواری پر جگہ دے دینا، مصیبت زدہ کو تسلی دینا، بیمار کی عیادت کرنا یہاں تک کہ مسلمان بھائی کے لئے مسکرا دینا بھی نیکی ہے، یوں قرآنی اور نبوی تعلیمات نے نیکی کا دائرہ مسجد سے بازار تک، مدرسہ سے دکان تک، خانقاہ سے فیکٹری تک، نماز سے نکاح تک، ذکر و تسبیح سے سیر و سیاحت تک اور رزم سے بزم تک پھیلا دیا۔

یہودیت، عیسائیت اور دوسرے تحریف شدہ مذاہب کے علمبرداروں نے انسانی زندگی کو دین اور دنیا کے دو متضاد کیمپوں میں تقسیم کر دیا تھا اور ان دونوں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل تھی، دیندار اور نیک بننے کے لئے تارک الدنیا ہونا ضروری تھا۔ جو شخص جتنا نیک ہوتا وہ اتنا ہی دنیا اور دنیا کے تقاضوں سے دور بھاگتا تھا اور اس وحشت اور نفرت کو اس کے کمال کی دلیل سمجھا جاتا تھا، جو شخص تجارت، سیاست اور معاشی جدوجہد میں مصروف ہوتا اس کا خدا رسیدہ اور نیک ہونا محال سمجھا جاتا۔

ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سمجھایا کہ اگر سوچنے کا انداز اور دیکھنے کا زاویہ بدل لو تو دنیا بھی دین بن بھی سکتی ہے اور اس ذرا سی تبدیلی سے تم اپنے لئے دنیا کے ہر گوشے اور ہر جگہ کو عبادت گاہ میں تبدیل کر سکتے ہو۔

عبادت، عملِ صالح اور نیکی کے مفہوم میں یہ وسعت دیکھنی ہو تو ہادیِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فرمودات کا مطالعہ فرمائیے! جن میں آپ نے نیکی کے کاموں کی نشاندہی فرمائی ہے، مثال کے طور پر اس حدیث کو لیجئے جسے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اسلام میں سب سے بڑی نیکی کیا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ کہ تم (بھوکوں کو) کھانا کھلاؤ اور ہر مسلمان کو سلام کرو خواہ تم

اسے پہچانتے ہو یا کہ نہ پہچانتے ہو۔ (بخاري : ۱۲ ، مسلم : ۳۹)

اس حدیث کے حوالے سے ایک مشہور سوال یہ کیا جاتا ہے کہ متعدد احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ سے مختلف حضرات نے یہی سوال کیا کہ اسلام میں سب سے بڑی نیکی کیا ہے؟ اور آپ نے ہر ایک کے جواب میں مختلف عمل ذکر فرمایا، کہیں جہاد، کہیں ذکر و عبادت، کہیں کھانا کھلانا اور کہیں سلام کرنا......ایسا کیوں ہے؟ تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہمارے آقا صرف واعظ اور معلم ہی نہ تھے بلکہ مربی اور نفسیات داں حکیم بھی تھے اس لئے یا تو آپ نے وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر اور یا پھر خود سائل کے حالات اور کمزوریوں کو سامنے رکھ کر مختلف جوابات ارشاد فرمائے۔

مثلاً اگر دشمن سے مقابلہ درپیش تھا تو آپ نے جہاد کو سب سے افضل نیکی قرار دیا اور اگر غربت اور فقر و فاقہ کا دور تھا تو آپ نے محتاجوں اور بھوکوں کو کھانا کھلانے کو سب سے بہتر عمل بتایا۔

اسی طرح اگر سائل کے اندر دوسری خوبیاں تو پائی جاتی تھیں مگر وہ ذکر و تسبیح میں سستی کرتا تھا تو اسے سمجھایا کہ تمہارے لئے افضل عمل یہ ہے کہ تم ذکر کیا کرو یا وہ عبادت و تلاوت میں خوب مستعد تھا مگر اس کی طبیعت میں بخل کا غلبہ تھا تو اس کے لئے آپ نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا عمل تجویز کیا اور انفاق فی سبیل اللہ کو سب سے بڑی نیکی بتایا۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے، سورہ اسراء میں ہے: ''اور تمہارے رب نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ بھلائی کرتے رہو، اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہاری زندگی میں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف تک نہ کہو اور نہ ہی انہیں جھڑکنا اور ان سے ادب سے بات کرنا۔'' (سورۃ الإسراء: ۲۳)

اس آیت کی تشریح میں امام قرطبی رحمہ اللہ نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ ہم اپنے الفاظ میں قدرے تشریح کے ساتھ ذیل میں نقل کرتے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنی عبادت اور توحید کا حکم دیا ہے، اس کے بعد متصل ہی والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے، یہ انداز حقوق والدین کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے، عام علماء کرام نے اس کی حکمت اور نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ اگرچہ انسان کا حقیقی خالق اور مربی اللہ تعالیٰ ہے، لیکن ظاہری طور پر اس کے دنیا میں آنے اور اس کی تربیت اور پرورش کا سبب اس کے والدین ہیں۔

(۲) والدین کو کبھی گالی نہ دے، خود بلا واسطہ گالی دینا تو دور کی بات ہے، اسلام میں والدین کو گالی دلوانے کا سبب بننا بھی جائز نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کبیرہ گناہوں میں سے ایک والدین کو گالی دینا بھی ہے، حضرات صحابہ نے عرض کیا! یا رسول اللہ! کیا کوئی شخص اپنے والدین کو بھی گالی دے سکتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں اور وہ یوں کہ ایک شخص دوسرے کے ماں باپ کو گالی دے اور دوسرا

جواب میں اس کے ماں باپ کو گالی دے۔ (صحیح مسلم)

(۳) جائز کاموں میں والدین کی نافرمانی نہ کرے، والدین کا ایسا حکم جس پر عمل کرنے سے اللہ اور رسول کی نافرمانی نہ ہوتی ہو اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

(۴) احادیث کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ والدین میں سے والدہ کے حقوق زیادہ ہیں اور والد کے مقابلہ میں والدہ کی زیادہ خدمت کرنی چاہیے۔

(۵) والدین اگر بالفرض کافر اور مشرک بھی ہوں تو بھی ان کی خدمت کرنا چاہیے اور ان کے حقوق ادا کرنے چاہئیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسے غیر مسلموں کے ساتھ بھلائی کرنے سے منع نہیں فرمایا جو اسلامی مملکت میں پر امن شہریوں کی حیثیت سے رہنا چاہیں، ان کے ساتھ ہمارا کوئی خونی اور نسلی رشتہ ہو یا نہ ہو، جب اجنبیوں کے ساتھ بھلائی کی اجازت ہے تو والدین کے ساتھ بطریق اولیٰ اس کی اجازت ہوگی۔

صحیح بخاری میں حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے فرماتی ہیں: ”صلح حدیبیہ کے زمانے میں میری (مشرکہ) والدہ میرے ساتھ آئیں، میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا میں اس کے ساتھ صلح رحمی والا معاملہ کرسکتی ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہاں تم اپنی والدہ کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو۔“

(۶) اگر جہاد فرض عین ہو جائے تو دوسری بات ہے، لیکن جب تک جہاد فرض عین نہ ہو والدین کی اجازت کے بغیر جہاد میں جانا جائز نہیں۔

(۷) والدین کے ساتھ بھلائی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ان کے عزیزوں، دوستوں اور تعلق داروں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیا جائے۔

(۸) یوں تو زندگی کے ہر دور میں والدین کے ساتھ محبت اور شفقت کا معاملہ ضروری ہے، لیکن اگر وہ بوڑھے ہو جائیں تو وہ اولاد کی توجہ کے اور زیادہ مستحق ہو جاتے ہیں،

اسی طرح قرآن نے ان کے بڑھاپے کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، کیونکہ بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے انہیں خدمت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا: ''ذلیل ہوگیا، ذلیل ہوگیا'' عرض کیا گیا یا رسول اللہ! آپ کس کے بارے میں فرمارہے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اپنے والدین کو یا دونوں میں سے ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا، مگر (وہ ان کی خدمت کر کے اپنے آپ کو) جنت میں داخل نہ کرواسکا۔

(۹) مذکورہ بالا آیت میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ان کو اُف بھی نہ کہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی ایسی سخت اور ادب سے گری ہوئی بات نہ کہی جائے جس سے ان کی دل آزاری ہو۔

(۱۰) اپنے والدین کے لیے زندگی میں بھی اور ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد خاص طور پر دعائیں کی جائیں۔ (قرطبي: ۱۰/۱۵۵۔۱۶۱)

فوائد:

اہلِ علم نے والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کے کئی فوائد بیان کیے ہیں:

۱۔والدین کی خدمت اور ان سے بھلائی کمال ایمان اور حسن اسلام کی دلیل ہے۔

۲۔عبادات اور اطاعات میں سے بہت بڑی عبادت ہے۔

۳۔ان کی خدمت انسان کو جنت تک پہنچادیتی ہے۔

۴۔والدین کی خدمت سے عمر، مال اور اولاد میں برکت ہوتی ہے۔

۵۔آخرت میں بھی عزت ملتی ہے اور دنیا میں بھی۔

۶۔جو اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا اس کی اولاد اس کے ساتھ اچھا

سلوک کرے گی۔

۷- والدین کے ساتھ حسن سلوک سے بہت سے غم اور پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں۔

۸- جو والدین کو خوش رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کا نور بجھنے نہیں دیتا۔

(نضرة النعیم : ۷۷۹/۳)

گریہ وبکا

اللہ تعالیٰ کے خوف، گناہوں پر ندامت، شکر نعمت اور باری تعالیٰ کی عظمت کا استحضار کرتے ہوئے رونا ایمان کی دلیل ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے سچے مؤمن کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو گناہوں کی نجاست کو دھو کر صاف کر دیتے ہیں، باطن کی پیاسی زمین سیراب ہو جاتی ہے، اس کے اندر معرفت اور یقین کی سرسبز کھیتی لہلہانے لگتی ہے، دل کو سکون ملتا ہے، جہنم کی آگ حرام ہو جاتی ہے اور چند آنسوؤں سے اللہ تعالیٰ کا وہ قرب نصیب ہوتا ہے جو سینکڑوں نوافل سے بھی نصیب نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایسے لوگوں کا تذکرہ فرمایا ہے جن کی آنکھوں سے معرفت حق، خوف خدا اور کلام الٰہی کی عظمت کی وجہ سے آنسو چھلک پڑتے تھے۔ سورۃ الاسراء میں ان اہل عمل کا ذکر ہے جو قرآنی آیات سن کر روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''آپ کہہ دیجئے کہ آپ اس پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ (بہر صورت) جن لوگوں کو اس سے قبل علم دیا جا چکا ہے جب یہ ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے، وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار بے شک ہمارے پروردگار کا وعدہ ضرور پورا ہو کر رہتا ہے اور ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں روتے ہوئے اور یہ قرآن ان کا خشوع اور بڑھا دیتا ہے۔'' (سورۃ الإسراء: ۱۰۷۔۱۰۹)

سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف احادیث میں بھی خشیت الٰہی کی وجہ سے گریہ و بکاء کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔

''حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ'' دو آنکھوں کو آگ نہیں چھو سکے گی ایک وہ آنکھ جو اللہ

تعالیٰ کے خوف سے روتی ہے اور دوسری وہ آنکھ جو اللہ کی رضا کے لیے پہرہ دیتے ہوئے رات کو بیدار رہتی ہے۔ (جامع ترمذی : ۱٦۳۹)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اللہ کے خوف سے روتا ہو وہ دوزخ میں نہیں جائے گا تاوقتیکہ دودھ تھنوں میں واپس چلا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے راستے کا غبار اور جہنم کا دھواں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے۔ (جامع ترمذی : ۱٦۳۳)

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محض آہ وبکاء کے فضائل ہی بیان نہیں فرمائے بلکہ آپ اپنی عملی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے خوف اور عظمت وہیبت کی وجہ سے کثرت سے رونے والے انسان تھے، حضرت عبداللہ بن شخیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا آپ کے سینے میں شدت گریہ کی وجہ سے ایسی آواز نکل رہی تھی جیسے ہنڈیا کے ابلنے کی آواز ہوتی ہے۔ (ابوداؤد : ۹۰٤)

علماء نے رونے کی کئی قسمیں بیان فرمائی ہیں، ہم ان اقسام کو مختصر وضاحت اور بعض اقوال اور حکایات کے ساتھ ذیل میں درج کرتے ہیں:

☆...... اللہ کے خوف سے رونا:

اللہ والوں کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کی وجہ سے اس کا خوف پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کی آنکھیں سیل رواں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں، انہیں اپنے چھوٹے چھوٹے گناہ پہاڑوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں اور اپنی عبادت وریاضت انتہائی قلیل محسوس ہوتی ہے، ان میں سے سالہا سال راتوں کو جاگ کر ذکر وفکر اور عبادت و تلاوت میں مصروف رہے، لیکن اس کے باوجود دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے ان کی زبان پر یہی تھا: '' ما عبدناك حق عبادتك '' اے اللہ! معاف کردینا ہم سے تیری عبادت کا

حق ادا نہیں ہوسکا۔ یہ لوگ اپنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کی راہ پر لٹا دیتے ہیں، پھر بھی اس خوف سے روتے رہتے ہیں کہ پتہ نہیں، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ قبول بھی ہوا یا نہیں۔

☆...... تلاوت کے وقت رونا:

جن لوگوں کے دل میں کلام اللہ کی عظمت ہوتی ہے اور ان کے سینے ایمان کے نور سے منور ہوتے ہیں اور انہیں یوم الجزاء کی گرفت اور رب ذوالجلال کی کبریائی اور بے نیازی کا احساس ہوتا ہے، وہ جب قرآن پڑھتے اور سنتے ہیں تو ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں، ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں خود سید المعصومین صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی تلاوت کے وقت یہی حال ہوتا تھا اور یہی نقشہ ہمیں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی زندگی میں دکھائی دیتا ہے۔ صحیح بخاری کی ایک طویل روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب تلاوت فرماتے تو آپ کو اپنی آنکھوں پر قابو نہ رہتا مشرکین کی عورتیں اور بچے آپ کے اردگرد جمع ہوجاتے اور آپ کی تلاوت سے محظوظ ہوتے اس بات نے مشرکین قریش کے سرداروں کو فکر اور تشویش میں مبتلا کردیا کہ کہیں یہ بھی سن کر مسلمان نہ ہوجائیں۔

کہاں تک لکھا جائے اس حوالے سے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے واقعات بے شمار ہیں۔ حضرت امام غزالی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ تلاوتِ قرآن کے وقت صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی عجیب حالت ہوتی تھی۔ ان میں بعض ایسے تھے جو جھومتے تھے بعض ایسے تھے جو روتے تھے بعض ایسے تھے جو بے ہوش ہوجاتے تھے اور بعض ایسے تھے جو اسی بے ہوشی کی حالت میں انتقال فرماگئے۔ ہم ان ساری ہی کیفیات سے محروم ہیں، اس لیے کہ تلاوت کے وقت نہ تو ہمارے دل میں کلام اللہ کی عظمت کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی ہم غور و تدبر کے ساتھ تلاوت کرتے اور سنتے ہیں۔

☆...... **شکر کی وجہ سے رونا :**

اللہ تعالیٰ جب اپنے مخصوص بندوں کو کوئی دینی یا دنیاوی نعمت عطاء فرماتا ہے تو ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں، یہ آنسو اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ہر عطا کو بلا استحقاق سمجھتے ہیں، ان کا دل کہتا ہے کہ ہم تو اپنے گناہوں کی وجہ سے سزا کے قابل تھے۔ مگر اس غفور ورحیم نے سزا کی بجائے محض اپنے لطف وکرم کی وجہ سے نعمت عطا فرمادی۔ یاد ہوگا ایک بار سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت اور کثرت گریہ کو دیکھ کر عرض کیا تھا کہ ''آپ کے اگلے پچھلے گناہ اللہ نے معاف کر دیئے تھے، پھر آپ اس قدر کیوں روتے ہیں؟ تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا تھا:

" أفلا أكون عبدًا شكورًا ."

''کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔'' (بخاري : ۱۱۳۰)

کہا جاتا ہے ایک بزرگ کہیں جا رہے تھے راستے میں ایک پتھر کو انہوں نے روتے ہوئے دیکھا۔ رونے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ میں نے ایک شخص کو قرآن کی یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا ہے: ﴿وقودها الناس والحجارة﴾ (جہنم کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے) جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ تب سے جہنم کے خوف سے رو رہا ہوں، اس بزرگ نے اللہ تعالیٰ سے دعاء مانگی کہ اے باری تعالیٰ! اس پتھر کو جہنم کا ایندھن نہ بنانا ان کی دعاء قبول ہوگئی وہ بزرگ آگے چلے گئے کچھ دنوں کے بعد واپسی میں اسی راستے سے گزرے تو دیکھا کہ وہ پتھر پھر رو رہا ہے، بزرگ نے پوچھا کہ اب کیوں رو رہے ہو؟ تو اس نے جواب دیا: " ذالك بكاء الخوف و هذا بكاء الشكر و السرور ." (وہ پہلا رونا خوف کی وجہ سے تھا اور یہ رونا جہنم سے آزادی ملنے پر خوشی اور شکر کی وجہ سے ہے)

☆...... **کسی عزیز کی جدائی پر رونا :**

شرعی حدود کے دائرے میں رہتے ہوئے عزیز و اقارب کی وفات اور جدائی پر بھی رونا جائز ہے۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات پر رو پڑے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس پر تعجب فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابن عوف! یہ رحمت ہے، پھر فرمایا: " ان العين تدمع و القلب يحزن ولا نقول الا ما يرضى ربنا بفراقك يا ابراهيم ." (آنکھ رو رہی ہے دل غم زدہ ہے مگر وہی بات کہیں گے جس سے ہمارا رب راضی ہو، اے ابراہیم! (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہم تیری جدائی پر بڑے غمگین ہیں) (بخاري : ۱۳۰۳)

اِنصاف

اہل علم نے انصاف کی چار قسمیں بیان فرمائی ہیں:

۱-انسان اپنے ساتھ انصاف کرے اس لئے کہ جو شخص اپنے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا وہ دوسروں کے ساتھ بھی انصاف نہیں کرسکتا، انسان کا اپنے نفس کے ساتھ انصاف (احسان) یہ ہے کہ وہ اس کے لئے ایسی چیز کا دعویٰ نہ کرے جو حقیقت میں اس کی نہیں ہے، اسے گناہوں میں مبتلا کرکے ذلیل وخوار نہ کرے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور توحید، محبت، خوف، امید اور توکل کے ذریعے اس کی تربیت کرے اور اسے عزت و رفعت کا حقدار بنائے۔ اپنے ساتھ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وہ یہ پہچانے کہ اس کے خالق اور مالک کا حق کیا ہے اور اسے کس مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اپنے رب کے ساتھ ٹکراؤ کا راستہ ہرگز اختیار نہ کرے۔

۲--اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں انصاف کا مطلب یہ ہے کہ اس کی بندگی کا حق ادا کرے، اس کی نعمتوں پر شکر ادا کرے، اپنے علم میں جہالت کا، اپنے عمل میں آفات کا، اپنی ذات میں عیوب کا اور اپنے معاملات میں ظلم کا اقرار کرے، اگر اللہ تعالیٰ گناہوں پر مواخذہ کرے تو اسے اس کا عدل سمجھے، اگر وہ درگزر فرمائے تو اسے اس کا فضل جانے، ہر حال میں رب تعالیٰ کو محسن اور اپنے آپ کو بُرا تصور کرے۔

۳--نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انصاف یہ ہے کہ آپ پر ایمان لائے، آپ سے ساری مخلوق سے زیادہ محبت کرے، آپ کے حکم اور ارشاد کو دوسروں کے احکام پر ترجیح دے، بندے کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں کوتاہی کرنا بہت بڑا ظلم ہے، اس لئے کہ آپ ایمان والوں پر ساری مخلوق سے زیادہ مہربانی اور شفقت کرنے والے ہیں۔

۴۔انسانوں کے ساتھ انصاف یہ ہے کہ ان کے حقوق ادا کرے،ان پران کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالے،ان کے ساتھ ویسے معاملہ کرے جیسا کہ اپنے ساتھ معاملہ کرنا پسند کرتا ہے۔اسلام ہر کسی کے ساتھ انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے چاہے وہ رائے، دین اور مذہب کے اعتبار سے مخالف ہی کیوں نہ ہو۔ (نظرة النعيم : ۵۷۹،۵۷۸/۳)

سورہ نساء میں ہے:''اے ایمان والو! عدل وانصاف پر مضبوطی سے جم جانے والے اور اللہ کی رضا کے لئے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ اگر چہ وہ گواہی تمہارے اپنے خلاف ہو یا اپنے ماں باپ یا رشتہ داروں کے خلاف ہو۔'' (سورة النسآء : ۱۳۵)

سورہ مائدہ میں ہے:''اے ایمان والو! تم اللہ کی خاطر حق پر قائم ہو جاؤ اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ، کسی قسم کی عداوت تمہیں خلافِ عدل پر آمادہ نہ کردے، عدل کیا کرو جو پرہیز گاری کے زیادہ قریب ہے۔'' (سورة المآئدة : ۸)

اسلام ہر کسی کے ساتھ انصاف کا حکم دیتا ہے خواہ وہ دشمن اور غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو پھلوں کا اندازہ لگانے کے لئے خیبر بھیجا، انہوں نے آپ کو کچھ رشوت دینا چاہی، حضرت عبداللہ نے فرمایا:''اے یہود کی جماعت! تم میرے نزدیک مخلوق میں سب سے زیادہ قابل نفرت ہو، تم نے اللہ کے نبیوں کو قتل کیا اور اللہ پر جھوٹ بولا، لیکن تم سے مجھے جو نفرت ہے وہ مجھے تمہارے اوپر ظلم پر آمادہ نہیں کرسکتی، یہود یہ جواب سن کر کہہ اٹھے، اسی سے تو ارض وسما قائم ہیں۔''

ابوداؤد کی ایک حدیث میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ اسلم نے فرمایا''جس نے کسی ذمی پر ظلم کیا یا اسے ذلیل کیا، یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ ڈالا یا اس کی رضامندی کے بغیر اس سے کوئی چیز لے لی تو میں قیامت کے دن اس کی طرف سے وکیل بن کر آؤں گا۔''

اندازہ کیجئے! کہاں تو وہ اسلامی معاشرہ تھا جس میں غیر مسلم پر ظلم کی اجازت نہیں تھی

اور اسے بہر صورت انصاف مل کر رہتا تھا اور کہاں ہمارا معاشرہ ہے جسے ہم نے ظلم سے بھر دیا ہے اور انصاف عنقا ہو کر رہ گیا ہے، غیروں کو تو چھوڑ یئے خود مسلمان، مسلمان کے ہاتھوں محفوظ نہیں، ہمارا کون سا محکمہ ہے جو ظلم سے محفوظ ہے، دیہاتوں سے شہروں تک، بازاروں سے محلوں تک ہر جگہ ظلم ہی ظلم ہے، قانون مکڑی کا جالا ہے جو کمزور کو دبوچ لیتا ہے اور طاقتور اسے توڑ کر نکل جاتا ہے، قانون کی بولی لگتی ہے، جو بڑی بولی لگا لے اسے خرید لے۔

اقرباء پروری عام ہے، دشمن کا تنکا بھی شہتیر دکھائی دیتا ہے اور اپنوں کا شہتیر بھی تنکے سے کمتر نظر آتا ہے، حالانکہ حکم یہ دیا گیا تھا کہ ہر حال میں انصاف پر قائم رہو، کسی کی محبت یا عداوت کی وجہ سے عدل کا دامن نہ چھوڑو، یاد ہوگا جب فاطمہ نامی ایک خاتون نے چوری کی تھی، اس کے رشتہ داروں کو جب پتہ چلا کہ اس جرم کی سزا ہاتھ کاٹنے کی صورت میں دی جائے گی تو انہوں نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو سفارشی بنا کر بھیجا، وہ جانتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسامہ سے محبت کرتے ہیں، ذاتی اوصاف وخصوصیات کے علاوہ وہ آپ کے متبنّٰی حضرت زید رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے، انہوں نے جب قوم کے اصرار پر سفارش کی تو آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور آپ نے فرمایا:

”کیا تم اللہ کی حدود میں سفارش کرتے ہو، تم سے پہلی قوموں کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی غریب اور کمزور جرم کرتا تو اس پر حد جاری کرتے اور اگر کسی معزز سے جرم سرزد ہو جاتا تو اسے چھوڑ دیتے، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔“

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج ہم دوبارہ پہلی قوموں کے حالات سے دوچار ہیں، جہاں کمزوروں کے لئے قانون اور ہے، اور طاقتوروں کے لئے قانون اور ہے۔ باوجودیکہ انصاف میں بے پناہ دینی اور دنیوی فوائد ہیں ہم انصاف کو رواج دینے کے لئے آمادہ

نہیں۔ آیئے ایک نظر ان فوائد پر ڈالیں:

۱-انصاف کمال ایمان اور صحت اسلام کی دلیل ہے۔

۲-انصاف، ملکوں اور معاشروں کی مضبوطی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

۳-بندے کا اپنے بارے میں انصاف کرنا، اسکے انانیت سے پاک ہونے کی دلیل ہے۔

۴-انصاف سے محبت کو فروغ ملتا ہے اور ہر شخص اپنی جان، مال اور آبرو کے بارے میں اطمینان محسوس کرتا ہے۔

۵-انصاف سے حقداروں کو حقوق مل جاتے ہیں اور روحِ عدالت عام ہو جاتی ہے۔

٦-انصاف کی وجہ سے دل بغض وحسد اور نفرت جیسی صفات سے پاک ہو جاتے ہیں۔

۷-مخالفین کیساتھ انصاف کی وجہ سے معاشرہ، سازشوں اور مکر وفریب سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

۸-انصاف کی وجہ سے ہر شخص کو اپنا مستقبل محفوظ نظر آتا ہے اور وہ یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔

۹-جہاں انصاف ہوتا ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔

۱۰-جہاں انصاف ہوتا ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔

(نضرة النعيم: ٣/٥٩٦، ٥٩٧)

اِنفاق

لغت میں ''انفاق'' کا مادہ دو معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ایک کسی چیز کا ختم ہو جانا اور دوسرا کسی چیز کو چھپا دینا۔انفاق میں عام طور پر پہلے معنی کا لحاظ ہوتا ہے اس لئے کہ جو چیز خرچ کی جاتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔اصطلاح میں ''انفاق'' کہتے ہیں نیک یا مباح کاموں میں حلال یا پاک مال خرچ کرنے کو۔ (مقاييس اللغة : ٥/٤٥٤)

قرآن کریم میں نفقہ اور انفاق کا لفظ پانچ معانی میں استعمال ہوا ہے:

1- فرض زکوٰۃ:

سورۂ بقرہ میں ہے: ''ہم نے انہیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

2- نفلی صدقات:

سورۂ آل عمران میں متقین کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی بتائی گئی ہے: ''وہ خوشحالی اور تنگی میں خرچ کرتے ہیں۔'' (۱۳۴)

3- جہاد میں خرچ کرنا:

سورۂ بقرہ میں ہے: ''اللہ کی راہ (جہاد) میں اپنے اموال خرچ کرو۔''

4- اہل وعیال پر خرچ کرنا:

سورۂ طلاق میں ہے: ''وسعت والے کو اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرنا چاہئے۔''

5- فقر وتنگدستی:

سورۂ اسراء میں ہے: ''فرما دیجئے اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو ممکن تھا کہ تم ختم ہو جانے کے ڈر سے بخل کرنے لگتے۔'' (۱۰۰)

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم (سورۂ بقرہ ۲۴۴) میں انفاق کو قرضِ حسن قرار دیا ہے حالانکہ

ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کا دیا ہوا ہے اور وہی ہمیں صحیح خرچ کرنے کی بھی توفیق دیتا ہے، اصل میں انفاق کو قرض حسن قرار دینے میں انسانی نفسیات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کیونکہ جب قرض دہندہ کو اس بات کا علم ہو کہ قرض خواہ متمول بھی ہے اور دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام بھی کرتا ہے گویا اس کی رقم ڈوبنے کا کوئی خطرہ نہیں تو وہ انتہائی خوشدلی سے قرض دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اگر وہ یہ بھی جانتا ہو کہ قرض خواہ میری رقم کو مال شراکت قرار دے کر اپنے چلتے ہوئے کاروبار میں لگائے گا اور کئی گنا منافع کما کر مجھے لوٹائے گا تو اسے مطلوبہ رقم دینے میں مزید خوشی ہوگی اس کے ساتھ ساتھ اگر اسے یہ بھی علم ہو کہ قرض خواہ ایسا کریم اور کشادہ دل ہے کہ قرض لوٹاتے ہوئے اپنے فضل سے مزید ہی عطا نہیں کرتا بلکہ مالا مال کر دیتا ہے تو پھر وہ اشارہ پاتے ہی قرض دینے کے لئے آمادہ ہو جائے گا اور اس کے بہانے تلاش کرے گا کہ مجھ سے کسی طرح قرض لے لیا جائے کیونکہ عام طور پر جو لوگ کسی کو قرض نہیں دیتے تو اس کی وجہ یا تو یہ ہوتی ہے کہ ان کے دل میں بخل اور مال کی شدید محبت ہوتی ہے یا اس لئے کہ انہیں قرض خواہ کے معاملات پر اعتماد نہیں ہوتا اور وہ اسے لیچڑ اور بددیانت انسان سمجھتے ہیں لیکن کریم ورحیم رب کے بارے میں ان باتوں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا پھر وہ جو قرض مانگتا ہے تو اپنی حاجت اور مجبوری کی بناء پر نہیں بلکہ اس کا فائدہ بھی سراسر انسانوں ہی کو ہوتا ہے۔

ذرا سوچئے! کہ دین کی سربلندی، ملک کے دفاع، دشمنان اسلام کے توڑ اور فقراء و مساکین پر خرچ کرنے میں کس کا فائدہ ہے؟ اللہ کا یا اللہ کے بندوں کا؟ بلاشبہ اس میں سراسر بندوں کا فائدہ ہے وہ ذات تو غنی اور بے نیاز ہے اگر سارے انسان بخل کرنے لگیں اور مال کے خزانوں پر سانپ بن کر بیٹھ جائیں تو رب تعالیٰ کی کبریائی میں کیا فرق آئے گا اور اس کی بادشاہی کو کیا نقصان پہنچے گا۔

اہم نکتہ:

یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ قرآن میں جہاں بھی قرض کا ذکر آیا ہے وہاں اس کے ساتھ ''حسن'' کی صفت بھی آئی ہے۔قرض حسن وہ ہوگا جس کے اندر تین صفات پائی جاتی ہوں:

۱-طیب اور حلال مال سے ہو۔خبیث اور ردی مال اللہ کی راہ میں خرچ نہ کیا جائے۔

۲-پوری خوش دلی اور رضاء الٰہی کے جذبے کے ساتھ دیا جائے۔

۳-نہ کسی پر احسان جتلایا جائے اور نہ ہی کسی کو تکلیف دی جائے۔

پہلی صفت کا تعلق مال سے ہے دوسری کا اللہ اور بندے سے اور تیسری کا دینے اور لینے والے سے ہے۔ (التفسير القيم : صـ ۱٤۸ ، نظرة النعيم : ۵۹۹/۳)

ایک خوبصورت تشبیہ:

قرآنِ کریم میں اللہ کی راہ میں اموال خرچ کرنے والوں کو اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو زمین میں ایک دانہ بوتا ہے اور اس سے سات بالیاں اگتی ہیں ہر بالی میں سو دانے ہوتے ہیں گویا ایک دانے سے اسے سات سو دانے حاصل ہو جاتے ہیں اور یہ سات سو دانے آخری حد نہیں بلکہ اللہ پاک جسے چاہے اس سے بھی زیادہ عطا کرتا ہے۔

(سورة البقرة: ۲٦۱)

بات یہ ہے کہ کئی چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے انفاق فی سبیل اللہ کے اجر میں اضافہ ہوتا ہے مثلاً ایمان، اخلاص، شرح صدر، حلال اور پاک مال، صحیح مصرف، احسان جتلانے اور اذیت دہی سے بچنا۔صفات جس قدر اعلیٰ درجہ کی ہوں گی اتنا ہی زیادہ اجر وثواب ہوگا اور اگر ان میں نقص ہوگا تو اجر میں بھی نقص واقع ہونا یقینی ہے۔

جیسے کاشتکار زمین میں جو بیج بوتا ہے تو اسے بیج کے پھلنے پھولنے اور بارآور ہونے میں کئی چیزوں کا دخل ہوتا ہے زمین زرخیز ہو، بیج عمدہ اور صحت مند ہو، اسے مسلسل سیراب کیا

جاتا رہے، گھاس پھونس اور جھاڑ جھنکار کی صفائی کی جائے، کوئی ناگہانی آفت اسے تباہ نہ کردے جب یہ ساری شرائط پائی جائیں گی تو پھر امید کی جاسکتی ہے کہ اس زمین سے ان شاءاللہ دگنی پیداوار حاصل ہوگی یہی محنت اگر ایسی زمین میں کی گئی ہو جو انتہائی بلندی پر واقع ہو تو اس کے بارآور ہونے کے لئے ہلکی پھوار بھی کافی ہو جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بھی انفاق کے بارے میں بہت زیادہ ہیں کبھی تو آپ نے جہاد میں خرچ کرنے کی ترغیب دی، کبھی غرباء و مساکین پر، کبھی اہل و عیال پر، کبھی اعزہ و اقارب پر اور کبھی آپ نے مطلقاً اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرنے کے فضائل بیان فرمائے، چند احادیث کا مطالعہ آپ بھی فرمالیں۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مولی ہیں وہ روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بہترین دینار وہ ہے جو انسان اپنے عیال پر اور جہاد کے لئے تیار کی ہوئی سواری پر اور مجاہد ساتھیوں پر خرچ کرتا ہے۔

(صحيح مسلم : ۹۹٤)

حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب مسلمان اللہ کی رضا کی نیت سے اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتا ہے تو یہ بھی اس کے لئے صدقہ ہوتا ہے۔ (صحيح بخاری : ٤٠٠٦)

فوائدِ انفاق:

۱- انفاق فی سبیل اللہ کمال ایمان اور حسن اسلام کی دلیل ہے۔

۲- یہ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔

۳- اس سے اللہ بھی راضی ہوتا ہے اور اللہ کے بندے بھی راضی ہوتے ہیں۔

۴- امت کے افراد میں اجتماعیت اور محبت پیدا ہوتی ہے۔

۵- فقراء اور مساکین کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔

٦- بہت سی باطنی بیماریوں خصوصاً حب مال اور بخل سے شفا حاصل ہو جاتی ہے۔

۷- اس سے مال میں برکت پیدا ہوتی ہے اور انسان بہت سارے مصائب اور بلاؤں سے محفوظ رہتا ہے۔

۸- خاندانی تعلقات استوار ہوتے ہیں۔

۹- انفاق جنت تک پہنچانے والے راستوں میں سے ایک اہم راستہ ہے۔

۱۰- اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کو عرش الٰہی کا سایہ نصیب ہوگا۔

(نضرة النعيم : ٦٢٨/٣)

واقعۂ افک

سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اپنی خواتین کو سورۂ نور سکھاؤ! اس سورۃ میں جو اہم مضامین مذکور ہیں ان میں سے ایک واقعۂ افک بھی ہے۔ (افک بہت بڑے جھوٹ کو کہا جاتا ہے)

قرآن مجید نے اجمالی طور پر یہ واقعہ بیان کیا ہے، مگر بخاری مسلم اور مسند احمد وغیرہ کتبِ حدیث میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے تفصیل کے ساتھ اسے ذکر کیا ہے، اگر ان کی مفصل روایت کا مکمل ترجمہ نقل کر دیا جائے تو ''خواتین کا اسلام'' کے صفحات تنگ دامنی کا شکوہ کرنے لگیں گے اس لئے ہم اس کا خلاصہ ذکر کرنے پر اکتفا کریں گے۔

ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ جب آپ کسی سفر پر تشریف لے جاتے تو اپنی رفاقت اور معیت کا شرف بخشنے کے لئے قرعہ اندازی کے ذریعے ازواج مطہرات میں سے کسی ایک کا انتخاب فرماتے، غزوہ بنی مصطلق کے سفر کے موقع پر یہ سعادت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حصے میں آئی، اس غزوے سے واپسی کے موقع پر مدینہ سے چند کوس کے فاصلے پر قافلے نے پڑاؤ ڈالا، سیدہ قضائے حاجت کے لئے تشریف لے گئیں، واپس لوٹ رہی تھیں، اچانک ہاتھ گلے کی طرف چلا گیا دیکھا تو ہار غائب تھا، اسے تلاش کرنے میں کچھ دیر لگ گئی۔ واپس پلٹیں تو کارواں کوچ کر چکا تھا، آپ کے سفر کے لئے جو اونٹ مخصوص تھا اس کے اوپر باپردہ ہودج رکھ دیا گیا، چونکہ آپ دبلی پتلی تھیں اس لئے خدمت پر مامور ساربان کو احساس ہی نہ ہوا کہ آپ ہودج میں موجود نہیں ہیں۔

عرب کے دستور کے مطابق حضرت صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ گری پڑی اشیاء اٹھانے کے لئے قافلے کے عقب میں رہنے پر مامور تھے، وہ صبح کے وقت یہاں پہنچے تو

انہوں نے پورے ادب واحترام کے ساتھ آپ کو اونٹ پر بٹھا کر خود نکیل تھام لی، دوپہر کا وقت تھا جب آپ بارگاہِ نبوت میں پہنچے، منافقین نے تحقیق کیے بغیر بات کا بتنگڑ بنادیا اور حریمِ نبوت کی کردارکشی شروع کردی۔

بنتِ صدیق کو اپنی سادگی، بھولپن اور معصومیت کی وجہ سے خبر ہی نہ تھی کہ ان کے بارے میں کیا کچھ کہا جارہا ہے، البتہ ان کے حساس اور محبت آشنا دل نے اتنا ضرور محسوس کیا کہ شوہر نامدار کی جانب سے سردمہری کا مظاہرہ ہورہا ہے۔ گھر کی خادمہ کے ذریعے ایک دن اچانک ان پر کسی طوفانِ بدتمیزی کا انکشاف ہوا جسے عبداللہ بن ابی مدینہ کے گلی کوچوں میں اٹھائے ہوئے تھا، سیدہ کے لئے یہ انکشاف زلزلہ سے کم نہ تھا، ان کا وجود ہل کررہ گیا، وہ سوچ بھی نہ سکتی تھیں کہ منافق اس حد تک بھی جاسکتے ہیں، اپنے سرتاج سے اجازت لے کر والدین کے گھر چلی آئیں، یہاں بھی حزن وملال کے بادل چھائے ہوئے تھے، جب دیکھا کہ والدین بھی میرے بارے میں بات کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کررہے ہیں تو آپ نے اپنا مقدمہ اللہ کی عدالت میں پیش کردیا مگر اس طرح کہ رونے دھونے کے سوا کوئی کام نہ تھا، نہ کھانے پینے کا خیال، نہ راحت اور بیماری کا احساس، آنسوؤں کا ایک سیلاب تھا جو امڈا چلا آرہا تھا۔

اچانک سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور اس معاملہ میں بات چیت شروع فرمادی، آپ نے اپنے والدین سے گزارش کی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کا جواب دیں لیکن دونوں نے معذرت کرلی چنانچہ مجبوراً آپ ہی کو لب کشائی کرنی پڑی۔ جو کچھ فرمایا اس کا حاصل یہ تھا کہ میرا اللہ جانتا ہے کہ میرا دامن پاک ہے اور میں اپنا معاملہ اسی طرح اس کے حوالے کرتی ہوں جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس کے حوالے کیا تھا، پھر آپ مجلس سے اٹھیں اور نڈھال ہوکر بستر پر جاگریں۔ فرماتی ہیں مجھے اپنی بے گناہی

کا بھی یقین تھا اور اس بات کا بھی یقین تھا کہ میرا رب میری پاکدامنی ظاہر کر دے گا لیکن یہ بات تو میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھی کہ میری برات کا اعلان بذریعہ وحی کیا جائے گا اور اس کی تلاوت کی جائے گی، میں اپنے آپ کو ہرگز اس قابل نہیں سمجھتی تھی کہ اللہ تعالیٰ میرے بارے میں ایسا کلام ارشاد فرمائے جسے (قیامت تک) پڑھا جائے۔

بس زیادہ سے زیادہ امید یہ تھی کہ میری برات کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی خواب دکھا دیا جائے گا لیکن ہوا یہ کہ آپ میرے والدین کے گھر میں تشریف فرما ہی تھے کہ آپ پر وحی کا نزول شروع ہو گیا، جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا:

''اے عائشہ! خوشخبری ہو اللہ عزوجل نے تمہاری برات کا اعلان فرما دیا ہے۔'' یہ سنتے ہی میری والدہ نے مجھ سے کہا اٹھو جا کر حضور کا شکر ادا کرو، میں نے کہا نہیں ان کا نہیں، میں تو اپنے اللہ کا شکر ادا کروں گی جس نے میری برات کے بارے میں آیات نازل فرمائی ہیں۔ (بخاري: ٤١٤١، مسلم: ٢٧٧٠)

ان آیات کا مطالعہ کیا جائے تو تہمت لگانے اور پھیلانے والوں کے بارے میں باری تعالیٰ کا غیظ وغضب انتہا کو چھوتا دکھائی دیتا ہے، مفسرِ قرآن علامہ زمخشری نے بجا فرمایا ہے کہ اگر تم پورے قرآن کو باریک بینی سے پڑھو اور نافرمانوں کو جتنی وعیدیں سنائی گئی ہیں ان کا مطالعہ کرو تو تمہیں وہ شدت، وہ سخت وعیدیں کہیں بھی نہیں دکھائی دیں گی جو سیدہ پر تہمت لگانے والوں کو سنائی گئی ہیں، اسلوب بدل بدل کر اس جرم کی قباحت اور شناعت بیان کی گئی ہے، اگر اس واقعہ کے پس منظر میں صرف آخری چار آیات ہی نازل ہو جاتیں تو مخالفین کی مذمت اور سیدہ کی برأت کے لئے کافی تھیں۔

ان آیات میں باری تعالیٰ نے تہمت لگانے والوں کو دنیا اور آخرت میں ملعون قرار دیا

ہے، انہیں آخرت میں عذابِ عظیم کی وعید سنائی ہے اور بتایا ہے کہ ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کی بہتان تراشی پر قیامت کے دن گواہی دیں گے اور انہیں وہ سزا دی جائے گی جس کے وہ واقعی اہل ہیں۔

آخری آیت میں اصولِ کلی کے طور پر بتایا گیا کہ خبیث مردوں کا میلان خبیث عورتوں کی طرف اور پاک مردوں کا میلان پاک عورتوں کی طرف ہوتا ہے۔ تو تم نے یہ کیسے گمان کرلیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے پاکیزہ انسان کے نکاح میں کوئی ایسی عورت آسکتی ہے جس کا کردار ہی ٹھیک نہیں، جبکہ ختمِ نبوت کے تخت وتاج کے لئے آپ کا انتخاب بھی اللہ نے کیا اور تاجدارِ رسالت کے لئے سیدہ حمیرا کی صورت میں شریکِ زندگی کا انتخاب بھی اسی نے کیا جو ہر انسان کے ماضی کو بھی جانتا ہے اور حال اور مستقبل کو بھی۔

سیدہ کے ماضی کی معصومیت کا تو یہ عالم تھا کہ انہیں ابھی دنیاداری کی ہوا بھی نہ لگی تھی کہ ازدواجی بندھن میں منسلک ہوگئیں۔ آپ کا حال یہ تھا کہ ان کے بستر میں وحی نازل ہوتی رہی اور مستقبل کے تحفظ کا انتظام یہ کیا گیا کہ کتابِ ہدایت میں واقعہ افک کے پسِ منظر میں سترہ آیات نازل فرما کر منافقوں، دریدہ دہنوں اور جفاشعاروں کا منہ قیامت تک کے لئے بند کردیا گیا۔

اعلانِ برأت کا یہ آسمانی اہتمام تاریخِ انسانی میں کسی اور کے لئے نہیں کیا گیا بلکہ ہوا یہ کہ جب سیدنا یوسف علیہ السلام پر تہمت لگی تو ان کی طہارت کی گواہی ایک دودھ پیتے بچے نے دی، حضرت مریم علیہا السلام پر کیچڑ اچھالا گیا تو عفت وعصمت کی شہادت نومولود بیٹے نے دی مگر جب خاتم النبیین کی زوجہ مطہرہ کے دامن کو داغدار کرنے کی کوشش کی گئی تو وحی کے پردے میں خود اللہ تعالیٰ بولا، بولنے کا انداز ایسا جوشیلا اور نرالا تھا کہ سیدہ کے دشمن قیامت تک منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔

قناعت

قناعت، اسلامی اخلاق میں ایک اہم خلق ہے، لغت میں یہ لفظ کسی چیز کی طرف متوجہ ہونے کے معنی میں آتا ہے لیکن یہ رضا کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، قانع اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اللہ کی تقسیم پر راضی ہو اور تھوڑا ملنے پر بھی اللہ کا شکر ادا کرے۔

سورۂ حجر میں یہ لفظ آیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ واطعموا القانع والمعتر ﴾

''اور قناعت سے بیٹھ رہنے والوں کو اور سوال کرنے والوں کو بھی کھلاؤ۔''

(سورة الحجر : ٣٦)

امام جاحظ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قناعت یہ ہے: ''جس قسم کی زندگی میسر ہو اس پر اکتفاء کرے اور جس قدر معاش میسر آئے اس پر راضی رہے اور خواہش ورغبت کے باوجود نہ تو اموال کے حصول کی طمع کرے اور نہ ہی اونچے اونچے مرتبے طلب کرے۔'' گویا قناعت اموال ہی کے بارے میں نہیں ہوتی بلکہ عزت، شہرت اور مقام ومرتبہ کے لحاظ سے بھی ہوتی ہے۔ جتنی عزت اور جیسا مقام ومرتبہ اللہ تعالیٰ نے دیا بس اس پر راضی رہے اور اونچے مقام اور بہت زیادہ عزت وشہرت کی طمع نہ کرے۔

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے ان فقراء صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعریف بھی فرمائی ہے اور اغنیاء کو ان پر خرچ کرنے کی ترغیب بھی دی ہے جو فقر و فاقہ اور بھوک کے باوجود کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتے تھے اور ہر حال میں اللہ کی رضا پر راضی رہتے تھے، فرمایا:

''(تم جو خرچ کرو تو) فقراء پر خرچ کرو جو اللہ کی راہ میں رکے بیٹھے ہیں اور کسی کی طرف جانے کی طاقت نہیں رکھتے (اور نہ ہی کسی سے مانگتے ہیں) یہاں تک کہ نہ مانگنے کی وجہ سے

ناواقف شخص ان کو غنی منیال کرتا ہے اور تم ان کے چہرے سے انہیں پہچان لوگے (کہ فقرو فاقہ کے باوجود) لوگوں کے پیچھے پڑ کر نہیں مانگتے اور تم جو مال خرچ کرو گے بے شک اللہ اسے جانتا ہے۔'' (سورة البقرة : ۲۷۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کہیں صراحتاً اور کہیں اشارۃً قناعت کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور حرص وطمع سے بچنے کا حکم دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''یقیناً کامیاب ہوگیا وہ شخص جس نے اسلام قبول کیا، اسے بقدرِ ضرورت رزق میسر آ گیا اور اللہ نے جو کچھ دیا تھا اس پر قناعت کی توفیق دے دی۔''

(مسلم : ١٠٥٤)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابو ہریرہ! تم لوگوں میں سب سے بڑے عبادت گزار بن جاؤ گے قناعت اختیار کرو، تم سب سے زیادہ شکر گزار ہو جاؤ گے لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو، تم واقعی مومن بن جاؤ گے اپنے پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، تم حقیقی مسلمان شمار ہو گے کم ہنسا کرو کیونکہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے۔ (ابن ماجه : ٤٢١٧)

عام ذہنوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ بڑا عبادت گزار اور اللہ کا محبوب اور مقرب بننے کے لئے بہت زیادہ عبادت وریاضت اور کثرت کے ساتھ نماز روزہ کا اہتمام ضروری ہے لیکن ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی کے ساتھ گناہوں سے بچنے کا اہتمام اور اچھے اخلاق سے اپنے آپ کو متصف کر کے انسان وہ مقام حاصل کر لیتا ہے جو بڑے بڑے عبادت گزاروں کو بھی حاصل نہیں ہوتا۔

ان اخلاق میں قناعت سرِفہرست ہے جس کی ضد حرص اور طمع ہے، یہ حرص اور طمع

انسان کو چوری کا راستہ بھی دکھاتی ہے، خیانت پر بھی آمادہ کرتی ہے، حلال اور حرام کے فرق کو بھی اس کی نظروں میں ہلکا کر دیتی ہے، فرائض سے بھی غافل کر دیتی ہے اور حصولِ مال کے ناجائز اور حرام طریقے اختیار کرنے پر بھی مجبور کر دیتی ہے، اگرچہ بعض لوگوں میں یہ بیماری طبعی اور فطری ہوتی ہے لیکن اکثر لوگ اپنے سے زیادہ مالدار اور خوشحال افراد کو دیکھ کر بھی اس بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ ''تم (مال و دولت کے اعتبار سے) اپنے سے نیچے والوں کو دیکھو اوپر والوں کو نہ دیکھو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم اللہ کی نعمتوں کی ناقدری نہیں کرو گے۔ (بخاری : ٦٤٩٠)

آج ہمارا معاشرہ جو قناعت کے وصف سے خالی ہوتا جا رہا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دنیاوی اعتبار سے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ہر شخص اپنے سے زیادہ خوشحال کو تو دیکھتا ہے مگر اپنے سے زیادہ کمزور غریب افراد کی طرف اس کی نظر نہیں جاتی۔ یوں نہ تو شکر کرنے کی توفیق نصیب ہوتی ہے اور نہ ہی قناعت پیدا ہوتی ہے۔ ہماری اسی سوچ نے ہمیں قلبی سکون سے محروم کر دیا ہے اور ہم میں سے ہر ایک اذیت سے دوچار ہے لیکن یہ اذیت خارجی نہیں ہے بلکہ داخلی ہے یعنی ہمیں کوئی دوسرا اذیت نہیں دے رہا بلکہ ہم اپنے آپ کو خود اذیت میں مبتلا کیے ہوئے ہیں جو لوگ مال کی ہوس میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ دولت کے انبار کے باوجود اپنے آپ کو فقیر ہی محسوس کرتے ہیں اور جنہیں اللہ رب کریم قناعت جیسا وصف عطا فرما دیتا ہے ان کی جیب میں چند روپے یا درہم ہوتے ہیں مگر وہ اپنے آپ کو غنی سمجھتے ہیں اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''غنیٰ بہت زیادہ مال و دولت کی وجہ سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ حقیقی غنیٰ تو دل کا غنی ہونا ہے۔

(صحیح بخاری : ٦٤٤٦)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ یہ دعاء مانگا کرتے تھے۔

''اے اللہ! تو نے مجھے جو کچھ دیا ہے اس پر قناعت عطا فرما اور اس میں برکت دے۔''

(مستدرك حاكم : ٣٥٦/٢)

اور بات صرف وعظ و تلقین اور دعاء تک ہی محدود نہ تھی بلکہ اپنی عملی زندگی میں بھی آپ قناعت پر عمل فرماتے تھے۔ آپ کی قناعت کا حال یہ تھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک موقع پر حضرت عروہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''میرے بھتیجے! دو دو مہینے گزر جاتے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی گھر میں (کھانا پکانے کے لئے) آگ نہیں جلتی تھی میں نے پوچھا گزارا کیسے ہوتا تھا؟

انہوں نے فرمایا: ''دو کالی چیزوں پر ہم گزارا کرتے تھے یعنی کھجور اور پانی البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ انصاری پڑوسی تھے جن کے پاس دودھ دینے والے جانور تھے وہ آپ کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر دودھ بھیج دیا کرتے تھے اور آپ ہمیں پلا دیا کرتے تھے۔ (بخاري : ٦٤٥٩)

یہ قناعت کا اعلیٰ ترین معیار تھا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا کہ ایک طرف تو فقر و فاقہ کی زندگی اختیار فرمائی دوسری طرف کئی کئی دن پیٹ بھر کر کھانا میسر نہ آنے کے باوجود اپنے قول یا عمل سے پریشانی کا اظہار نہ فرماتے۔ تیسری طرف لوگوں کے پاس جو کچھ تھا اس کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھتے۔ حالانکہ وہ لوگ بھی کون تھے؟ آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ کے روحانی بیٹے، عزیز ترین شاگرد اور جانثار مرید جو آپ کے اشارۂ ابرو پر سب کچھ لٹانے کے لئے تیار رہتے تھے۔

مختصر یہ کہ قناعت ایمان کا کمال اور اسلام کا حسن ہے۔ قناعت کی وجہ سے انسان اللہ کا محبوب بن جاتا ہے اور اللہ کے بندوں کا بھی۔ اسی سے دل کو عجیب سکون اور خوشی محسوس ہوتی ہے۔ اگر لوگوں میں قناعت آجائے تو نہ کوئی فقیر رہے اور نہ کوئی اپنے آپ کو محروم سمجھے۔

تواضع

رسالہ قشیریہ میں ہے کہ حق کے سامنے گردن جھکا دینے اور اس پر کسی قسم کا اعتراض نہ کرنے کا نام تواضع ہے۔ اہلِ علم میں تواضع کی تعریف میں فارسی کا ایک جملہ بہت مشہور ہے وہ یہ ہے:

''خود را حقیر دانستن نہ کہ گفتن''

''اپنے آپ کو حقیر سمجھنا نہ کہ اپنے آپ کو حقیر کہنا۔''

مطلب یہ کہ صرف زبان سے اپنے آپ کو حقیر فقیر کہنے کا نام تواضع نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی تواضع یہ ہے کہ دل سے اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں چھوٹا سمجھے لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تواضع اور دنائت میں بڑا فرق ہے۔ دنائت کا مطلب یہ ہے کہ انسان چند سادی اغراض اور مفادات کے حصول کی خاطر خوشامد اور چاپلوسی اختیار کرتا پھر جبکہ تواضع کا حاصل یہ ہے کہ انسان فخر وغرور اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کی بیماری میں مبتلا نہ ہو۔ تواضع اللہ تعالیٰ کے مخصوص اور نیک بندوں کا امتیاز وصف ہے۔ سورۃ الفرقان میں ہے۔

اور رحمٰن کے خاص بندے تو وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلیں اور جب جاہل ان سے جہالت کی بات کرنے لگیں تو انہیں سلام کریں (اور ان سے الگ ہو جائیں)

(سورة الفرقان : ٦٣)

قرآن کریم میں حضرت لقمان علیہ السلام کی جو مختلف نصیحتیں مذکور ہیں ان میں سے ایک نصیحت تواضع کی بھی ہے اور اس کے مختلف مظاہر بتائے گئے ہیں۔ سورۂ لقمان میں ہے:

''اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین پر اترا کر نہ چل کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے شیخی خورے کو پسند نہیں کرتا اور اپنی رفتار پر میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو کسی سے

بحث کرتے ہوئے پست رکھا کرو کیونکہ بُری سے بُری آواز گدھوں کی آواز ہے۔"

(سورة لقمان : ۱۸، ۱۹)

لوگوں سے بے رخی نہ کرنا زمین پر اکڑ کر نہ چلنا۔ چال ڈھال میں غرور سے بچنا اور باتِ چیت میں چیخنے چلانے سے بچنا یہ سب تواضع ہی کے مظاہر ہیں۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تواضع اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کے فضائل بیان فرمائے ہیں:

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ کی وجہ سے مال میں کمی نہیں ہوتی اور عفوو درگزر کی وجہ سے بندے کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ بلندی عطا فرماتے ہیں۔" (مسلم : ۲۵۸۸)

اسی حدیث میں جو تین چیزیں بیان ہوئی ہیں بظاہر یہ نقصان اور کمی کا سبب ہیں۔ ظاہری اسباب اور مادیت پر نظر رکھنے والا انسان یہ سمجھتا ہے کہ صدقہ نہ کرنے اور بخل کی وجہ سے مال میں اضافہ ہوتا ہے۔ عفوو درگزر کی بجائے انتقام لینے سے معاشرے میں عزت حاصل ہوتی ہے اور تکبر والے طور طریقے اپنانے سے لوگوں کی نظر میں بڑائی حاصل ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ جو کہ ظاہری اسباب اور فیصلوں کا پابند نہیں اور جس کی نظر حقائق پر ہے اس کا فیصلہ اور اعلان یہ ہے کہ انسان کی سوچ ناقص اور غلط ہے اور مال اور عزت میں اضافے کا سبب وہ نہیں جو انسان سمجھتا ہے بلکہ وہ چیزیں ہیں جو زبان نبوت نے بیان فرمائی ہیں۔

"حضرت معاذ بن انس جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص قدرت کے باوجود (فخر وغرور والا لباس) محض اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتے ہوئے چھوڑ دے گا اسے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سارے انسانوں کے سامنے

بلائے گا اور اختیار دے گا کہ ایمانی جوڑوں میں سے جونسا جوڑا چاہے زیب تن کر لے۔"

(احياء علوم الدين : ٣/٣٤٣)

فخر وغرور کا تعلق لباس سے نہیں ہے، ممکن ہے کہ قیمتی لباس پہننے والے کے دل میں تواضع ہو اور ہو سکتا ہے کہ فقیرانہ لباس میں ملبوس شخص کا دل تکبر سے بھرا ہوا ہو، لیکن جو شخص فاخرانہ لباس محض اللہ تعالیٰ کے لئے عاجزی اختیار کرتے ہوئے چھوڑ دے گا وہ قیامت کے دن اللہ کے ہاں عزت واکرام کا مستحق ہوگا۔ اس حدیث سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ دکھاوے کے طور پر جو تواضع اختیار کی جائے اس کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کچھ بھی حیثیت نہیں ہے۔

قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر نظر ڈالی جائے تو اس میں قدم قدم پر تواضع کے مظاہر دکھائی دیتے ہیں باوجود یہ کہ آپ خاتم النبیین اور سید المرسلین تھے۔ دس ہزار مربع میل پر آپ کی حکمرانی تھی۔ ہزاروں صحابہ آپ کے جاں نثار مرید اور مخلص شاگرد تھے۔ لیکن آپ کے کسی قول اور عمل سے بڑائی کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع کا یہ عالم تھا کہ بلا تکلف گدھے پر سوار ہو جاتے تھے۔ راستہ گزرتے تو ہر کسی کو یہاں تک کہ بچوں کو بھی سلام کرتے تھے، آپ کے ساتھیوں میں سے کوئی بیمار ہو جاتا تو اس کی عیادت کے لئے تشریف لے جاتے۔ اگر کسی کا انتقال ہو جاتا تو اس کی نماز جنازہ میں شرکت فرماتے۔ بچوں سے دل لگی فرماتے، گھر کے کام کاج میں ازواج مطہرات کا ہاتھ بٹاتے، ٹوٹے ہوئے جوتوں کی درستگی فرماتے، پھٹے ہوئے کپڑوں کی سلائی فرما لیتے اور اپنی مصروفیات میں سے کچھ نہ کچھ وقت اہل خانہ کے لئے ضرور وقف فرماتے تھے۔ اگر صحابہ کسی اجتماعی کام میں مشغول ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کا ہاتھ بٹاتے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خندق کے دن جبکہ سارے صحابہ کھدائی میں مصروف تھے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مٹی اٹھا کر منتقل کرتے تھے یہاں

تک کہ آپ کا شکم مبارک غبار آلودہ ہوگیا۔ (بخاري : ٤١٠٤)

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا۔ اللہ کی قسم! ہم سفر اور حضر میں رسول اللہ کے ساتھ رہے ہیں۔ آپ ہمارے بیماروں کی عیادت کرتے تھے، جنازوں میں شرکت فرماتے تھے، جہاد میں حصہ لیتے تھے اور قلیل اور کثیر کے ساتھ ہماری دل جوئی اور غم خواری فرماتے تھے۔ (مسند احمد : ٥٠٤) دعوت و تبلیغ کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ آپ مدینہ کے یتیموں اور بیواؤں کو بھی پورا پورا وقت دیتے تھے اور آپ کا عظیم منصب اس سلسلے میں رکاوٹ نہیں بنتا تھا، ان میں کوئی آپ کو راستہ میں روک لیتا تھا اور کوئی اپنے ساتھ چلنے پر اصرار کرتا تھا اور آپ بلا جھجک ان کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوجاتے تھے۔

تواضع کی بناء پر آپ اپنے لیے بڑے بڑے القاب اور تعریف میں مبالغہ پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپ نے ایک موقع پر صحابہ کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''میری تعریف میں ویسے مبالغہ نہ کرو جیسے نصاریٰ نے ابن مریم علیہ السلام کی تعریف میں مبالغہ کیا کیونکہ میں محض ایک بندہ ہوں لہٰذا مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہا کرو!'' (بخاري: ٣٤٤٥)

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے تواضع کی حقیقت کے بارے میں عجیب بات فرمائی ہے۔ اصل میں بہت سے سارے لوگ مالداروں کی خوشامد اور چاپلوسی کو تواضع سمجھتے ہیں جبکہ غریبوں کے ساتھ ان کا رویہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ حضرت ابن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تواضع کی حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ دنیا کی نعمتوں میں تم سے پیچھے ہیں ان کے سامنے اپنے آپ کو ایسا جھکا کر رکھو کہ ان پر یہ واضح ہوجائے کہ تمہیں دنیا کی وجہ سے ان پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے اور جو لوگ دنیاوی خوشحالی کے اعتبار سے تم سے آگے ہیں ان سے یوں استغناء کرو کہ انہیں یقین آجائے کہ انہیں دنیاداری کی بنیاد پر تمہارے مقابلے میں

کوئی فضل وکمال حاصل نہیں۔" (احیاء علوم الدین : ۳/۳٤۳)

مختصر یہ کہ تواضع مومنین کے اخلاق میں سے ایک اعلیٰ خلق اور رب العٰلمین کی محبت کی دلیل ہے۔ اس کے ذریعے انسان اللہ کی رضا اور جنت تک پہنچ سکتا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا قرب بھی حاصل ہوتا ہے اور انسانوں کا قرب بھی حاصل ہوتا ہے، اہل تواضع سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے۔ تواضع کی وجہ سے مال اور عمر میں برکت حاصل ہوتی ہے۔

خاموشی

زبان اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ یہ گوشت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے مگر اس کی طاعت بھی عظیم ہے اور اس کا جرم بھی عظیم ہے، انسان کے کفر کا اظہار بھی زبان سے ہوتا ہے اور اس کے ایمان کی گواہی بھی زبان ہی دیتی ہے۔ گوشت کے اس ٹکڑے میں باری تعالیٰ نے متضاد تاثیرات رکھ دی ہیں، یہ آگ لگا بھی سکتا ہے اور بجھا بھی سکتا ہے، محبت و الفت کے چشمے بھی رواں کر سکتا ہے اور نفرت وعداوت کی دیواریں بھی کھڑی کر سکتا ہے، دلوں کو جوڑ بھی سکتا ہے اور انہیں توڑ بھی سکتا ہے۔ اکثر لوگ زبان کی آفات اور مصائب کے بارے میں سہل پسندی سے کام لیتے ہیں اور اس کی تباہ کاریوں سے بچنے کا اہتمام نہیں کرتے، حالانکہ انسان کو دینی اور دنیاوی نقصان پہنچانے اور اسے راہِ راست سے ہٹانے میں زبان، شیطان کو مؤثر ہتھیار ہے۔

جو شخص زبان کو آزاد چھوڑ دیتا ہے اور جو کچھ منہ میں آئے بولتا چلا جاتا ہے تو اسے زبان سے بوئے گئے کانٹے اپنے ہاتھوں سے چننے پڑتے ہیں۔ بے شمار لوگ زبان کے غلط استعمال ہی کی وجہ سے دوزخ میں منہ کے بل گرائے جائیں گے، زبان کے شر سے صرف وہی بچ سکتا ہے جو اسے شریعت کی لگام ڈالے اور اسے ایسی جگہ استعمال کرے جس کا دنیا اور آخرت میں فائدہ ہو۔ زبان کے شر سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ خاموشی اختیار کی جائے یا پھر کم سے کم کلام کیا جائے۔

اہلِ علم نے کلام کی چند شرطیں بیان کی ہیں جن کا لحاظ رکھنے سے زبان کے خطرات اور لغزشوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے:

۱- کلام کسی ضرورت کی بناء ہو یا حصولِ نفع کی توقع ہو یا مضرت سے بچنے کی امید ہو، جو

شخص ضرورت کے بغیر ہی بولتا چلا جاتا ہے اس کی گفتگو ہذیان اور بکواس کے زمرے میں آتی ہے۔

۲- موقع محل کی مناسبت سے کلام کیا جائے، جس کلام کی موقع محل سے مناسبت نہ ہو وہ بے فائدہ اور لایعنی ہوتا ہے۔

۳- ضرورت کی حد تک کلام کیا جائے، اگر کلام کو ضرورت تک محدود نہ رکھا جائے تو اس کی حد کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

۴- اظہار مافی الضمیر کے لئے مناسب الفاظ کا انتخاب کیا جائے اس لئے کہ زبان، انسان کا عنوان ہے جو اس کے مجہول اور پوشیدہ کی ترجمانی کرتا ہے۔ لہٰذا اس عنوان کے لئے الفاظ کی تہذیب ضروری ہے۔

کلام کے کچھ آداب بھی ہیں جن کا لحاظ نہ رکھنے سے کلام کی رونق اور بیان کی شان ختم ہوجاتی ہے، یہ آداب درج ذیل ہیں:

(۱) کسی کی مدح اور مذمت میں تجاوز نہ کیا جائے۔ یہ تجاوز ذلت کی بناء پر ہوتا ہے یا جذبۂ انتقام کی خاطر اور یہ دونوں ان عیوب میں سے ہیں جن سے بچنا ضروری ہے۔

(۲) ایسا وعدہ بھی نہ کیا جائے جسے پورا کرنا ممکن نہ ہو اور ایسی وعید بھی نہ سنائی جائے جس پر انسان قادر نہ ہو، ایسا کرنے سے انسان کی بات کا اعتماد اٹھ جاتا ہے۔

(۳) جو کچھ کہا جائے اس کے مطابق عمل بھی کیا جائے۔

(۴) حسب موقع اپنے اسلوبِ گفتگو میں نرمی اور سختی پیدا کی جائے، تربیت کے موقع پر نرم الفاظ اور ترغیب کے موقع پر سخت الفاظ مقصد کو فوت کر دیتے ہیں۔

(۵) چیخ چیخ کر بولنا انسان کے وقار کو گرا دیتا ہے۔

(۶) فحش گفتگو سے حتی الامکان احتراز کیا جائے۔

(۷) ضرب الامثال پیش کرنے کی ضرورت پیش آئے تو اہلِ علم وادب کی ضرب الامثال بیان کی جائیں جاہلوں کے قصوں اور تنگ بندیوں سے زبان کو بچایا جائے۔

(ادب الدنيا والدين : ٢٦٦، ٢٦٧)

جس شخص کے لئے ان شرائط وآداب کا لحاظ رکھنا ممکن نہ ہو اس کے لئے خاموشی ہی بہتر ہے، اسی لئے شریعت نے خاموشی کی تعریف کی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''جس نے خاموشی اختیار کی وہ نجات پا گیا۔'' (ترمذي : ٢٥٠٣)

بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے اچھی بات کہنی چاہیے ورنہ خاموش رہنا چاہیے۔'' (بخاري : ٦٠١٨، مسلم : ٤٨)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو زبان کی حفاظت کی خاص طور پر تاکید کیا کرتے تھے۔ حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھے کوئی ایسی نصیحت فرمایئے جس پر میں ہمیشہ عمل کرتا رہوں آپ نے زبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''اس کی حفاظت کرو۔''

(الترغيب والترهيب : ٥٢٧/٣)

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بعض اوقات صفا پر چڑھ جاتے اور اپنی زبان کو پکڑ کر کہتے اے زبان! اچھی بات کہو فائدہ میں رہو گی، بری بات سے خاموشی اختیار کر، ندامت سے بچ جاؤ گی، پھر فرماتے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''انسان سے اکثر گناہ زبان کی وجہ سے صادر ہوتے ہیں۔'' (الترغيب والترهيب : ٥٢٧/٣)

کتنے ہی لوگ ہیں جن کی زبان درازی سے کوئی شریف انسان محفوظ نہیں رہتا، کسی کا مذاق اڑا دیتے ہیں، کسی کو سرِ عام ذلیل کر کے رکھ دیتے ہیں، کسی کا دل توڑ دیتے ہیں، کسی پر

جھوٹا الزام لگا دیتے ہیں، غیبت اور چغلی کو تو گناہ ہی نہیں سمجھا جاتا جبکہ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بہترین مسلمان اسے قرار دیتے ہیں جس کی زبان کے شر سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، یہ افضیلت اسی وقت حاصل ہوگی جب خاموشی اختیار کی جائے گی اور اناپ شناپ سے اپنے آپ کو بچایا جائے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ ہمیں کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جس کی وجہ سے ہم جنت میں داخل ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا خاموش رہا کرو اور کبھی بات نہ کیا کرو، انہوں نے کہا یہ تو ہمارے بس میں نہیں، آپ نے فرمایا ''صرف خیر کے لئے زبان کھولا کرو''۔

(الاحیاء: ۳/۱۲۰)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو کلام سے روکنے کے لئے منہ میں کنکریاں رکھ لیا کرتے تھے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جو شخص زیادہ بولے گا اس سے غلطیاں بھی زیادہ سرزد ہوں گی۔'' (الصمت لابن ابی الدنیا: ۲٤۱)

مختصر یہ کہ خاموشی میں دین اور آبرو کی حفاظت، خطرات سے امن اور عافیت، مال اور جان سے سلامتی ہے، خاموشی حسنِ خلق اور نفس کی پاکیزگی کی علامت ہے، خاموشی سے انسان اللہ کا محبوب بن جاتا ہے۔ انسان بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔

تدبر

اللہ تعالیٰ سورۂ ق میں فرماتے ہیں: ''ان سے پہلے ہم بہت سی امتوں کو ہلاک کر چکے ہیں جو ان سے زیادہ طاقتور اور مضبوط تھیں۔ (جب اللہ کا عذاب آیا تو) وہ شہروں میں ڈھونڈتے رہ گئے کہ ہے کوئی بھاگنے کی جگہ؟ اس میں عبرت ہے ہر صاحب دل کے لئے اور اس کے لئے جو خلوص دل سے متوجہ ہو کر بات کو سنے۔'' (سورۃ ق: ۳۶۔۳۸)

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ وہ لوگ جن کے دل مردہ اور ان کے اندر غور و فکر کی صلاحیت ہی نہیں ان کے سینے میں حقیقت میں دل ہی نہیں ہے اور نہ ہی انہیں قرآن سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔

۲۔ وہ جن کا دل زندہ اور مستعد ہے اور وہ صاحب صلاحیت ہیں لیکن وہ آیات الٰہیہ کو توجہ سے نہیں سنتے یا تو اس لئے کہ وہ ایسی جگہ آتے ہی نہیں جہاں قرآن پڑھا جاتا ہے یا اس لئے کہ ان کا دل قرآن کے علاوہ کسی اور طرف متوجہ ہوتا ہے تو ایسے لوگوں کو صلاحیت کے باوجود قرآن سے نصیحت حاصل نہیں ہوتی۔

۳۔ جن کے دل زندہ ہیں اور ان کے اندر صلاحیت بھی ہے ان کے سامنے جب قرآن کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ انہیں توجہ سے سنتے ہیں اور ان کے دل کسی دوسری طرف قطعاً متوجہ نہیں ہوتے یہی وہ لوگ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت کریمہ میں تذکرہ فرمایا ہے اور جنہیں تلاوت آیات سے واقعی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

پہلی قسم کے لوگوں کی مثال اس اندھے جیسی ہے جو دیکھ ہی نہیں سکتا۔

دوسری قسم کے لوگوں کی مثال اس شخص جیسی ہے جو بینائی رکھتا ہے مگر اس جانب نہیں

دیکھتا جہاں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

تیسری قسم کے لوگ اس بینا کی طرح ہیں جو قریب اور دور سے اپنی نظر وہیں رکھتے ہیں جہاں اسے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے (ایسے ہی لوگوں کی قلبی بیماریوں کے لئے قرآن شفا بنتا ہے) پس پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے کلام کو قلبی بیماریوں کے لئے شفا بنایا ہے۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ایسا قلب بیدار عطا کیا ہے جو عبرتوں اور نصیحتوں کے سمجھنے پر قادر ہے اور وہ اپنے دل کو اسی مقصد کے لئے استعمال بھی کرتے ہیں۔ ایسے لوگ جب قرآنی آیات سنتے ہیں تو نورٌ علیٰ نور حاصل ہو جاتا ہے۔ یہی ہیں جو اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ کامل اور ایمان اور بصیرت کے اعتبار سے سب سے عظیم ہیں، یہاں تک کہ جب اللہ کا رسول انہیں بعض امور کی اطلاع دیتا ہے تو انہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم ان کا مشاہدہ کر چکے ہیں لیکن ہمیں ان کی تفصیلات اور انواع کا پتہ نہ تھا۔ گویا جو کچھ کہا جاتا ہے وہ ان کے دل میں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔

بعض حضرات نے نبی اور صدیق کی مثال یہ بیان کی ہے کہ ان کا حال ایسے ہے جیسے دو شخص کسی کے گھر میں داخل ہوئے ان میں سے ایک نے تو اس گھر کی ساری چیزیں پوری تفصیل اور جزئیات کے ساتھ دیکھیں لیکن دوسرے نے بس سرسری نظر گھر پر ڈالی تفصیل کے ساتھ اسے گھر کے معاینہ کا موقع نہیں ملا لیکن اتنا یقین اسے بھی ہو گیا کہ اس گھر میں عظیم الشان چیزیں ہیں اس کے بعد وہ دونوں وہاں سے نکل آئے پھر جب اس دوسرے نے پہلے سے سوال کیا کہ تم نے وہاں کیا کچھ دیکھا اور اس نے تفصیل سے بتانا شروع کیا تو اس نے اپنے اس سرسری مشاہدہ کی بنا پر اس کی ہر بات کی تصدیق کی اور یہ صدیقیت کے درجات میں سے اعلیٰ ترین درجہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ کوئی بعید بات نہیں کہ وہ اپنے بندوں میں سے کسی کو ایمان کا یہ مقام عطا فرما دے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم

کی نہ کوئی حد ہے اور نہ ہی وہ کسی حساب کتاب کا پابند ہے۔

جسے اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے نور بصیرت سے منور دل عطا کیا ہو وہ جب تلاوت کرتا ہے تو اس کے نور میں مزید نور کا اضافہ ہو جاتا ہے اور اگر کسی کو ایسا نورانی دل تو نہ ملا ہو لیکن وہ حضور دل کے ساتھ توجہ سے سنے تو وہ بھی یکسر محروم نہیں رہتا اور اسے بھی عبرت و نصیحت ضرور حاصل ہو جاتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں بلند ٹیلے پر واقع زرخیز زمین کے بارے میں فرمایا ہے کہ اگر اس پر زوردار بارش برسے تو اس میں دگنا پھل پیدا ہوتا ہے ''اور اگر بارش نہ بھی برسے تو پھوار ہی کافی ہو جاتی ہے۔'' (سورة البقرة : ٢٦٥)

یہ زوردار بارش اور ہلکی پھوار والا معاملہ تمام اعمال اور ان کے موجبات و آثار میں پایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ خود اہل جنت کے درجات میں بہت زیادہ تفاوت ہوگا کچھ سابقون ہوں گے کچھ مقربون اور کچھ اصحاب یمین ہوں گے۔ (مدارج السالکین) اہل جنت میں یہ فرق اس لئے ہوگا کہ ایمانی کیفیات، دلوں کی نیتوں میں اور اعمال و اخلاق میں بہت فرق ہوتا ہے۔ (مدراج السالكين : ١/٤٧٥-٤٧٧)

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے جن لوگوں کا تذکرہ فرمایا ہے وہ تو یقیناً ایمان اور بصیرت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتے ہیں اور ہر کسی کو یہ مقام نصیب نہیں ہو سکتا لیکن بہر صورت ہر مسلمان پر یہ لازم ہے کہ وہ قرآن کریم کی تلاوت اور سماع عظمت و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے فہم و تدبر کے ساتھ کرے ایسا شخص ان شاء اللہ محروم نہیں رہے گا اور اسے اپنی حیثیت اور ظرف کے مطابق حصہ مل کر رہے گا۔

تدبر قرآن ایسی چیز ہے جس کی اہمیت باری تعالیٰ نے خود قرآن کریم میں بیان فرمائی ہے:

سورۂ نساء میں ہے: ''کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔'' (سورة النساء : ٨٢)

سورۃ المؤمنون میں ہے: ''کیا یہ اس کلام میں تدبر نہیں کرتے یا ان کے پاس ایسی چیز آگئی ہے جو ان کے پہلے باپ دادا کے پاس نہیں آئی تھی؟'' (سورة المؤمنون : ٦٨)

سورۂ ص میں ہے: ''یہ بابرکت کتاب ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ یہ اس کی آیات میں غور وفکر کریں اور تاکہ اہل عقل نصیحت حاصل کریں۔'' (سورة ص : ٢٩)

سورۂ محمد میں ہے: ''کیا یہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔'' (سورة محمد : ٢٤)

وہ ذاتِ اقدس جس پر یہ بابرکت کلام نازل ہوا ان کا حال یہ تھا کہ وہ قرآن کریم کی تلاوت خوب تدبر کے ساتھ فرماتے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ آپ تسبیح والی آیت پڑھتے تو تسبیح فرماتے سوال والی آیت زبان پر آتی تو اللہ سے مانگنے لگتے، تعوذ والی آیات کی تلاوت فرماتے تو اللہ سے پناہ مانگتے اور اللہ کی پکڑ والی آیات پڑھتے تو آپ کے جسم اطہر پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ تدبر کے ساتھ تلاوت اور سماع کا نتیجہ یہ بھی تھا کہ قرآن پڑھتے اور سنتے ہوئے آپ کی اپنی آنکھوں پر قابو نہیں رہتا تھا اور وہ چھلک پڑتی تھیں۔

معانی پر نظر رکھ کر تلاوت کرنے سے آخرت کے مناظر ہمیشہ آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں۔ دنیا نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہ دنیا میں رہتا ہی نہیں اس کے لئے حق اور باطل میں امتیاز بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اسے ایسا نور بصیرت عطا کر دیا جاتا ہے جس کے ذریعے وہ ہدایت اور ضلالت کے درمیان فرق کر سکتا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی توحید وصفات، انبیاء کی نبوت ورسالت، فرشتوں اور آخرت پر ایمان، امر ونہی اور حلال وحرام کی تفصیلات اور مختلف بصائر وعبر، قصص اور مواعظ اور امثال و اسباب کا بیان ہے۔

جب بندہ بار بار ان مضامین کا مطالعہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے وعدوں کی جانب

اس کی رغبت شدید ہو جاتی ہے اور اہل بدعت وضلالت سے اسے نفرت ہو جاتی ہے۔ راہ حق کی مشکلات اس کے لئے آسان ہو جاتی ہیں اور اسے ہدایت پر چلنے کی توفیق میں ارزانی ہو جاتی ہے، جب اس کے عزائم ڈھیلے پڑنے لگیں تو قرآنی آیات اسے پکار پکار کر کہتی ہیں ارے حق والوں کا قافلہ جا رہا ہے تم بھی جلدی کرو اور ان کے ساتھ جا ملو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پیچھے رہ جاؤ اور جب کوئی منزل کھوٹی کرنے والا دشمن اور راہ حق سے ہٹانے والا ڈاکو سامنے آتا ہے تو اسے قرآن کی آواز سنائی دیتی ہے ارے میاں بچ جاؤ اور صرف اللہ پر اعتماد رکھو اسی سے مدد مانگو اور کہہ دو کہ اللہ ہی کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔

یہ سارے فوائد عظمت اور احترام کے ساتھ قرآن کریم میں فہم وتدبر کرنے سے حاصل ہوتے ہیں، کتنے بدنصیب ہیں وہ جو قرآن کریم میں غور وفکر سے اور پھر ان فوائد اور نتائج سے محروم ہیں۔

علیہ وسلم کو دیکھا تو میرے دل میں اسلام کا چراغ روشن ہو گیا۔"

☆ محبت کا تیسرا سبب احسان ہے، انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے محسن سے محبت کرتا ہے، عربی کا محاورہ ہے " الانسان عبد الاحسان " (انسان احسان کا غلام ہوتا ہے) اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ہم پر رب کائنات کے بعد سب سے زیادہ احسانات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں، آپ ہی تو ہیں جنہوں نے ہمیں خدا سے ملایا، توحید کا سبق پڑھایا، علم و معرفت کے دریا بہائے، بیواؤں کو سہارا دیا، یتیموں کے سر پر دستِ شفقت رکھا، حیوانوں کو انسان بنایا، عورتوں کو حقوق دیئے، انسانوں میں ذات پات کے تفاوت کو ختم کیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تو تھے جو انسانیت کے لئے غمزدہ اور دعاء گو رہتے تھے، آپ سے محبت کرنے والا حقیقت میں انسانیت سے اور اخلاقِ حسنہ کے عظیم ترین پیکر سے محبت کرتا ہے، یہ بات عام انسانوں کے حوالے سے کی جارہی ہے ورنہ خود مسلمان کا حال یہ ہے کہ محبت نبوی اس کے ایمان کا حصہ ہے، اس کے ایمان کا اعتبار ہو ہی نہیں سکتا اگر اس کے دل میں سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نہ ہو۔

مسلمانوں کے دل میں حضور کی جو محبت ہے اس کا اندازہ دشمنانِ اسلام کو بھی ہے اور وہ مختلف حربوں کے ذریعے مسلمان کے دل سے اس محبت کو کھرچنے کی کوشش کر رہے ہیں، توہینِ رسالت کے حالیہ واقعہ کو بھی اسی پسِ منظر میں دیکھنا چاہیئے، اس موقع پر محبتِ مصطفوی کا تقاضا یہ ہے کہ اتباع واطاعت کا حق ادا کر کے ہم دشمنوں کی مذموم کوششوں کو ناکام بنا دیں، آپ کے لائے ہوئے دین کی اشاعت کے لئے اپنی ساری توانائیاں لگا دیں، آپ کی توہین جیسے ناقابلِ معافی جرم کا ارتکاب کرنے والے ممالک کی مصنوعات کا بائیکاٹ شروع کر دیں، اس سلسلہ میں ہمیں حکومت یا او آئی سی کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے دائرہ میں بائیکاٹ کا آغاز کر دینا چاہیئے۔

پانچ اعلیٰ اوصاف

سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۳۳ میں ایمان والوں کو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف دوڑ لگانے کا حکم دیا گیا ہے جس کا پھیلاؤ آسمان وزمین کے برابر ہے اور وہ ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جن کے اندر پانچ اوصاف پائے جاتے ہیں، آیت ۱۳۴ اور ۱۳۵ میں یہ پانچوں اوصاف مذکور ہیں جو کہ درجِ ذیل ہیں:

۱- وہ خوش حالی اور تنگی دونوں حالتوں میں خرچ کرتے ہیں۔

نہ وہ غربت میں ''انفاق فی سبیل اللہ'' سے ہاتھ کھینچتے ہیں اور نہ ہی امارت کی دھن میں کسی کو فراموش کرتے ہیں، بلکہ صحت اور بیماری، غربت اور خوشحالی ہر حال میں اپنی مالی حیثیت کے مطابق اللہ کی راہ میں خرچ کیے جاتے ہیں، امیر اپنی بساط اور غریب اپنی بساط کے مطابق خرچ کرتا ہے۔

۲- وہ غصہ دبا لیتے ہیں۔

یہ نہیں فرمایا کہ انہیں غصہ آتا ہی نہیں بلکہ یہ فرمایا کہ غصہ آتا تو ہے مگر وہ اسے دبا لیتے ہیں، قرآن پاک نے جذبات کو فنا کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ انہیں شریعت کی حدود میں لانے اور ان کا رخ موڑنے کا حکم دیا ہے، اللہ کا حکم ٹوٹنے اور شریعت کی بے قدری پر اگر غصہ آجائے تو یہ مذموم تو کیا ہوگا، الٹا محمود ہے، خلافِ طبع معاملہ پیش آنے پر اگر غصہ آجائے تو اسے ضبط کرنے سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ''جو شخص نفاذ اور انتقام کی قدرت کے باوجود اپنے غصہ کو دبا لے، اللہ تعالیٰ اس کے سینے کو امن اور ایمان سے بھر دیتا ہے'' ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پہلوان وہ نہیں جو کشتی میں دوسرے کو پچھاڑ دیتا ہے، پہلوان وہ ہے جو غصے میں اپنے

او پر قابو رکھتا ہے۔" (مسلم : ٢٦٠٩)

۳- لوگوں کی غلطیاں معاف کر دیتے ہیں۔

غصے کو ضبط کرنے سے بھی اعلیٰ وصف، لوگوں کی خطاؤں کو معاف کرنا ہے، وہ محض ایک سلبی کیفیت تھی اور یہ ایک ایجابی مرتبہ ہے۔ بسا اوقات غصہ دبانے کے باوجود دل میں کدورت باقی رہ جاتی ہے لیکن جو صحیح معاف کرنے والا ہوتا ہے، اس کا دل بغض و کینہ اور رنجش سے بھی صاف ہو جاتا ہے، جو شخص دل سے کسی کی زیادتی معاف کر دیتا ہے اس کا بدلہ جنت کے سوا کچھ نہیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے "قیامت کے دن منادی اعلان کرے گا، کہاں ہیں لوگوں کو معاف کرنے والے؟ آؤ اپنے رب کے حضور اور اپنے اجر لے لو، جو مسلمان کسی کو معاف کر دے، اس کا حق ہے کہ وہ جنت میں داخل ہو۔"

۴- اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

غضب کے دبانے اور خطاؤں سے درگذر کرنے سے بھی اعلیٰ مرتبہ دشمنوں کے ساتھ احسان کرنے کا ہے، برائی کے بدلے اچھائی، گالیوں کے جواب میں دعائیں اور پتھروں کے مقابلے میں پھول پیش کرنا ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم اور آقا کے سچے غلاموں کا شیوہ ہے، مکہ سے طائف تک اور احد سے فتح مکہ تک کی سیرت عفو و احسان کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑنواسے حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ کے ایک واقعہ کا ذکر کرنا نصیحت اور دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا، انہیں ایک لونڈی وضو کرا رہی تھی، اس کے ہاتھ سے لوٹا گرا جس سے آپ زخمی ہو گئے، آپ نے غصے میں سر اٹھایا وہ بھی مزاج شناس تھی اس نے پڑھا: " والکاظمین الغیظ " (ایمان والے غصہ دبا لیتے ہیں) آپ نے فرمایا میں نے غصہ دبا لیا، آگے پڑھا " والعافین عن الناس " (لوگوں کو معاف

کردیتے ہیں) آپ نے فرمایا میں نے معاف کردیا، اس نے اگلا جملہ پڑھا: " واللہ یحب المحسنین " (اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے) آپ نے فرمایا: جاؤ میں نے تمہیں اللہ کی رضا کے لیے آزاد کردیا۔

۵- اہلِ جنت کی پانچویں صفت اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ ''اگر ان سے کوئی بے حیائی (فاحشہ) کا کام ہوجائے یا وہ اپنے حق میں ظلم کر بیٹھیں تو وہ اللہ کو یاد کر کے فوراً اس سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرنے لگتے ہیں...... اللہ کے سوا ہے بھی کون جو گناہوں کو معاف کردے...... اور یہ لوگ اپنے کیے پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے'' اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے دو قسم کے گناہ ذکر فرمائے ہیں ''فاحشہ'' اور ''اپنے اوپر ظلم''۔ ''فاحشہ'' وہ گناہ ہیں جن کا ضرر دوسروں تک پہنچتا ہے مثلاً زنا، سود، چوری، غیبت، خیانت وغیرہ اور ''اپنے اوپر ظلم'' کا مطلب ایسے گناہ ہیں جن کا اثر گناہ گار کی ذات تک محدود رہے مثلاً شراب نوشی، ترکِ صلوٰۃ وغیرہ۔

گناہ کا ہوجانا کوئی انہونی بات نہیں، بتقاضائے بشریت متقیوں اور نیکوکاروں سے بھی گناہ ہوجاتا ہے لیکن جب وہ اللہ کی عظمت وجلال اور کرم اور احسان کو یاد کرتے ہیں تو فوراً استغفار کر لیتے ہیں۔

قبولِ توبہ کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ گناہ پر اصرار نہ کیا جائے، جو شخص گناہ ہوجانے پر استغفار کر لے وہ اصرار کرنے والا شمار نہیں ہوتا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص استغفار کرے وہ اصرار کرنے والا نہیں اگرچہ اس سے دن میں ستر بار گناہ ہوجائے۔''

مصنوعی اور حقیقی زندگی

سورۂ نحل کی آیت ۹۷ کا مفہوم ہے: ''جو شخص نیک عمل کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہو تو ہم اس کو دنیا میں پاکیزہ اور اکرام والی زندگی عطا کریں گے اور آخرت میں اس کے اعمال کا نہایت اچھا صلہ دیں گے۔''

آیئے! آج اس آیتِ کریمہ کی روشنی میں ہم بات کو آگے بڑھاتے ہیں:

زندگی کے کئی انداز، ڈھنگ اور طرز ہو سکتے ہیں مثلاً شاہانہ زندگی، فقیرانہ زندگی پھر مشرقی اور مغربی زندگی، دیہاتی اور شہری زندگی لیکن حقیقت میں زندگی کی صرف دو قسمیں ہیں، نفس پرستی والی زندگی اور خدا پرستی والی زندگی، ناچیز کی نظر میں ان میں سے پہلی قسم مصنوعی اور دوسری قسم حقیقی زندگی ہے۔

حضرت علی میاں صاحب رحمہ اللہ نفس پرستی کو مستقل مذہب قرار دیتے ہیں جس کے ماننے والے دنیا میں سب سے زیادہ ہیں، حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھا جائے تو ساری مصیبتوں، پریشانیوں اور بے سکونی کی جڑ نفس پرستی ہے، جب گھر، خاندان، جماعت اور دفتر میں کام کرنے والا ہر فرد نفس پرست ہوگا تو سچی محبت اور سکون کہاں ہوگا؟

نفس پرست کے پاس سب کچھ ہوتا ہے مگر وہ پھر بھی سکون سے محروم رہتا ہے۔

مسلمانوں کے حملہ آور ہونے سے پہلے شاہِ ایران کے حرم میں بارہ ہزار تو صرف بیویاں تھیں، دیگر ساز و سامان اور جاہ و حشم کا اندازہ اسی ''ریوڑ'' سے لگایا جا سکتا ہے، یقیناً ان بارہ ہزار میں سے بے شمار ایسی ہوں گی جنہیں اپنے ''سرتاج'' کے ساتھ ایک بار بھی شب باشی کا موقع حاصل نہیں ہوا ہوگا، جب اس عیاش بادشاہ کو تاج و تخت چھوڑ کر بھاگنا پڑا تو اس کے ساتھ ایک ہزار باورچی، ایک ہزار گویّے، ایک ہزار باز اور شکروں کے محافظ بھی تھے لیکن

اس کے باوجود وہ اپنے بے سروسامان ہونے پر بے حد پریشان تھا۔

ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں تشریف لائے پوری دنیا مصنوعی اور نفس پرستی والی زندگی گزار رہی تھی۔ آپ نے انسانوں کو سمجھایا کہ لطف اور سکون چاہتے ہو تو تصنع سے پاک حقیقی زندگی گزارو۔ آپ نے صرف دوسروں کو باتوں سے نہیں سمجھایا بلکہ خود ایمانی عملی اور حقیقی زندگی گزار کر دکھائی، جو سامنے آتا کھا لیتے، جو ملتا پہن لیتے، بھوک کی حالت میں باسی روٹی اور ردی کھجوریں سمیت جو کچھ میسر آتا تناول فرمالیتے، سالن کا بھی اہتمام نہ تھا مل گیا تو الحمدللہ ورنہ کھجور، گھی اور زیتون کے ساتھ کھالیتے۔ کھجور کی چٹائی پر آرام فرماتے، صحابہ نے عرض کیا کہ کسی نرم اور آرام دہ بستر کا انتظام کردیا جائے، آپ نے جواب میں فرمایا "مجھے دنیا سے کیا غرض، میری مثال اس مسافر کی سی ہے جو دوپہر کو ستانے کے لیے کسی درخت کے نیچے رک جائے۔"

یہ دعویٰ ہرگز مبالغہ پر مبنی نہیں کہ آپ کے صحابہ سے زیادہ جاں نثار اور وفادار نہ کسی لیڈر کو کارکن ملے نہ کسی استاد کو شاگرد ملے، وہ ہمہ وقت خدمت کے لئے مستعد اور اشارۂ ابرو کے منتظر رہتے تھے، لیکن اس کے باوجود آپ اپنے ہاتھ سے کام کرنے میں ہرگز عار محسوس نہیں فرماتے تھے۔ مسجد قبا اور مسجد نبوی کی تعمیر کا مرحلہ ہو یا خندق کی کھدائی، آپ ہر موقع پر پیش پیش ہوتے تھے بلکہ ایسا بھی ہوتا کہ مشکل کام آپ اپنے ذمہ لے لیتے، غزوہ احزاب میں سخت چٹانیں آپ ہی نے توڑیں۔

ایک سفر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے گوشت پکانے کا ارادہ کیا ایک صاحب نے جانور کا ذبح کرنا، دوسرے نے کھال اتارنا اور تیسرے نے پکانا اپنے ذمہ لے لیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کرنا اپنے اوپر لے لیا، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم کس لیے ہیں فرمایا مجھے دوسروں سے ممتاز ہونا پسند نہیں۔

آپ کے حرم میں نو بیویاں تھیں مگر اس کے باوجود گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹایا کرتے تھے، کپڑوں کی پیوند لگا لیتے، گھر میں جھاڑو دے لیتے، سودا سلف لے آتے، ڈول درست کر لیتے، جوتا سی لیتے، غلام کے ساتھ مل کر آٹا گوندھ لیتے، بیمار جانوروں کا علاج فرماتے، مہمانوں کی خدمت فرماتے یہ سب کچھ کرنے کے ساتھ بیواؤں کے کام بھی کرتے، یتیموں کی خبر گیری فرماتے، اپنے آقا کے بالکل برعکس آج ہم میں سے اکثر لوگ مصنوعی زندگی گزار رہے ہیں، قدم قدم پر نفس پرستی، نمود و نمائش، سہل پسندی، راحت طلبی، بڑا بننے کی چاہت اور کام چوری کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ آپ صرف شادی ہی کو لے لیجیے، شریعت نے اسے کس قدر سہل رکھا تھا لیکن ہم نے منگنی، مہندی، بارات اور جہیز کے ردّے چڑھا کر اسے ایسا مشکل اور مہنگا ترین عمل بنا لیا کہ لاکھوں، بہنیں اور بیٹیاں ہاتھ پیلے کیے بغیر بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکی ہیں۔

فیشن پرستی کیا ہے؟ سراسر مصنوعی زندگی! کہیں تنگ لباس، کہیں کشادہ لباس، کہیں لباس کے نام پر چند چیتھڑے، کہیں خوفناک انداز میں بڑھے ہوئے ناخن کہیں مرد، خواتین کے لباس میں اور خواتین، مردوں کے لباس میں...... بعض اوقات تو یوں لگتا ہے کہ ہماری محبت، ہماری چاہت اور ہماری مسکراہٹ سمیت ہر چیز مصنوعی ہے، پورے معاشرے پر فنکاروں اور اداکاروں کا قبضہ ہے، ہر طرف ڈرامے ہو رہے ہیں، لوگوں نے اپنے چہرے پر کئی کئی چہرے سجا رکھے ہیں، موقع محل کے اعتبار سے نیا چہرہ سجا لیتے ہیں۔

سچی خوشی اور حقیقی سکون صرف اسی کو حاصل ہوگا جو سادہ، حقیقی اور خدا پرستی والی زندگی بسر کرے گا ایسے شخص کو دنیا میں پاکیزہ زندگی عطا کی جائے گی اور وہ آخرت میں کامیاب و کامران ہوگا۔

مقدس وراثت کی حفاظت

ایک تاریخ یہود ونصاریٰ کی ہے اور دوسری تاریخ مسلمانوں کی، اول الذکر کی تاریخ خاص طور پر انبیاء کرام علیہم السلام کی تکذیب، تفحیک، استہزاء، قتل اور ایذاء پر مشتمل ہے۔

یہودیوں نے صاحبِ عزیمت پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دکھ دینے کے لیے کبھی تو یوں کہا ''ہم تیری باتوں پر اس وقت تک یقین نہیں کریں گے جب تک کہ علانیہ اللہ کو نہ دیکھ لیں۔'' (سورة البقرة : ٥٥)

صحراء میں ترنجبین اور بٹیر جیسا لذیذ کھانا ملنے پر کہا ''ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کرسکتے۔'' (سورة البقرة : ٦١)

بحرِ قلزم عبور کرنے کے بعد انہوں نے ایک بستی والوں کو بت پرستی میں مشغول دیکھا تو کہنے لگے ''اے موسیٰ! جیسے ان کے معبود ہیں ایسا ہمارے لیے بھی کوئی معبود بنا دے۔''

(سورة الأعراف : ١٣٨)

سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اللہ تعالیٰ کی نصرت کا یقین دلاتے ہوئے ارضِ مقدس میں داخل ہونے کے لیے کہا تو انہوں نے جواب دیا ''جاؤ تم اور تمہارا رب جا کر لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔'' (سورة المائدة : ٢٤)

جناب کلیم اللہ کا انتقال اس حال میں ہوا کہ آپ کی قوم وادیِ تیہ میں اپنی نافرمانیوں اور حکم عدولیوں کی سزا بھگت رہی تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جب مشکل وقت آیا اور یہودیوں کے پیہم اصرار اور دباؤ پر رومی عدالت میں ان کے خلاف مقدمۂ بغاوت چلایا گیا تو ان کے صحابیوں اور حواریوں میں سے بعض ان کا ساتھ چھوڑ گئے، بائبل کے مطابق انہیں انتہائی بے بسی اور کسمپرسی کی

حالت میں مصلوب ہونا پڑا جبکہ قرآن کہتا ہے کہ انہیں آسمانوں پر اٹھالیا گیا۔

یہود ونصاریٰ کے برعکس مسلمانوں کی تاریخ تمام انبیاء کے بارے میں عموماً اور اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں خصوصاً مہر ووفا، ادب واحترام، تعظیم وتصدیق اور ایثار و فداکاری پر مشتمل ہے، جس قوم کو وراثت میں جو کچھ ملا ہے اس کا طرزِ عمل اس کے مطابق ہے، اللہ تعالیٰ کے منتخب بندوں کے حوالے سے پہلی دو قوموں کی فلمیں، تصویریں، خاکے، تبصرے اور تنقیدیں ان کے تاریخی ورثہ کی عکاس ہیں جبکہ مسلمانوں کا سکوت، محبت اور مودّت اور بے ادبی کے ہر پہلو سے احتراز اسلامی روایات کے عین مطابق ہے۔ علمی، عملی، معاشرتی، عسکری اور اخلاقی زوال کے باوجود امتِ مسلمہ انبیاء ورسل کے ادب واحترام کے بارے میں اپنے مقدس ورثہ کو سینہ سے لگائے ہوئے ہے، خصوصاً سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب اور مقام کے حوالے سے وہ کسی بھی قسم کی مصالحت یا کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر معاہدہ کرنے کے لیے تیار نہیں۔

حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے ساتھ ان کے اصحاب اور حواریوں کا سلوک تو آپ پڑھ ہی چکے اب چند ایمان افروز واقعات صحابہ کرام کے ادب، محبت، جاں نثاری اور وفا کے بھی سن لیجیے:

☆ غزوۂ احد میں ایک خاتون کا بیٹا، بھائی اور شوہر تینوں شہید ہو گئے، وہ مدینہ سے باہر نکل کر لشکرِ اسلام کے انتظار میں کھڑی تھی، اسے باری باری تینوں کی شہادت کی اطلاع دی گئی مگر وہ بار بار سوال کرتی تھی کہ میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ جب اسے بتایا گیا کہ آپ خیریت سے ہیں تو اس نے ایک ایمانی جذبہ اور حوصلہ سے کہا ''یا رسول اللہ! آپ کی موجودگی میں ہر حادثہ اور مصیبت ہیچ ہے۔''

☆ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تو اسلام قبول کرنے والے اولین سعادت مندوں

میں سے ہیں مگر ان کے والد نے ابتداء اسلام قبول نہ کیا، بعض اوقات ان کی زبان سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ناشائستہ الفاظ نکل جاتے، ایک دن انہوں نے ایسے گستاخانہ کلمات کہے جو ناقابلِ برداشت تھے، حضرت صدیق اکبر نے طمانچہ مار دیا، حضور کو اطلاع ملی تو آپ نے اظہارِ افسوس فرمایا، شمعِ رسالت کے پروانے نے عرض کیا ''یارسول اللہ اگر تلوار ہوتی تو گردن اڑا دیتا'' اس پر سورۂ مجادلہ کی آیت ۲۲ نازل ہوئی جس میں بتایا گیا کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اہلِ ایمان ان لوگوں سے محبت کریں جو اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہیں خواہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا خاندان ہی کے لوگ کیوں نہ ہوں۔

☆ حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ جنگ احد میں شدید زخمی ہو کر سات مقتولین کے درمیان پڑے تھے، ایک صحابی ان کا حال معلوم کرنے کے لیے آئے انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام بھیجنے کے ساتھ مسلمانوں کو پیام بھیجا ''اگر تمہاری موجودگی میں کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو اللہ کے ہاں تمہارا کوئی بھی عذر قبول نہیں ہوگا۔''

☆ ادب کا یہ عالم تھا کہ طہارت کے بغیر آپ کی خدمت میں حاضر ہونا اور آپ سے مصافحہ کرنا گوارا نہیں کرتے تھے، مدینہ کے کسی راستہ میں آپ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا سامنا ہو گیا، ان کو نہانے کی ضرورت تھی، گوارا نہ کیا کہ اس حالت میں آپ کے سامنے آئیں، اس لئے آپ کو دیکھا تو کترا گئے اور غسل کر کے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، آپ نے دیکھا تو فرمایا کہ ''ابو ہریرہ کہاں تھے، عرض کیا ''میں پاک نہ تھا اس لئے آپ کے پاس بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔''

☆ اپنے عظیم وکریم آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ادب واحترام تھا وہ تو تھا ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کا بھی صحابہ ادب کرتے تھے اور اسے نعمتِ عظمیٰ سمجھتے تھے،

غزوۂ خیبر میں آپ نے ایک صحابیہ کو خود دستِ مبارک سے ایک ہار پہنایا تھا وہ اس کی اتنی قدر کرتی تھیں کہ عمر بھر گلے سے جدا نہیں کیا، جب انتقال کرنے لگیں تو وصیت کی کہ ان کے ساتھ ہار کو بھی دفن کر دیا جائے۔

☆ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس ایک قمیص، ایک تہبند، ایک چادر اور چند موئے مبارک تھے، انہوں نے وفات کے وقت وصیت کی کہ یہ کپڑے کفن میں لگائے جائیں اور موئے مبارک منہ اور ناک میں بھر دیئے جائیں۔

☆ ایک دن آپ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے مکان پر تشریف لائے، گھر میں ایک مشکیزہ لٹک رہا تھا، آپ نے اس کا دہانہ اپنے منہ سے لگایا اور پانی پیا، حضرت ام سلیم نے مشکیزے کے دہانے کو کاٹ کر اپنے پاس بطور یادگار کے رکھ لیا۔

سارے واقعات کا استقصاء اور جمع کرنا مقصود نہیں اس کے لیے طویل دفتر کی ضرورت ہے، سیر وسوانح کی کتابیں ان واقعات سے بھری پڑی ہیں، عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ناموس رسالت کا تحفظ، اس کے ساتھ قلبی وابستگی، محبت اور ادب امت مرحومہ کے لیے ایک مقدس وراثت کی حیثیت رکھتا ہے پہلے بھی ہوا ہے اور آیندہ بھی ان شاء اللہ امت کا ہر غیور فرد اپنے لہو سے اس کی حفاظت کرتا رہے گا۔

فرقہ واریت کی نحوست

سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۳ میں ہے: ''اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور فرقہ فرقہ نہ ہو جاؤ اور اپنے اوپر اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اور اس نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی سو تم اس کے فضل سے آپس میں بھائی بھائی بن گئے، تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے سو اس نے تمہیں اس سے بچالیا۔''

سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل اہل عرب خصوصاً اور پورا عالم انسانی عموماً قبیلوں گروہوں اور فرقوں میں تقسیم تھا، انسان انسان کے خون کا پیاسا تھا، جنگیں سیم وزر کے حصول، قبائلی عصبیت، گروہی امتیاز اور انتقام کے نام پر ہوتی تھیں۔

ایک جان کا انتقام لینے کے لئے چھڑنے والی جنگ سینکڑوں انسانوں کا لہو پی جاتی تھی مگر اس کی پیاس نہیں بجھتی تھی، کائنات کے خالق کو زمین پر بسنے والے انسان نما حیوانوں پر ترس آگیا اور اس نے انسانوں میں سے بہترین کو نورانی شریعت اور مبارک کتاب دے کر مبعوث فرمادیا، پھر آپ کی مسلسل محنت، تربیت، دعاؤں اور سوز وگداز کی برکت سے سینوں میں دھڑکنے والے پتھر کے ٹکڑے موم بن گئے، شعلے برسانے والی آنکھیں الفت ومحبت کی کرنیں بکھیرنے لگیں، غیض وغضب کی آگ سے بھڑکنے والے سینے پیار اور ایثار کی آماجگاہ بن گئے۔ وہ جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے آپس میں بھائی بھائی بن گئے، رشتۂ اخوت کی بنیاد صرف ایمان تھا، گورے اور کالے، عربی اور عجمی کا امتیاز ختم ہوگیا۔ ایک ایسی امت تیار ہوگئی جس کا ہر فرد دوسرے کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتا تھا، آپ نے ان سب کو اتفاق واتحاد قائم رکھنے اور اختلاف وانتشار سے بچنے کی تلقین فرمائی۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: ''جیسے بھیڑیا، ریوڑ سے الگ تھلگ چلنے والی بکری کا شکار کرلیتا ہے اسی طرح شیطان، انسانوں میں بھیڑیے کا کردار ادا کرتا ہے، تم جماعت کو لازم پکڑو اور جماعت سے جدا ہونے سے بچے رہو۔''

دوسری جانب آپ علم عطائی کی بناء پر جانتے تھے کہ بتدریج آپ کی امت فرقوں اور گروہوں میں تقسیم ہوجائے گی، آپ نے اس کی پیشنگوئی ان الفاظ میں فرمائی تھی ''میری امت پر وہی حالات آکر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے بالکل ایسے ہی جیسے ایک جوتا دوسرے کے مشابہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ اگر ان میں سے کسی نے اپنی والدہ کے ساتھ علانیہ بدکاری کی ہوگی تو میری امت میں سے بھی کوئی یہ حرکت کرے گا، بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے تھے، میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوجائے گی لیکن ایک جماعت کے سوا سب دوزخ میں جائیں گے، سوال ہوا یارسول اللہ وہ کون سی جماعت ہے (جو نجات پائے گی) فرمایا جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر ہوگی۔''

قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ہدایات کو مضبوطی سے پکڑلیا اور اس چیز نے ان کے لئے فتوحات کا دروازہ کھول دیا، غور سے دیکھا جائے تو ان کی قوت وطاقت کا راز ایمان اور اتحاد میں پوشیدہ تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے وقت جزیرہ نمائے عرب پر اسلام کی حکومت قائم ہوگئی تھی، چھ سال بعد پورے شام پر ہلالی پرچم لہرانے لگا، دس سال بعد پورا ایران ان کے زیرنگیں آگیا، اس کے متصل بعد افغانستان، ایمان کے نور سے جگمگا اٹھا، اکتالیس بعد سمرقند و بخارا قال اللہ وقال الرسول کی صداؤں سے گونج اٹھا، اناسی سال بعد محمد بن قاسم نے کراچی سے ملتان تک اسلام کے جھنڈے گاڑ دیے۔

اسی زمانے میں طارق بن زیاد اسپین میں داخل ہوگیا اور ساتھ ہی اس نے آدھے

فرانس پر قبضہ کرلیا، صرف سوادوسو سال میں بحیرہ اسود سے ملتان تک اور سمرقند سے جنوبی فرانس اور ساحل اوقیانوس تک نوے لاکھ مربع میل پر مسلمانوں کی حکمرانی قائم ہوچکی تھی، عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے ایک دفعہ بغداد کی فضاؤں میں بادل کے آوارہ ٹکڑوں کو دیکھ کر کہا تھا، جاؤ کسی بھی شہر پر جاکر برسو، خراج تو میرے پاس ہی آئے گا۔

اس زمانے میں عیسائیوں کے طاقتور حکمران دو ہی تھے، پوپ اور قیصر دونوں مسلمانوں کے باجگزار تھے۔ جب ایک بار قیصر نے خراج ادا کرنے سے انکار کیا تو ہارون الرشید نے اسے ایسا جواب دیا تھا جسے پڑھ کر کفار آج تک آتش درنعل ہوجاتے ہیں، اس نے لکھا ''اے فاحشہ ماں کے بچے! میں نے تمہارا خط پڑھ لیا ہے میں عنقریب اس کا جواب دوں گا۔''

چنانچہ ہارون نے زوردار حملہ کیا، جس کے نتیجے میں قیصر دوبارہ خراج ادا کرنے پر مجبور ہوگیا۔ ایک ہزار برس تک دنیا کی قیادت مسلمانوں کے پاس رہی، اس کے بعد زوال شروع ہوگیا، اس زوال میں فرقہ واریت نے اہم کردار ادا کیا۔ امت باقی نہ رہی فرقے، جماعتیں اور چھوٹے چھوٹے گروہ وجود میں آگئے، فروعی اختلافات کو اس قدر ہوا دی گئی کہ وہ اصولی اور بنیادی اختلافات بن گئے، سامراجی طاقتوں نے مسلمانوں کو ٹکڑوں میں تقسیم کردیا، اس بندر بانٹ میں اگر کسی حصے میں چھوٹا سا شہر آگیا تو اس نے اسی کو غنیمت جانا اور وہ شہزادہ بن کر بیٹھ گیا، تقسیم در تقسیم کے عمل نے جسدِ ملی کے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے۔ اب ظاہر ہے جان تو جسم میں ہوتی ہے ٹکڑوں میں تو نہیں ہوتی، ان بے جان ٹکڑوں کے ساتھ دنیا بھر کے یہودی وعیسائی بڑے مکروہ انداز میں کھیل رہے ہیں، اے کاش دنیا بھر کے کلمہ خوانوں کو پھر سے امت بننا نصیب ہوجائے۔

تعددِ ازواج

سورۂ نساء کی آیت ۳ کا مفہوم ہے: ''اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیم بچیوں کے بارے میں انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر اپنی پسند کے مطابق دو دو، تین تین اور چار چار عورتوں سے نکاح کرلو لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم ان کے درمیان عدل قائم نہیں رکھ سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو، یا جو لونڈی تمہاری ملکیت میں ہے وہی سہی، یہ ظلم سے بچنے کی زیادہ بہتر صورت ہے۔''

تعددِ ازواج یعنی ایک سے زیادہ شادی کرنا نہ فرض اور واجب ہے نہ حرام اور ناجائز، جو لوگ مغربی دنیا کی غوغا آرائی سے متاثر ہو کر اسے ناجائز سمجھنے لگے ہیں انہیں اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہئے کیونکہ قرآن اور حدیث کے واضح دلائل سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے، البتہ اس کا جواز چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے:

پہلی شرط یہ کہ مرد ساری بیویوں کے اخراجات برداشت کر سکتا ہو۔

دوسری یہ کہ وہ سب کے جنسی حقوق ادا کرنے پر بھی قادر ہو۔

تیسری یہ کہ اسے یہ یقین ہو کہ میں ان سب میں عدل کرسکوں گا۔

اسلام نے تعدد ازواج کی جو اجازت دی ہے تو اس پر مسلمانوں کو شرمانے یا فاسد تاویلات کے ذریعے اس کا انکار کرنے کی ضرورت نہیں، اہلِ علم نے متعدد ایسے نقلی اور عقلی دلائل پیش کیے ہیں جن کے مطالعے کے بعد کوئی بھی شخص تعدّد ازواج کی ضرورت سے انکار نہیں کرسکتا، چند ایک کا مطالعہ آپ بھی فرمائیں:

۱۔ مسلمان کے لیے سب سے بڑی حجت اور دلیل اللہ کی کتاب اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور کتاب وسنت سے اس کے ثابت ہونے میں کوئی شک ہی نہیں۔

۲- حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کے علاوہ کئی دوسری مذہبی شخصیات ایسی ہیں جنہوں نے ایک سے زیادہ شادیاں کیں، اگر یہ ناجائز عمل ہوتا تو ان میں سے کوئی بھی اس کا ارتکاب نہ کرتا، خود آسمانی کتابوں میں سے بھی کسی کتاب میں تعددِ ازواج سے منع نہیں کیا گیا۔

۳- مردم شماری کے جو سروے شائع ہوتے رہتے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ تقریباً تمام ممالک میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے بالخصوص جنگوں میں مردوں کے کام آنے کے بعد تو بہر حال عورتوں کی تعداد بڑھ ہی جاتی ہے (حال ہی میں پاکستان کے بارے مین ایک سروے نظر سے گزرا جس کے مطابق صرف پاکستان میں ایک کروڑ خواتین بے نکاحی گھروں میں بیٹھی ہیں) اگر ان عورتوں کو نکاح میں نہ لایا جائے تو زنا کاری بڑھے گی، یہ عورتیں بے سہارا رہیں گی، توالد و تناسل کے ذریعے اپنی قوم کی افرادی قوت میں اضافہ نہیں کر سکیں گی۔

۴- مرد کی شہوانی جبلّت تنوّع پسند بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک تندرست مرد میں قوت اور شہوت بھی زیادہ ہوتی ہے پھر عورت کے ساتھ حیض ونفاس اور حمل و رضاعت کے جو عوارض ہیں ان کی بناء پر وہ بعض اوقات مرد کی طبعی خواہش کی تشفی کے لیے کافی ثابت نہیں ہوتی۔

۵- اہلِ مغرب نے زنا کو جو قانونی تحفظ اور جواز فراہم کر رکھا ہے وہ بھی تعدد کے نظریہ کو قوت فراہم کرتا ہے گویا وہ بھی تعدد کی ضرورت محسوس کرتے ہیں مگر نکاح کی صورت میں نہیں بلکہ زنا کی صورت میں (آئے دن اخبارات میں ان کی سیاسی اور مذہبی قیادت تک کے ناجائز تعلقات کے اسکینڈل شائع ہوتے رہتے ہیں)

۶- عورت کو اپنی طبعی خواہش بنا کر بے سہارا چھوڑ دینے سے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ

اسے نکاح میں لاکر باقاعدہ سہارا فراہم کیا جائے تاکہ وہ ایک کے بعد دوسرے اور تیسرے کی ہوس کا نشانہ سے محفوظ رہے۔

جہاں تک ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کثرتِ ازواج کا تعلق ہے تو ہم مسلمانوں کو اس پر فخر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا یہ پہلو بھی اعجازی شان رکھتا ہے کہ نو بیویوں کے ہوتے ہوئے بھی آپ نے فرائضِ نبوت کی ادائیگی میں کمی واقع نہیں ہونے دی، نہ درسگاہ خاموش ہوئی نہ منبر ومحراب محروم ہوئے، نہ میدانِ جہاد خالی ہوا، نہ بیوائیں اور یتیم بے سہارا ہوئے، نہ دعوت وارشاد میں کوئی تعطّل ہوا نہ آپ کی انفرادی عبادت میں کوئی کمی واقع ہوئی۔

آپ کی شادیوں میں جو حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ تھیں ان تک رسائی کے لیے دل اور دماغ کا پاک ہونا ضروری ہے۔ شہوت پرست اور تعصب کے مارے ہوئے کافران مصلحتوں کو ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔

یہ حقیقت جس قدر جلد ہم تسلیم کرلیں اتنا ہی ہماری معاشرتی زندگی کو بگاڑ سے بچانے کے لیے بہتر ہوگا کہ اگر ہم نے تعدّدِ ازواج کا دروازہ بند رکھا اور معاذ اللہ اسے ایک قابلِ نفرت عمل سمجھتے رہے تو بے شمار بہنیں اور بیٹیاں تا زندگی بے نکاحی رہیں گی اور ان میں ایسی بھی ہوسکتی ہیں جنہیں بدکاری کی راہ پر چلنے سے روکنا بہت مشکل ہوگا۔

پٹائی کی اجازت

سورۂ نساء کی آیت ۳۴ میں ناشزات (نافرمانی کرنے والی عورتوں) کو مارنے کی اجازت دی گئی ہے...... پٹائی کی اجازت کب اور کیسے ہے؟ اس سوال کا جواب تو ہم بعد میں دیں گے، پہلے آیتِ مذکورہ کا سلیس ترجمہ اور اس کے ابتدائی مضمون کو سمجھ لینا مناسب ہوگا۔

ارشاد باری تعالیٰ کا مفہوم ہے: ''مرد عورتوں کے ذمہ دار ہیں ایک تو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور دوسرے اس لئے کہ مرد اپنے اموال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں، سو جو عورتیں نیک ہوتی ہیں وہ فرماں بردار ہوتی ہیں اور وہ پیٹھ پیچھے اس چیز کی حفاظت کرتی ہیں جس کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور تمہیں جن عورتوں کی سرکشی کا علم ہو جائے تو انہیں نصیحت کرو اور انہیں خواب گاہ میں تنہا چھوڑ دو (پھر بھی نہ سمجھیں) تو انہیں مار بھی سکتے ہو، پھر اگر وہ تمہاری بات ماننا شروع کر دیں تو ان پر زیادتی کے لئے بہانے تلاش مت کرو، بے شک اللہ بڑا عالی شان اور بڑا عظمت والا ہے۔''

اس آیتِ کریمہ کی ابتداء میں مرد کی قوامیت کا ذکر کیا گیا ہے، ''قوّام'' کا لفظ محافظ، منتظم، حاکم اور ذمہ دار کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، گویا بتایا گیا ہے کہ گھر کی چھوٹی سی مملکت کا نظم و نسق، حسن وخوبی کے ساتھ چلانے کے لئے مرد کو عورت کا محافظ اور ذمہ دار بنایا گیا ہے کیونکہ جس مملکت میں نہ قانون ہو نہ قانون نافذ کرنے والی کوئی اتھارٹی، وہاں انارکی اور انتشار پھیل جاتا ہے، البتہ علم وعمل اور روحانیت کے میدان میں مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں بلکہ حسنِ نیت، تزکیۂ نفس اور اعمالِ صالحہ کے اعتبار سے عورت بھی مرد سے آگے بڑھ سکتی ہے۔

مرد کو عورت پر جو فضیلت اور قوّامیت حاصل ہے اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک وجہ فطری اور وہبی ہے اور دوسری وجہ کسبی اور اختیاری ہے، فطری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو

عوت پر فضیلت عطا کی ہے مثلاً عقل، قوتِ ارادی، عزم، جسمانی طاقت، جرأت اور نشانہ بازی، ان میں سے ہر صفت میں مرد، عورت پر فائق ہوتا ہے، جس کی وجہ سے نبوت، حکومت، امامت، جہاد، اذان، خطبہ، جدو جہد، قصاص میں شہادت اور نکاح، طلاق اور رجعت میں ولادیت اور اسی طرح تعدداز واج اور ثبوتِ نسب وغیرہ مرد ہی کے ساتھ خاص ہیں، غرضیکہ تمام اعمالِ شاقہ اور اجتماعی امور اللہ تعالیٰ نے مردوں ہی کے سپرد کئے ہیں، حکومت اور خلافت کے معاملات کے لئے بھی بڑی محنت، جگر سوزی اور سوجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے، اس طرح یہ ذمہ داری بھی مردوں ہی کے سپرد کی گئی ہے۔

جب ایرانیوں نے کسریٰ کی بیٹی بوران کو بادشاہ بنایا تو ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی جو اپنا معاملہ عورت کے حوالے کردے۔‘‘

عورت پر مرد کی فضیلت کی دوسری وجہ اختیاری ہے وہ یہ کہ عورت کا مہر، نان نفقہ اور دیگر اخراجات مرد کے ذمہ ہوتے ہیں۔

مرد کی قوامیت اور حاکمیت بیان کرنے کے بعد ازدواجی زندگی کے اعتبار سے عورت کی دو حالتیں بیان فرمائی گئی ہیں:

1- صالحات (نیک عورتیں):

صالحات کی دو بڑی صفات اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں ایک یہ کہ وہ اللہ کی، اللہ کے رسول کی اور پھر اپنے شوہر کی فرمانبردار ہوتی ہیں۔ دوسری یہ کہ وہ شوہر کی عدم موجودگی میں بھی ان چیزوں کی حفاظت کرتی ہیں جن کی حفاظت کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے یعنی اپنی عزت وآبرو اور شوہر کے مال اور اولاد کی دل وجان سے حفاظت کرتی ہیں۔

2- ناشزات (نافرمان عورتیں):

صالحات کے برعکس جو عورت بغاوت پر اتر آئے اور حقوقِ زوجیت ادا نہ کرے، اس

کے چار علاج ہیں:

(۱) اسے سمجھایا جائے، شوہر کے حقوق بتائے جائیں، پرسکون ازدواجی زندگی کے فوائد بیان کئے جائیں، جدائی اور طلاق کے نقصانات سے اسے مطلع کیا جائے۔

(۲) اگر وعظ ونصیحت اس پر اثر نہ کرے تو اسے خواب گاہ میں تنہا چھوڑ دیا جائے۔

(۳) اگر ترکِ تعلق سے بھی وہ راہِ راست پر نہ آئے اور ضد پر اڑی رہے تو اسے ہلکی پھلکی پٹائی بھی لگائی جاسکتی ہے۔

پٹائی کا لفظ ہی ایسا ہے کہ بعض پڑھے لکھے اسے سن کر ہی ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں کہ قرآن نے پٹائی کی اجازت کیسے دے دی، مگر درجِ ذیل باتیں ملحوظ رہیں تو ذہن صاف ہوجائے گا:

۱- قرآن کریم کے مخاطب ہر طبقہ، ہر سطح اور ہر ذہنیت کے لوگ ہیں، شہری بھی، دیہاتی بھی، پڑھے لکھے بھی، جاہل بھی، نیک بھی، بد بھی، پہلی صدی کے بھی اور پندرھویں صدی کے بھی، جو تجویز اور علاج ایک طبقہ کے لئے مؤثر ثابت ہوسکتا ہے، ضروری نہیں کہ دوسرے طبقے کے لئے بھی کارگر ثابت ہو۔

۲- مارنے کی اجازت صرف اس شخص کو ہے جو پہلے دوسری تدبیریں آزما چکا ہو اور ان کا کوئی فائدہ ظاہر نہ ہوا ہو، ایسے لوگوں کو ہاتھ اٹھانے کی ہرگز اجازت نہیں جو مار پٹائی ہی کو پہلا اور آخری علاج سمجھتے ہیں۔

۳- پٹائی کا مقصد عورت کی اصلاح ہو، شیطانی اور نفسانی غصہ کی آگ کو ٹھنڈا کرنا پیشِ نظر نہ ہو (اگر ہم پٹائی کے واقعات کا جائزہ لیں تو زیادہ تر واقعات کے پسِ منظر میں نفسانی غصہ بھی کارفرما ہوتا ہے)

۴- مارنا ہی پڑ جائے تو چہرے کو چوٹ سے بچایا جائے، مارنے کے لئے لاٹھی یا کوڑا

استعمال نہ کیا جائے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس مقصد کے لئے مسواک استعمال کی جائے اور ایسی چوٹ ہرگز نہ لگائی جائے جس سے جسم پر نشان پڑ جائے (کہاں اسلام کی یہ تعلیم اور کہاں ان وحشیوں کی سنگدلی جو لاتوں گھونسوں، ڈنڈوں اور اینٹ پتھروں سے بھی پٹائی کو اپنا حق سمجھتے ہیں، چنانچہ اخبارات میں انسانی جذبات سے عاری قسم کے شوہروں کی پٹائی کے نتیجے میں ہونے والی اموات کی خبریں آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں)

۵- صرف ناشزہ یعنی بغاوت اور نافرمانی پر اتر آنے والی عورت کو مارنے کی اجازت ہے، لباس وطعام اور گھر گرہستی سے تعلق رکھنے والی کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ڈنڈا اٹھالینا مومنوں کا نہیں جاہلوں کا کام ہے۔

٦- بامر مجبوری پٹائی کی اجازت ہونے کے باوجود علماء پٹائی سے اجتناب ہی کو افضل قرار دیتے ہیں اس لئے کہ عورتوں پر ہاتھ اٹھانے والوں کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "وہ اچھے لوگ نہیں ہیں" خود ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بھر اپنی نو بیویوں میں سے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔

۷- اگر عورت فرمانبردار بن جائے اور ضد اور سرکشی چھوڑ دے تو پھر اس پر زیادتی کے لئے بہانے تلاش کرنا جائز نہیں۔

آیت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ کی دو صفات ذکر کی گئی ہیں یعنی "علی" اور "کبیر" گویا ظلم کرنے والے مردوں کو تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ اپنے آپ کو بڑا مت سمجھو، تم سب سے بڑا اللہ ہے، وہ عورتوں پر ڈھائے جانے والے ظلم کا انتقام لے سکتا ہے۔

حقوقِ نسواں

پہلے سورۂ نساء کی چند آیات کا مفہوم ملاحظہ فرمالیں! پھر ان کی تشریح کے ضمن میں ''حقوقِ نسواں'' پر بحث کی جائے گی، ارشادِ باری تعالیٰ کا مفہوم ہے:

''اے ایمان والو! تمہارے لئے یہ حلال نہیں کہ تم جبراً عورتوں کے مالک بن جاؤ اور نہ اس غرض سے انہیں روکے رکھو تاکہ تم نے انہیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے کچھ حصہ واپس لے لو، ہاں اگر وہ صریح بے حیائی کا ارتکاب کریں تو پھر لے سکتے ہو اور اپنی بیویوں کے ساتھ حسن سلوک سے گزر بسر کرو، اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں کوئی بڑی بھلائی رکھی ہو اور اگر تم پہلی بیوی کو چھوڑ کر دوسری سے نکاح کرنا چاہو تو اگر تم نے پہلی بیوی کو مال کا انبار بھی دیا ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو، کیا تم اس پر بہتان لگا کر اور صریح ظلم کرکے مال واپس لینا چاہتے ہو؟ تمہاری غیرت اس مال کو واپس لینا کیسے گوارا کرتی ہے جبکہ تم اس سے خلوت کر چکے ہو اور وہ تم سے پختہ قول وقرار لے چکی ہے''(۱۹، ۲۱)

زمانہ جاہلیت میں عورت بہت مظلوم تھی، نہ صرف عربوں میں بلکہ رومیوں اور یونانیوں میں بھی دستور تھا کہ میت کی جائیداد کی طرح اس کی بیویاں بھی سوتیلے بیٹوں کو وراثت میں ملتی تھیں اور پھر وہ ان سے جیسا چاہتے سلوک کرتے تھے، ایسا بھی ہوتا کہ وہ ان سے خود ہی نکاح کر لیتے اور ایسا بھی ہوتا کہ نکاح تو کسی اور سے کردیتے مگر ان کا مہر خود وصول کر لیتے اور بعض اوقات انہیں گھر میں محبوس رکھ کر ان کی موت کا انتظار کرتے تاکہ ان کے مال و متاع کے خود وارث بن جائیں، اہل تہامہ یوں بھی کرتے کہ اپنی بیوی کو خوب ستاتے یہاں تک کہ وہ طلاق کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہوجاتی پھر اسے اس شرط پر طلاق دیتے کہ تم صرف

اسی سے نکاح کروگی جس سے ہم چاہیں گے، اس کے بعد اگر نکاح کا کوئی امیدوار سامنے آتا تو اس سے مہر وغیرہ کی مد میں رقم وصول کر کے خود ہڑپ کر جاتے۔

اسلام نے عورت کو ہر قسم کے مظالم سے نجات دلائی اور اسے اس کے جائز حقوق دیئے، مذکورہ آیات میں عورتوں کے جو حقوق مذکور ہیں وہ درج ذیل ہیں:

☆ عورتوں کو مال موروث سمجھنا، اسے نکاح سے روکنا، اس سے جبراً خود نکاح کرنا یا کسی اور سے کروانا جائز نہیں بلکہ عاقلہ بالغہ کو اس معاملہ میں اپنے اوپر اختیار حاصل ہے۔

☆ اپنی بیویوں سے محض مال ہتھیانے کے لئے انہیں تنگ کرنا، حقوق بھی ادا نہ کرنا اور دوسری جگہ بھی نکاح نہ کرنے دینا جائز نہیں۔

☆ میاں بیوی کا تعلق مالک اور لونڈی کا نہیں بلکہ راہِ زندگی کے دو دوستوں اور شرکاء سفر کا ہے، پھر انسان ہونے کے ناطے عورت کے بھی ویسے ہی جذبات ہوتے ہیں جیسے مرد کے جذبات ہوتے ہیں بلکہ جذبات کے سلسلہ میں عورت زیادہ حساس اور ''نازک آبگینہ'' ہوتی ہے اس لئے اس کے ساتھ قول وعمل سے حسنِ سلوک ضروری ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں کیا عرب اور کیا عجم عورت کے کچھ بھی حقوق نہ تھے، وہ محض قضائے شہوت اور توالد وتناسل کا ایک ذریعہ تھی۔ قرآن نے عورت کے حقوق بیان کئے اور صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے اس کے نمونے پیش کئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج سے خوش اخلاقی سے پیش آتے، کام کاج میں ان کی مدد کرتے، دکھ درد میں شریک ہوتے، ان سے ہنسی مذاق کرتے، انہیں قصے کہانیاں سناتے، ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے بڑی محبت اور چاہت سے ان کا بچا ہوا کھا لیتے۔

☆ اللہ تعالیٰ نے (انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ) جتنے بھی انسان پیدا فرمائے ہیں ان میں خوبیاں بھی ہو سکتی ہیں اور خامیاں بھی، یہ الگ بات ہے کہ انسان عام طور پر خامیوں

پر ہی نظر رکھتا ہے اور خوبیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے، عورتوں کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے، ممکن ہے ایک عورت زبان اور مزاج کی تیز ہو مگر اس کا کردار اجلا اور بے داغ ہو، وہ امورِ خانہ داری میں مہارت رکھتی ہو، اولاد سے بے پناہ محبت کرنے والی ہو، ان کی تربیت کا حق ادا کرتی ہو...... اس لئے مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں شوہروں کو سمجھایا گیا ہے کہ اگر اپنی بیوی کی کوئی بات یا عادت تمہیں ناپسند ہو تو بھی اس سے جدائی اختیار کرنے یا اس پر ہاتھ اٹھانے میں جلدی نہ کرو، ممکن ہے اس کے ذریعے تمہیں کوئی بڑی بھلائی حاصل ہونے والی ہو مثلاً صبر کی وجہ سے نیک اولاد حاصل ہو جائے ورنہ اجر وثواب تو کہیں گیا نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''کوئی مؤمن بیوی سے کلی طور پر نفرت نہ کرے، ممکن ہے اس کی ایک عادت اگر تمہیں بری لگتی ہے تو اس کی دوسری عادت تمہیں اچھی لگے۔''

☆ عورتوں پر ظلم کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ جب مرد بیوی کو طلاق دینا چاہتا تو اس سے اپنا دیا ہوا مہر واپس لے لیتا اور بعض اوقات مہر کی واپسی کے لئے بہتان تراشی اور ظلم و زیادتی جیسے ہتھکنڈے بھی اختیار کرتا، یہ ظلم صرف زمانۂ جاہلیت میں نہیں ہوتا بلکہ آج بھی ہوتا ہے، جب حسن اور محبت دونوں شباب پر ہوتے ہیں تو ہدایا اور تحائف کی بارش خوب برستی ہے اور کسی بھی فرمائش کو نوکِ زبان سے ادا ہوتے ہی پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جذباتی لوگ آسمان سے ستارے توڑ کر قدموں میں ڈھیر کرنے کے وعدے بھی کر لیتے ہیں لیکن جب حسن اور محبت پر زوال آ جائے تو بعض کم ظرف مرد، عورت سے سب کچھ چھین لینے کی کوشش کرتے ہیں، یہاں تک کہ مہر جو کہ عورت کا حق ہوتا ہے اسے بھی ہتھیا لینا چاہتے ہیں، قرآن نے اس قبیح حرکت سے منع کیا اور ایمان والوں کو حکم دیا ہے کہ اگر تم نے اپنی بیوی کو مال کا انبار بھی بطورِ مہر دے رکھا ہو تو بھی اس سے واپس نہ لو، تمہاری یہ حرکت نہ

صرف یہ کہ ایمانی غیرت کے خلاف ہے بلکہ تمہارے سابقہ تعلق اور باہمی قول وقرار کے لئے منافی ہے۔ یہاں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مہر کی کوئی حد مقرر نہیں یہ الگ بات ہے کہ سادگی اور آسانی میں برکت زیادہ ہوتی ہے۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر مجمع عام میں لوگوں کو بڑے بڑے مہر مقرر کرنے سے منع فرمایا، ایک عورت نے اسی آیتِ کریمہ سے استدلال کرتے ہوئے سب کے سامنے کہا تھا: ''اے عمر! اللہ ہمیں دیتا ہے اور آپ ہمیں محروم کرنا چاہتے ہیں؟'' آپ نے اپنی بات سے رجوع کرتے ہوئے فرمایا ''عورت درست کہتی ہے اور عمر نے غلط کہا۔'' دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے سر جھکا لیا اور خود اپنے آپ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''اے عمر! سب لوگ تجھ سے زیادہ فقیہ ہیں۔''

فتنۂ دجال اور سورۂ کہف

قبل اس کے کہ ہم دجالی تہذیب کا تعارف کرائیں۔ فتنۂ دجال کے بارے میں چند احادیث اور سورۂ کہف کا اس فتنہ کے ساتھ جو تعلق ہے اس کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں:

سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کے فتنے کے بارے میں جو کچھ فرمایا اس کا حاصل یہ ہے:

☆ فتنۂ دجال اتنا سخت ہوگا کہ تاریخِ انسانی میں اس سے بڑا فتنہ نہ کبھی ہوا نہ آئندہ ہوگا۔

☆ اسی لئے تمام انبیاء کرام اپنی اپنی امتوں کو اس سے خبردار کرتے رہے۔

☆ مگر اس کی جتنی تفصیلات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائیں کسی اور نبی نے نہیں بتائیں۔

☆ وہ پہلے نبوت کا اور اس کے بعد خدائی کا دعویٰ کرے گا۔

☆ اس کے ساتھ غذا کا بہت بڑا ذخیرہ ہوگا۔

☆ زمین کے پوشیدہ خزانوں کو حکم دے گا تو وہ باہر نکل کر اس کے پیچھے ہو جائیں گے۔

☆ مادرزاد اندھے اور ابرص کو تندرست کر دے گا۔

☆ دجال کے ساتھ (نہروں اور وادیوں کی صورت میں) ایک جنت ہوگی اور ایک آگ لیکن حقیقت میں جنت آگ ہوگی اور آگ جنت۔

☆ جو شخص اس کی آگ میں گرے گا اس کا اجر و ثواب یقینی اور گناہ معاف ہو جائیں گے۔

☆ جو شخص دجال پر سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیات پڑھے گا وہ اس کے فتنہ سے محفوظ رہے گا حتیٰ کہ اگر دجال اسے اپنی آگ میں بھی ڈال دے تو وہ اس پر ٹھنڈی ہو جائے گی۔

مختلف علماء نے جن میں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہم اللہ پیش پیش ہیں اس حوالے سے بحث کی ہے کہ اس سورہ میں وہ کون سا سبق اور کون

سی رہنمائی موجود ہے جو اپنے قاری کو فتنۂ دجال اور دجالی تہذیب سے محفوظ رکھ سکتی ہے؟ سورۂ کہف میں چار قصے ذکر کئے گئے ہیں، ان قصوں میں غور وفکر کرنے والا انسان دجال اور اس کے فکر وفلسفہ سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

- ان میں سے پہلا قصہ اصحاب کہف کا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ شہنشاہ ڈیسس، یونان کے قدیم شہر فیس میں بت پرستی کی تجدید کرنا چاہتا تھا، اس کے جبر اور ظلم وستم کی وجہ سے بہت سارے عیسائیوں نے عیسائیت ترک کردی لیکن کچھ خوش نصیب ایسے تھے جنہوں نے حکومتی مظالم کے باوجود عیسائیت سے دستبردار ہونا قبول نہ کیا، ان خوش نصیبوں میں وہ سات نوجوان بھی شامل تھے جو شاہی محل میں مقیم تھے، بادشاہ نے انہیں غور وفکر کی مہلت دی تاکہ وہ نصرانیت سے توبہ کرلیں، اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے شہر چھوڑ دیا اور ایک غار میں جاکر چھپ گئے وہاں انہیں تین سو سات سال سلا دیا گیا، اس عرصہ میں شہر کے حالات بدل گئے اور بت پرستوں کی جگہ خدا پرستوں کے اقتدار پر غلبہ ہوگیا، جب خدا کے ماننے والوں کو غار میں ان نوجوانوں کے زندہ ہونے کا پتہ چلا تو وہ ان کی زیارت کے لئے دوڑ پڑے یوں کل کے جلاوطن آج کے ہیرو بن گئے، مگر ان کی زیارت کسی کو نصیب نہ ہوسکی۔

- دوسرا قصہ دو باغ والے کا ہے، یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جسے آسائش اور خوشحالی سے نوازا گیا تھا اس کے پاس انگور کے دو باغ تھے، اس کے چاروں طرف کھجور کے درخت تھے، درمیان میں کاشت کے قطعے بھی تھے، ان دو باغات کے علاوہ بھی اس کا کاروبار تھا، اسے چاہئے تھا کہ وہ اللہ کا شکر ادا کرتا لیکن اس نے شکر کی بجائے کفرانِ نعمت اور کبر وغرور کا راستہ اختیار کیا، اس کی سوچ یہ بن گئی کہ مجھے جو کچھ ملا ہے وہ میری ذاتی محنت اور ذہانت کے نتیجے میں ملا ہے اور میں اس سے کبھی محروم نہیں ہوں گا۔ جہاں تک قیامت کا تعلق ہے اول تو وہ قائم نہیں ہوگی اور اگر قائم ہوئی تو وہاں بھی عزت اور سعادت مجھ سے بے وفائی نہیں

کرے گی، اس کا دوست جسے اللہ تعالیٰ نے ایمانی بصیرت عطا فرمائی تھی نے اس کی مادہ پرستانہ سوچ کی مخالفت کی اور اسے یہ ایمانی حقیقت سمجھانے کی کوشش کی کہ وسائل واسباب کچھ نہیں بس وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے، ساری کائنات پر اللہ کا اقتدار ہے وہ جو چاہتا ہے اس میں تصرف کرتا ہے، وہ چشمِ زدن میں امیر کو غریب اور غریب کو امیر بنا سکتا ہے چنانچہ ایک آندھی آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے لہلہاتے باغ چٹیل میدان بن گئے۔

- تیسرا قصہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کا ہے، اللہ تعالیٰ نے جب حضرت کلیم کو بتایا کہ حضرت خضر کے پاس ایسا علم ہے جو آپ کے پاس نہیں تو وہ بڑے شوق اور ذوق سے ان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے بالآخر انہوں نے آپ کو پالیا اور چند دن ان کے ساتھ رہے، اس دوران چند ایسے واقعات ان کے سامنے پیش آئے جو ان کے لئے بالکل عجیب وغریب تھے چنانچہ وہ خاموش رہنے کے باوجود خاموش نہ رہ سکے، ہوا یوں کہ یہ دونوں حضرات ایک کشتی پر سوار ہوئے، جس کے مالک نے ازراہِ محبت واکرام ان سے کرایہ بھی نہ لیا لیکن حضرت خضر نے اسی کشتی کو توڑ دیا، کشتی سے اتر کر پیدل جارہے تھے کہ ایک معصوم بچے کو قتل کردیا آگے چل کر ایک گرتی ہوئی دیوار کی بلا اجرت مرمت کردی حالانکہ گاؤں والے میزبانی کے لئے بھی تیار نہ ہوئے تھے۔

- چوتھا واقعہ ذوالقرنین کا اس سورت میں بیان ہوا ہے جس کی فتوحات کا دائرہ ایک طرف مشرق کے آخری کنارے اور دوسری طرف مغرب کے انتہائی سرے تک پہنچ گیا تھا، ان فتوحات اور ذرائع ووسائل کی کثرت کے باوجود اس کا دامن ظلم وستم اور فخر وغرور سے پاک رہا اور وہ ضعیفوں کا مونس وغمخوار اور ظالموں کے لئے تازیانۂ عبرت بنا رہا، اس کے زمانے میں یاجوج ماجوج نام کی ایک وحشی قوم تھی جو اپنے پڑوسیوں کو حملوں کو نشانہ بناتی تھی، ذوالقرنین نے اپنے وسائل اور فوج کے ذریعے ایسا پشتہ اور دیوار بنادی جس نے

یاجوج ماجوج کا راستہ روک دیا۔ جیسا کہ ہم نے ابتداء میں عرض کیا کہ ان چاروں قصوں میں غور وفکر ہمیں فتنہ دجال اور اس کے فکر وفلسفہ سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ مثلاً:

پہلے قصہ سے ہمیں یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ اگر کبھی اہل ایمان کے سامنے ایسی صورت پیش آجائے جب ایک طرف ایمان جیسی انمول نعمت ہو اور دوسری طرف مادی ترقی، خوشحالی اور آگے بڑھنے کے امکانات ہوں تو وہ ایمان پر ہر چیز کو قربان کر دیتے ہیں مگر ایمان کا دامن کسی صورت بھی چھوڑنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے، جب کہ دجالی تہذیب کی فکر اور فلسفہ یہ ہے کہ مادی ترقی، معیارِ زندگی کی بلندی اور دولت کی ریل پیل پر سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا قصہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کو وسائل و اسباب کی کثرت اور ظاہری عزت و سعادت اور چمک دمک پر کبھی بھی اترانا نہیں چاہیے، یہ فانی اور عارضی چیزیں ہیں، سب سے بڑی طاقت خدا کی ہے، اس کائنات میں وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے، جبکہ دجالی قوتیں وسائل واسباب ہی کو سب کچھ سمجھتی ہیں۔

تیسرے قصے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے پسِ منظر میں بڑی حکمت کارفرما ہوتی ہے، انسان کسی واقعے کے صرف ظاہری پہلو کو دیکھتا ہے جبکہ اس کے باطن میں مختلف حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں۔ کشتی کو توڑنا اور بچے کا قتل بظاہر ظلم تھا مگر درحقیقت بہت بڑا احسان تھا، کشتی توڑی گئی تا کہ ظالم بادشاہ کی دستبرد سے محفوظ رہے، بچے کو قتل کیا گیا تا کہ وہ بڑا ہو کر والدین کو ستانے اور کفر میں مبتلا کرنے کا سبب نہ بن سکے، اور گرتی ہوئی دیوار کو بنایا گیا تا کہ نیک والدین کے یتیم بچوں کا سرمایہ محفوظ رہے۔

چوتھا قصہ ہمیں بتاتا ہے کہ اگر اقتدار نیک لوگوں کے ہاتھ میں ہو تو وہ ظلم کے قلع قمع اور عدل کے قیام کی کوشش کرتے ہیں اور اگر خدانخواستہ دجالی قوتیں برسرِ اقتدار ہوں تو وہ ظلم کو فروغ دیتی ہیں جیسا کہ ہم اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

نکاح کی اہمیت

ازدواجی زندگی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے سورۂ روم میں جہاں اپنی دوسری نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے وہاں اس نعمت کا بھی ذکر فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے ہی نفوس میں سے تمہارے لئے بیویوں کو پیدا کیا تا کہ تمہیں سکون حاصل ہو اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان محبت پیدا کردی۔'' (سورة الروم : ۲۱)

سورۂ اعراف میں ہے: ''وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ تم اس سے سکون حاصل کرسکو۔'' (سورة الأعراف : ۱۸۹)

سورۂ نور میں نکاح کرنے کی بھی ترغیب دی گئی ہے اور نکاح کرانے کی بھی، فرمایا ''اور اپنی قوم کی بیوہ عورتوں کے نکاح کردیا کرو اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے بھی جو نیک ہوں نکاح کردیا کرو۔'' (سورة النور : ۳۲)

یہاں ذہن میں ایک سوال پیدا ہوسکتا تھا کہ جس کا نکاح ہم کروار ہے ہیں اگر اس کے مالی حالات اچھے نہ ہوں تو وہ اپنے اخراجات کہاں سے پورے کرے گا چنانچہ مذکورہ بالا آیت کے آخر میں فرمایا گیا کہ ''اگر وہ فقیر ہوں گے تو اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کردے گا۔'' (سورة النور : ۳۲)

یہ عجیب بات ہے کہ نکاح کی وجہ سے انسان کے اخراجات اور مالی ذمہ داریوں میں اضافہ ہوجاتا ہے لیکن گھر میں اہلیہ اور اولاد کے آنے کے بعد رزق میں برکت ہوجاتی ہے، کہاں تو یہ حال تھا کہ اکیلے کی ضروریات بھی پوری نہیں ہوتی تھیں اور کہاں اب یہ صورت ہے کہ وہ اپنے کنبہ کے دس افراد کے اخراجات بسہولت پورے کرلیتا ہے، اسی لئے فقرو

فاقہ کے اندیشہ سے اولاد کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

عرض یہ کیا جا رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ازدواجی زندگی کو ایک نعمت قرار دیا ہے اور نکاح کرنے اور کرانے کی ترغیب دی ہے، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نے نکاح والی زندگی گزاری، حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ ڈرنے والے، آخرت کی فکر رکھنے والے، انسانیت کی فلاح و بہبود کے درد کی وجہ سے تڑپنے، بلکنے اور رونے والے تھے، اس کے باوجود انہوں نے نکاح کئے اور بیوی بچوں کے حقوق بطریق احسن ادا کئے۔ سورۂ رعد میں ہے "(اے محمد!) ہم نے آپ سے پہلے بھی پیغمبر بھیجے تھے اور ان کو بیویاں اور اولاد بھی دی تھیں۔" (سورة الرعد : ۳۸)

ایک حدیث میں سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار چیزوں کو انبیاء کی سنت فرمایا ہے:

- پہلی چیز حیاء ہے، کسی حدیث میں حیاء کو ایمان کا ایک شعبہ اور کسی حدیث میں حیا اور ایمان کو دو ایسے ساتھی فرمایا گیا ہے جو اکٹھے ہی رہتے ہیں، ایمان ہوگا تو حیا بھی ہوگی اور اگر کوئی شخص حیا سے محروم ہے تو اسے اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہئے۔
- دوسری چیز خوشبو لگانا ہے، سارے انبیاء خوشبو استعمال فرماتے تھے، ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم جو قیمتی اور بہترین خوشبو ہوتی تھی وہ استعمال فرمایا کرتے تھے۔
- انبیاء کی تیسری سنت مسواک کرنا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں مسواک کی اس قدر اہمیت تھی کہ آپ نے فرمایا "اگر میری امت پر مشقت نہ ہوتی تو میں سب کو مسواک کا حکم دیتا۔"
- انبیاء کرام علیہم السلام کی چوتھی سنت نکاح کرنا ہے، متعدد انبیاء نے ایک سے زائد نکاح کئے اور خود سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے گیارہ شادیاں کیں اور آپ کی نو حرم تا

حیات زندہ رہیں۔ نکاح کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ تین آدمیوں کی مدد کرنا اللہ پر لازم ہے یعنی اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا، وہ مکاتب جو بدلہِ کتابت ادا کرنا چاہتا ہو اور تیسرا وہ شخص جو پاکدامنی کی زندگی گزارنا چاہتا ہو۔

(جامع ترمذی)

صحیح بخاری میں ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''اے جوانوں کی جماعت! تم میں سے جو کوئی نکاح کی استطاعت رکھتا ہے اسے چاہئے کہ وہ نکاح کرلے اس لئے کہ نکاح سے نظر اور شرمگاہ کی حفاظت ہوتی ہے۔''

(بخاري: ٤٩٤٦)

جس کے دل میں خوفِ خدا ہو اور وہ حلال کی قدرو قیمت جانتا ہو، نکاح کے بعد اس کی نظریں جھک جاتی ہیں، غیر محرموں کی طرف نہیں اٹھتیں، وہ تاک جھانک سے باز آجاتا ہے، شرمگاہ کی بھی حفاظت ہوجاتی ہے اور یہ حفاظت کوئی معمولی چیز نہیں، ایک حدیث میں ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مجھے اپنی زبان اور شرمگاہ کی حفاظت کی ضمانت دے دے میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔

کتنی بڑی ہے یہ ضمانت؟ اور کتنا عظیم ہے ضامن؟ کون سا مسلمان ہوگا جس کے دل میں یہ ضماعت حاصل کرنے اور زبان اور شرمگاہ کی حفاظت کا داعیہ پیدا نہیں ہوگا؟ اور نکاح ایسی چیز ہے کہ حلال پر اکتفا کرنے والوں کے لئے اس کی وجہ سے پاکدامنی کی زندگی گزارنا آسان ہوجاتا ہے البتہ جن کی فطرت میں خباثت ہوتی ہے اور جن کا طبعی میلان حرام ہی کی طرف ہوتا ہے وہ نکاح کے باوجود بدنظری اور بدکاری میں مبتلا رہتے ہیں۔

معاشرے کو نجاست اور بے راہ روی سے بچانے کے لئے شریعت نے عقدِ نکاح کو آسان تر بنایا ہے اور حکم دیا ہے کہ جب مناسب رشتہ سامنے آجائے تو نکاح میں تاخیر نہ کی

جائے وگرنہ اس تاخیر کے بھیانک نتائج سامنے آئیں گے، ترمذی میں ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تمہارے سامنے کوئی ایسا رشتہ آئے جس کا دین اور سیرت و کردار تمہیں پسند ہو تو اس سے نکاح کرلو، اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ وفساد پھیل جائے گا۔''

اس فتنہ وفساد کے مناظر ہم گلی کوچوں، شہروں اور دیہاتوں میں اپنی نظروں سے دیکھ رہے ہیں، میڈیا ہمیں آئے دن ہوشربا داستانیں سناتا رہتا ہے، خفیہ تعلقات اور آشنائیاں، گھروں سے فرار، خاندان سے بغاوت، کاروکاری اور غیرت کے قتل، عزت و ناموس کی پامالی، ڈھلتی جوانیاں، خزاں زدہ چہرے، اجڑتے گھر، کچہریوں اور تھانوں کے چکر......

یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن اس کے سدباب کے لئے مؤثر تدبیر نہیں ہو رہی، حالات و مشاہدات ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تصدیق کر رہے ہیں، جب ہم نے حیلوں بہانوں سے مناسب رشتے بھی ٹھکرانے شروع کردیئے تو ہر طرف فتنہ وفساد برپا ہوگیا، کاش ہم جان سکیں کہ نکاح صرف توالد وتناسل اور قضائے شہوت ہی کا ذریعہ نہیں بلکہ تکمیل ایمان کا بھی سبب ہے، مشکوٰۃ کی حدیث ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جب بندہ نکاح کرلیتا ہے تو اس کا آدھا دین کامل ہوجاتا ہے اب اسے باقی آدھے دین کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا چاہئے۔''

کسبِ حلال

سورۂ سبا کی آیت ۱۰ اور ۱۱ کا مفہوم ہے: ''اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو اپنی طرف سے بڑی نعمت عطا کی تھی، ہم نے پہاڑوں کو حکم دیا تھا کہ اے پہاڑو! داؤد کے ساتھ بار بار تسبیح کرو اور اسی طرح پرندوں کو بھی حکم دیا اور ہم نے ان کے لئے لوہے کو نرم کر دیا کہ تم پوری زرہیں بناؤ اور جوڑنے میں مناسب اندازہ رکھو اور تم سب نیک کام کیا کرو میں تم سب کے اعمال دیکھ رہا ہوں۔''

آیت مذکورہ کے ضمن میں علماء کرام نے کسبِ حلال اور صنعت و ایجاد کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ یہ بات تو دو اور دو چار کی طرح بالکل واضح ہے کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو کسب و عمل کی ترغیب دی ہے، اسلام میں نہ تو رہبانیت کی گنجائش ہے اور نہ ہی اسلام نکموں، بھکاریوں، کاہلوں اور دوسروں کی جیب پر نظر رکھنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

ارض و سما کی ہر چیز بہ آواز بلند ہمیں عمل کرنے کی دعوت دے رہی ہے سورج، چاند، ستارے، درخت اور جانور ہر مخلوق اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہے تو پھر اشرف المخلوقات ہی کیوں نکمی بیٹھی رہے، لیکن اگر مخلوق کی زبان ہمارے لئے باعثِ عمل نہ ہو تو قرآنِ کریم میں واضح احکام اور مفید نصیحتیں ہیں جو یقیناً ہر مسلمان کے لئے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہیں، سورۂ جمعہ میں ہے ''پھر جب نماز پوری ہو چکے تو زمین پر چلو پھرو اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔'' (سورۃ الجمعة : ۱۰)

کسبِ حلال اور روزی کمانے کو حق تعالیٰ نے اپنے فضل کی تلاش قرار دیا ہے، بعض مشائخ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ نمازِ جمعہ ادا کرنے کے بعد مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے اور باری تعالیٰ سے دعاء کرتے ''میں نے نمازِ جمعہ ادا کر لی اور اب میں

قرآنی حکم کے مطابق آپ کے فضل کی تلاش میں جارہا ہوں آپ میری کوشش میں برکت عطا فرمائیں۔"

قرآن کریم کے علاوہ متعدد احادیث میں کسبِ حلال اور مختلف پیشوں یعنی محنت مزدوری، صنعت وتجارت اور زراعت کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "انسان اپنے ہاتھوں سے جو کچھ کما کر کھاتا ہے اس سے بہتر کوئی کھانا نہیں اور اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں کی کمائی سے کھاتے تھے۔

(بخاري : ٢٠٧٢)

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ کی روایت سے نقل کی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے زمانۂ حکومت میں بھیس بدل کر بازار وغیرہ میں جاتے تھے اور مختلف اطراف سے آنے والوں سے پوچھا کرتے تھے کہ داؤد کیسا حکمران ہے؟ سب لوگ اس سوال کے جواب میں تعریفی کلمات کہتے تھے، حق تعالیٰ نے ان کی تعلیم کے لئے ایک سوال کیا، فرشتے نے عدل وانصاف اور رعیت کی خدمت اور حفاظت کے حوالے سے بہت تعریف کی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ داؤد میں ایک عادت ایسی ہے کہ وہ نہ ہوتی تو وہ بالکل کامل ہوتا، داؤد علیہ السلام نے پوچھا وہ کیا عادت؟ فرشتے نے کہا کہ وہ اپنا اور اپنے اہل وعیال کا گزارہ مسلمانوں کے مال یعنی بیت المال سے لیتے ہیں۔

یہ سن کر حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے انتہائی گریہ وزاری کے ساتھ دعاء کی کہ مجھے کوئی ایسا کام سکھا دیجئے جو میں اپنے ہاتھوں سے کرسکوں اور اس کی کمائی سے اپنے اور اہل وعیال کے اخراجات پورے کرسکوں، ان کی دعاء قبول ہوئی اور انہیں زرہ سازی کی صنعت سکھادی گئی اور معجزانہ طریقے سے ان کے لئے لوہے کو نرم کردیا گیا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے علاوہ دوسرے کئی انبیاء کے بارے میں بھی احادیث میں آیا ہے کہ انہوں نے اپنی معاشی ضروریات کے لئے مختلف جائز پیشے اختیار کر رکھے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن پیشوں کے فضائل بیان فرمائے ہیں ان میں سے ایک زراعت بھی ہے، آپ نے فرمایا ''جو مسلمان درخت لگاتا یا کھیتی باڑی کرتا ہے اور اس سے چرند پرند اور انسان اپنی غذا حاصل کرتے ہیں تو یہ سب اس کے لئے صدقہ بن جاتا ہے۔'' (مسلم: ۱۵۵۳)

اس فرمانِ نبوی سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ کاشت کار کو صرف فصلِ زراعت کی وجہ سے ثواب ملتا ہے خواہ اس کی نیت حصولِ ثواب کی ہو یا نہ ہو کیونکہ زراعت سے بہتر صورت مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچتا ہے خواہ کاشتکار فائدہ پہنچانا چاہے یا نہ چاہے، دراصل اسلام کی نظر میں اصل نیکی اللہ کی مخلوق کو فائدہ پہنچانا ہے جس کام سے انسانوں کو جتنی زیادہ راحت نصیب ہوگی اس کا کرنے والا اتنا ہی زیادہ اجر و ثواب کا مستحق ہوگا، زراعت میں چونکہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا پہلو زیادہ نمایاں ہے اس لئے اس کی فضیلت بھی زیادہ ہے۔ تجارت کے بارے میں آپ نے فرمایا ''پوری سچائی اور ایمانداری کے ساتھ کاروبار کرنے والا تاجر نبیوں، صدیقوں اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔''

صنعت کار کے بارے میں فرمایا: ''اللہ تعالیٰ صنعت و حرفت والے مؤمن کو دوست رکھتا ہے۔'' (ترمذي: ۱۲۰٦)

ایک موقع پر صحابہ کرام مسجد نبوی کی تعمیر میں مصروف تھے، ایک صحابی جن کا تعلق حضر موت سے تھا وہ بڑے سلیقے سے مٹی گوندھ رہے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوئے اور فرمایا ''خدا اس پر رحمت فرمائے جو کسی صنعت میں کمال پیدا کرے، پھر اس شخص سے فرمایا تم اس کام میں لگے رہو کیونکہ مجھے نظر آتا ہے کہ تم اسے عمدگی سے کرتے ہو۔''

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ان تمام افراد کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جو حصولِ رزق کے ساتھ انسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑا احسان ہے کہ آپ نے محنت سے نفرت کو جرم بتایا اور رزقِ حلال کے لئے ہر طرح کی محنت اور مزدوری کو قربِ الٰہی کا سبب بتایا، آپ نے محنت کش کا مرتبہ اتنا بلند کردیا کہ نفلی عبادت کرنے والے اس کی قسمت پر رشک کرنے لگے۔

اسد الغابہ میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کیا تو ان کی ہتھیلی کچھ کھردری اور داغدار نظر آئی آپ نے دریافت فرمایا یہ داغ کیسے ہیں؟ عرض کیا یارسول اللہ! میں نعل بندی کا کام کرتا ہوں اور اسی سے اپنے اہل و عیال کی کفالت کرتا ہوں، یہ سن کر آپ نے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور فرمایا ''یہ وہ ہاتھ ہے جسے آگ نہیں چھوسکتی''۔ میرے آقا نے مزدوروں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ خود بھی کبھی محنت مزدوری سے عار محسوس نہیں فرمائی، وہ منظر آپ کو ضرور یاد ہوگا جب مسجد نبوی کی تعمیر ہورہی تھی اور صحابہ کرام جوش و خروش کے ساتھ پتھر اور گارا اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے تو اس سارے عمل میں ہمارے آقا بھی شریک تھے۔

بندوں سے اللہ تعالیٰ کی محبت

سورۂ توبہ کی آیت ۲۴ کا مفہوم ہے: ''آپ فرمادیجئے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری عورتیں اور تمہارا خاندان اور تمہارا کمایا ہوا مال اور وہ تجارت جس کے نقصان کا تمہیں ڈر ہے اور تمہارے پسندیدہ مکان یعنی ان سب چیزوں سے تم اللہ اور اس کے رسول کے لئے جہاد کرنے کی نسبت زیادہ محبت رکھتے ہو تو یہاں تک انتظار کرو کہ اللہ اپنا حکم صادر فرمائے اور اللہ فاسق قوم کو راہِ ہدایت نہیں دکھاتا۔''

اس آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان کو سب سے زیادہ محبت اللہ اور اس کے رسول سے ہونی چاہئے، حدیث میں بھی یہ مضمون آیا ہے کہ کسی شخص کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنی اولاد اپنے والد اور سارے انسانوں سے زیادہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت نہ رکھے۔

بعض لوگوں کو اشکال ہوتا ہے کہ بسا اوقات ہمیں اپنے اہل وعیال اور بھائی بہنوں سے زیادہ محبت ہوتی ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارا ایمان، کامل نہیں ہے۔ اہلِ علم نے اس اشکال کا جواب یہ دیا ہے کہ محبت کی تین قسمیں ہیں، طبعی، عقلی اور عشقی۔ طبعی محبت مادی محبت ہے جیسے ماں باپ کو اولاد سے یا اولاد کو ماں باپ سے اور رشتہ داروں کی آپس میں ہوتی ہے۔

عقلی محبت اسے ہم ایمانی محبت بھی کہہ سکتے ہیں جس کا ذکر قرآن اور حدیث میں آیا ہے، اللہ اور رسول کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے وہ عقلی محبت ہوتی ہے اس لئے کہ وہ دلیل اور برہان پر مبنی ہوتی ہے۔

اسی عقلی محبت کی جب مشق کی جائے اور اسے بڑھایا جائے تو وہ عشق کے درجہ میں آجاتی ہے، طبعی محبت میں ارادے اور اختیار کا دخل نہیں ہوتا، انسان خواہ مخواہ اس پر مجبور ہوتا

ہے لیکن عقلی محبت اختیاری ہے بایں معنیٰ کہ اس کے اسباب اختیاری ہیں، جب وہ اسباب اختیار کئے جائیں گے تو وہ محبت پیدا ہو جائے گی، یہی وجہ ہے کہ ریاضت اور مجاہدہ کرنے والوں کی محبت بڑھتے بڑھتے عشق کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ اس تفصیل سے مذکورہ اشکال کا جواب بھی سمجھ میں آ گیا کہ اگر اولاد وغیرہ سے طبعی محبت زیادہ ہو تو یہ ایمان کے منافی نہیں البتہ عقلی اور ایمانی محبت، سب سے زیادہ اللہ اور اس کے رسول سے ہونی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے جو محبت کرتے ہیں اس کا تقاضا بھی یہ ہے کہ بندے سب سے زیادہ محبت اللہ ہی سے رکھیں، بندوں سے اللہ تعالیٰ کی محبت کو سمجھنے کے لئے درج ذیل احادیث کا مطالعہ مفید ہوگا:

- صحیح بخاری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ قیدی آئے ان میں سے ایک قیدی عورت دوڑتی پھر رہی تھی جب وہ کسی بچے کو دیکھتی تو اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیتی اور دودھ پلانے لگتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے کیا یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے؟ ہم نے عرض کیا خدا کی قسم نہیں، آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے زیادہ رحم کرنے والا ہے جتنا رحم یہ عورت اپنے بچے پر کرتی ہے۔ (بخاري)
- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جو شخص میرے کسی دوست سے دشمنی رکھتا ہے، میری طرف سے اس کے لئے اعلانِ جنگ ہے اور میرے بندے کا میرے نافذ کردہ فرائض کے ذریعے میرا قرب حاصل کرنا مجھے باقی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہے (علاوہ ازیں) میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں

جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، وہ مجھ سے کوئی سوال کرتا ہے تو میں اسے دیتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ مانگے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں۔

(بخاری)

اس حدیث میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن سے اللہ محبت کرتا ہے اور جن کے دشمنوں سے وہ اعلانِ جنگ کرتا ہے، اللہ کا محبوب بننے میں سب سے زیادہ دخل فرائض کی ادائیگی کو ہے، پھر نوافل انسان کو اللہ کے بہت قریب کر دیتے ہیں، جب فرائض اور نوافل کے ادا کرنے سے اللہ کے بہت قریب کر دیتے ہیں جب فرائض اور نوافل کے ادا کرنے سے اللہ کی محبت انسان کے رگ و ریشہ میں سما جاتی ہے تو پھر وہ ہی بات سنتا، وہی کچھ دیکھتا، وہی چیز پکڑتا اور اسی مقام کی طرف چل کر جاتا ہے جس میں اللہ کی رضا ہوتی ہے۔

● حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے جو رحمت پیدا فرمائی ہے اس کے سو حصے کیے ہیں، ننانوے حصے اپنے پاس روک لئے اور ایک حصہ اس دنیا میں اتارا ہے جس کی وجہ سے لوگ آپس میں ایک دوسرے پر رحم اور شفقت کا معاملہ کرتے ہیں حتیٰ کہ گھوڑی اپنے بچے کو بچانے کے لئے پاؤں اٹھا لیتی ہے (تو یہ بھی اسی رحمت کی وجہ سے ہے)

(بخاری و مسلم)

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصوں میں سے ایک حصہ جو اس دنیا میں اتارا ہے اسی کا اثر انسانوں اور حیوانوں سب میں ظاہر ہو رہا ہے کہ والدین کی اولاد سے اور اولاد کی والدین سے محبت، اسی طرح جانوروں کا اپنی اولاد پر ترس کھانا اسی رحمت کی وجہ سے ہے، قیامت کے دن رحمٰن و رحیم کی رحمت کے ننانوے حصوں کا ظہور ہوگا، گناہ گاروں کی بخشش ہوگی، اہلِ

ایمان کو جنت میں اعلیٰ مقامات سے نوازا جائے گا۔ بندوں سے اللہ تعالیٰ کی محبت کے ہزاروں کرشمے ہیں جو ہم دن رات دیکھتے ہیں، انسان کی تخلیق، اعضاء کی درستگی، عقل کا نور، جسم کا عجیب وغریب نظام، ماں کے دل میں محبت سے دھڑکتا دل، سینے میں صاف اور شیریں دودھ کا چشمہ، یہ عالمِ رنگ و بو، زمین کا فرش، نیلے آسمان کی چھت، ہوا کی لہریں، سورج کی کرنیں، چشموں کی روانی، دریا کی موجیں، چہچہاتے رنگ برنگ پرندے، چٹکتے پھول، انواع واقسام کے پھل، کھانے پینے کی بے شمار چیزیں، تلاوت اور تدبر اور دستورِ زندگی کے لئے کتابِ ہدایت۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت، کعبہ کی تجلی، روضۂ نبوی کی کشش، عبادات کا پورا نظام، گناہوں کا انبار لگا کر توجہ کرنے والوں کے لئے مغفرت کا اعلان، "لاتقنطوا" کی بشارت، ایک نیکی پر سات سو بلکہ اس سے بھی زیادہ نیکیوں کا وعدہ......

یہ سب کچھ کیوں ہے؟ صرف اسی لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے جیسے اس کی دوسری صفات کی کوئی حد نہیں اسی کی محبت کی بھی کوئی حد نہیں، اس کے سارے اسماء و صفات اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اسے اپنے بندوں سے محبت ہے، اس کا رحمٰن، رحیم، غفار، رزاق اور توّاب ہونا تو اس کی محبت کو ظاہر کرتا ہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس کا جبار اور قہار ہونا بھی اس کی محبت ہی کا ایک خوبصورت عنوان ہے۔ جبار کا معنیٰ ہے ٹوٹی ہوئی چیزوں کو جوڑنے والا اور قہار کا معنیٰ ہے غالب، اسے جبار کہا جاتا ہے کہ ٹوٹے دلوں کو جوڑتا اور بندوں کے بگڑے ہوئے احوال کو درست کرتا ہے اور وہ قہار ہے کیونکہ وہ غالب ہے اور جن وانسان فرشتے اور ساری کائنات اسی کے سامنے مغلوب ہے۔

شرحِ صدر

سورۂ زمر کی آیت ۲۲ میں اللہ تعالیٰ نے سوال کیا ہے: ’’کیا جس کے سینے کو اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا پس وہ اپنے رب کے نور پر ہے؟‘‘

یہ حقیقت میں سوال کا ایک جزء ہے سوال کا دوسرا جزء اور جواب حذف کر دیا گیا ہے، قرآن مجید کا یہ اسلوب ہے کہ وہ اپنے قارئین اور سامعین کو متوجہ اور چوکنا رکھنے کے لیے سوال کر دیتا ہے مگر اس کا جواب ذکر نہیں کرتا تاکہ پڑھنے اور سننے والے غور و تدبر کر کے خود جواب معلوم کریں۔ یہاں اگر سوال کا دوسرا حصہ ذکر کیا جائے تو پوری عبارت یہ بنتی ہے ’’کیا جس کے سینے کو اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا پس وہ اپنے رب کے نور پر ہے، اس کی طرح ہوسکتا ہے جس کا دل سخت کر دیا گیا جس کی وجہ سے وہ ظلمت میں رہے‘‘ ظاہر ہے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ’’یہ دونوں ہرگز برابر نہیں ہوسکتے‘‘ یہ جواب ہمیں اسی آیت کریمہ کے دوسرے حصہ سے معلوم ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن سوال کرنے کے بعد کہتا ہے ’’پس ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جن کے دل اللہ کے ذکر سے سخت ہوگئے یہ لوگ واضح گمراہی میں ہیں۔‘‘

شرحِ صدر (سینہ کھل جانے) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کسی کے دل میں، ایمان، معرفت اور حکمت ڈال دے، جسے شرحِ صدر کی نعمت نصیب ہو جائے اس کے لیے ایمانی تقاضوں کو پورا کرنا اور خلافِ ایمان زندگی سے بچنا آسان ہو جاتا ہے، وہ مشکلات اور مصائب کے ہجوم میں بھی پوری استقامت کے ساتھ ہدایت کی راہ پر گامزن رہتا ہے، غیروں کے طعنے اور اپنوں کی مخالفت اسے جادۂ حق سے نہیں ہٹا سکتی۔

شرحِ صدر سات نہتے نوجوانوں کو عطا ہو جائے تو وہ مادیت کی چمک دمک سے جگمگ

کرتے دربار میں کھڑے ہوکر کہہ دیتے ہیں "ہمارا رب وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے ہم اس کے سوا کسی معبود کو نہیں پکاریں گے۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو یہ سخت زیادتی کی بات ہوگی" پھر ان نوجوانوں کو غار میں پناہ دے کر "اصحابِ کہف" کے نام سے شہرت دے دی جاتی ہے۔ (سورة الكهف : ١٤)

شرحِ صدر کی دولت حضرت بلال، حضرت عمار، حضرت یاسر، حضرت سمیہ، حضرت خباب، حضرت خبیب، حضرت نہدیہ رضی اللہ عنہم جیسے ضعیفوں، غریبوں، بیکسوں، غلاموں اور لونڈیوں کو مل جائے تو وہ برستے کوڑوں، دہکتی آگ، تپتی ریت اور بھاری چٹانوں کی پرواہ کیے بغیر "لا الہ الا اللہ" کا نعرہ بلند کرتے جاتے ہیں۔

جس کا سینہ اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت کے لیے کھول دیا جائے اسے ایمان میں حلاوت نصیب ہوتی ہے، اسے رضاءِ الٰہی کی خاطر بھوکا پیاسا رہنے، مال ودولت خرچ کرنے اور جسم وجان کی قربانی دینے میں مزہ آتا ہے، وہ ایمان کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوجاتا ہے، شرحِ صدر ہدایت کی دلیل ہے تو سینے کی تنگی گمراہی اور رب کی ناراضگی کی علامت ہے، اللہ کا عذاب صرف پتھروں کی بارش سیلاب اور صورتوں کے مسخ ہونے کی شکل میں نہیں آتا، اس کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں، دل کی قساوت اور سختی بھی اللہ کے عذاب کی ایک شکل ہے، بنی اسرائیل اس عذاب میں بھی مبتلا ہوئے تھے، سورۂ مائدہ کی آیت ۱۳ میں ہے "ان کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت کردیا۔"

جب یہود کے دل سخت ہوگئے تو ان کے لیے قتلِ انبیاء، سود خوری اور اللہ کے کلام میں تحریف سمیت ہر گناہ آسان ہوگیا۔

سورۂ بقرہ کی آیت میں بھی ان کی قساوتِ قلبی کا ذکر کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: "پھر

تمہارے دل سخت ہو گئے پس وہ پتھروں کی طرح ہیں بلکہ پتھروں سے زیادہ سخت، بیشک بعض پتھر ایسے ہیں جن سے نہریں پھوٹ پڑتی ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ وہ پھٹتے ہیں تو ان سے پانی نکل آتا ہے اور بعض ایسے ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں۔" (سورة البقرة: ٧٤)

جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہے اس کے سینے کو کھول دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنا چاہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے۔ سورۂ انعام کی آیت ۱۲۵ میں ہے: "پس جسے اللہ ہدایت دینا چاہے اس کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جسے اللہ گمراہ کرنا چاہے اس کے سینے کو از حد تنگ کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے، اسی طرح اللہ گندگی ڈال دیتا ہے ان لوگوں پر جس کے سینے کو تنگ کر دیا جاتا ہے اسے اول تو ایمان قبول کرنا ہی بڑا مشکل محسوس ہوتا ہے، اسے یوں لگتا ہے گویا اسے کسی بھاری چٹان کے اٹھانے یا آسمان پر چڑھنے کا حکم دیا جا رہا ہو اور اگر بالفرض مجبوری یا دکھاوے کے لیے ایمان قبول کر ہی لے تو وہ ایمان کے تقاضے خوش دلی سے پورے نہیں کرتا، وہ نماز پڑھتا ہے تو کاہلی اور بے دلی سے، زکوۃ یوں دیتا ہے گویا جرمانہ دے رہا ہے، یوں تو شرح صدر کی ہر مسلمان کو ضرورت ہے مگر دین کے داعی اور مبلغ کے لیے شرحِ صدر سب سے زیادہ ضروری ہے، جب تک اسے اپنی دعوت کی سچائی اور اپنے مشن کی کامیابی کا یقین نہ ہو وہ دعوت کا فریضہ سرانجام نہیں دے سکتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اس بادشاہ کے دربار میں تبلیغِ حق کے لیے جا رہے تھے جسے اپنے اقتدار اور وسائل و اسباب پر اتنا گھمنڈ تھا کہ وہ ربوبیت کا دعویٰ کرنے سے بھی باز نہیں آتا تھا تو آپ نے اللہ سے شرحِ صدر کی دعاء کی تھی، سورۂ طٰہٰ میں ہے "اے میرے رب! میرا سینہ کھول دے اور میرے لیے میرا معاملہ آسان فرما دے اور میری زبان کی گرہ دور فرما دے تا کہ وہ میری بات سمجھ سکیں۔" مطلب یہ تھا کہ میرے دل کو ایسا مضبوط بنا دے

کہ میں فرعون کی شان وشوکت سے مرعوب نہ ہوں اور اس کی احمقانہ باتیں سن کر سیخ پا نہ ہو جاؤں۔

شرحِ صدر کی یہ نعمت ہمارے آقا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عطا کی گئی مگر آپ میں اور موسیٰ علیہ السلام میں فرق یہ ہے کہ جناب کلیم اللہ علیہ السلام نے شرحِ صدر کی دعاء کی تھی جبکہ ہمارے آقا کو بن مانگے یہ نعمت عطا کر دی گئی اور فرمایا گیا: ''کیا ہم نے آپ کے سینے کو کھول نہیں دیا'' تفسیر بیضاوی کے حاشیہ میں ہے کہ ''جیسا شرحِ صدر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوا ایسا شرحِ صدر جہانوں میں سے کسی کا نہیں ہوا۔ آپ کے شرحِ صدر کا تو یہ عالم تھا کہ اس میں اولین اور آخرین کے علوم سما گئے۔''

عرب کا ذرّہ ذرّہ آپ کے خون کا پیاسا اور ہر طاقتور سردار اور قبیلہ آپ کا مخالف تھا، بت پرستی کے لق و دق صحراء میں اکیلا اللہ کا نبی توحید کی دعوت دینے والا تھا مگر نہ تو آپ خوفزدہ ہوئے نہ کسی سے مرعوب ہوئے، اپنی دعوت کی سچائی اور کامیابی کا آپ کو اس قدر یقین تھا کہ جب پشتیبانی کرنے والے چچا نے قریش کی دھمکیوں سے ڈر کر دستِ تعاون کھینچنا چاہا تو آپ نے چچا کی زبان سے سردارانِ مکہ کی ترغیبات اور ترہیبات سننے کے بعد فرمایا ''اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں پر چاند بھی رکھ دیں تو بھی اس دعوت سے باز آنے والا نہیں ہوں یہاں تک کہ اللہ اس دین کو غالب کر دے یا پھر اس کی خاطر میری جان قبول فرمالے۔''

آج کے ماحول میں جب کہ دلوں میں شکوک وشبہات کی فصل اگانے کی ہر طرف سے کوشش ہو رہی ہے۔ ہر مسلمان مرد اور عورت کو تسلسل کے ساتھ شرحِ صدر کی دعاء کرنی چاہیے۔

اُخوتِ ایمانی کا تقاضا

اللہ تعالیٰ کی کتاب سارے مومنوں کو آپس میں بھائی بھائی قرار دیتی ہے سورۂ حجرات میں ہے: ''بیشک مومن آپس میں بھائی ہیں تو اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرادو۔''

(سورة الحجرات : ١٠)

ہر وہ شخص جو کافر اور مشرک ہو جب وہ ایمان قبول کرلے تو سابقہ مسلمانوں کا بھائی بن جاتا ہے اگرچہ اس کا حسب نسب، قوم قبیلہ، وطن اور زبان ان سے مختلف بھی کیوں نہ ہو، سورۂ توبہ میں ہے۔ ''پس اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔'' (سورة التوبة : ١١)

ایسا کافر غلام جس کا نام ونسب معلوم نہ ہو وہ بھی قبولِ اسلام کے بعد اسلامی برادری میں داخل ہو جاتا ہے، گویا اس کے ساتھ رشتۂ اخوت قائم کرنے کے لیے اس کے نام ونسب کا کھوج لگانے کی ضرورت نہیں، سورۂ احزاب میں ہے۔ ''تو اگر تم ان کے باپوں کے نام نہ جانو تو وہ تمہارے دینی بھائی اور دوست ہیں۔'' (سورة الأحزاب : ٥)

جب اہلِ یمان میں باہم رشتۂ اخوت، وگا تو محبت بھی ہوگی، ایک دوسرے کے دکھ درد کا احساس بھی ہوگا، نبوت کی سچی زبان نے بتایا ہے کہ کسی مسلمان کا اس وقت تک ایمان کامل نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی سے محبت نہ کرے اور اس کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے، نفرت کرنے سے ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے، حسد کی وجہ سے نیکیوں کا خرمن جل جاتا ہے، تحقیر اور تمسخر کی وجہ سے رب کا غضب نازل ہوتا ہے۔

مسلمان کی پردہ دری اور اسے بے آبرو کرنے کا نتیجہ آخرت میں بے آبرو ہونے کی صورت میں نکلے گا، مسلمان کو بے یار و مددگار چھوڑنے والوں کو اللہ تعالیٰ بے یار و مددگار

چھوڑ دیتا ہے، کانٹا ایک مسلمان کے پاؤں میں چبھے اس کی چبھن دوسرے مسلمان محسوس کرتے ہیں، زخم ایک کے جسم پر لگتا ہے اس کی تکلیف دوسروں کو ہوتی ہے۔ کفار کے ظلم وستم کا نشانہ ایک بنتا ہے، آنسو دوسروں کے بہتے ہیں۔ صحیح بخاری اور مسلم میں روایت ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم مسلمانوں کو آپس میں رحم کرنے، محبت کرنے اور ایک دوسرے کی طرف جھکنے میں ایسا دیکھو گے جیسا کہ جسم کا حال ہوتا ہے کہ اگر ایک عضو کو کوئی بیماری لاحق ہوتی ہے تو جسم کے بقیہ اعضاء بے خوابی اور بخار کے ساتھ اس کا ساتھ دیتے ہیں۔'' (مسلم: ٢٥٨٦، بخاري: ٦٠١١)

آج جب کہ امتِ مسلمہ حوادث کی زد میں ہے۔ دنیا بھر کا کفر ''ملتِ واحدہ'' بن کر اس کے خلاف متحدہ ہو چکا ہے، کچھ ممالک عملی طور پر مسلمانوں پر ستم ڈھانے میں مصروف ہیں اور باقی ''ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم'' کا منظر پیش کر رہے ہیں، امت کے ہر فرد پر لازم ہے کہ وہ مذکورہ بالا حدیث کی روشنی میں اپنے رویے، اَخلاق اور قلبی کیفیات کا جائزہ لے، کیا واقعی ہم اپنے مسلمان بھائیوں سے ویسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت رکھنے کی ہمیں تلقین کی گئی ہے؟ کیا واقعی دوسرے مسلمان کو دکھ درد میں دیکھ کر ہمارے سینے میں ٹیس اٹھتی ہے؟ کیا واقعی کسی ستم رسیدہ کی مظلومیت پر ہماری آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں؟

عراق سے افغانستان اور فلسطین سے لبنان تک خون کی جو ندیاں بہہ رہی ہیں، کلمہ پڑھنے والوں کے جو لاشے تڑپ رہے ہیں، کیا واقعی ان خبروں نے ہمارے لیے زندگی محال کر دی ہے؟ اگر ایسا ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجیے کہ دل میں ایمان کا چراغ روشن ہے اور اگر خدانخواستہ ایسا نہیں بلکہ عالمِ اسلام کے حکمرانوں کی طرح بے حمیتی اور بے حسی نے ہمیں اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے اور ہم ''پرائی آگ'' کی تپش کو اپنے آرام، معمولات اور عیاشی میں مخل ہونا پسند نہیں کرتے تو ہمیں اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے۔

کیا ہمارے لیے یہ عبرت کا مقام نہیں کہ اسرائیلی فوج لبنان اور فلسطین پر آتش وآہن کی جو بارش برسا رہی ہے، پوری یہودی قوم اس کی پشت پناہی کر رہی ہے، ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے یہودی خواہ وہ دنیا میں کہیں بھی رہتے ہیں اپنی اپنی بساط کے مطابق اسرائیلی فوج کی امداد کر رہے ہیں، ان میں سے مذہبی شعبہ اسرائیل بھر میں دعائیہ تقاریب کا اہتمام کر رہا ہے۔

یروشلم میں پورا دن سینکڑوں مرد وخواتین اور بچے جمع رہتے ہیں اور اپنی دعاؤں کی کتابوں سے دعائیں پڑھتے رہتے ہیں۔ یہودی خواتین اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر وہاں اور دیگر یہودی معبدوں (سیناگاگ) میں آتی ہیں اور بزعم خویش اپنا قومی فرض ادا کرتی ہیں حال ہی میں یہودیوں کے چیف ربی نے عالمی دعاء کا اہتمام کیا ہے جو مغربی دیوار کے قریب ہوگی اور جس میں ان کے بقول دنیا بھر کے لوگ جسمانی اور روحانی طور پر موجود رہ کر شرکت کریں گے۔

آیئے! ہم امت کا جائزہ لیں کہ کیا دنیا بھر کے مسلمان بھی جسمانی یا روحانی طور پر ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو عالمِ اسلام کے سب سے بڑے دشمن کے خلاف مصروفِ جنگ ہیں یا ان کی حیثیت محض ایک تماشائی کی سی ہے جو خونخوار بھینسوں میں گھیرے ہوئے ایک کمزور انسان کی جان کنی کا منظر دیکھ رہا ہے، اگر ہم اپنے اندر حق بات کہنے کا حوصلہ پاتے ہیں تو حقیقت یہی ہے کہ عالمِ اسلام کا بالا دست طبقہ بے حس تماشائی سے آگے بڑھ کر کوئی کردار ادا کرنے کے لیے تیار نہیں، عوام میں البتہ کچھ نہ کچھ ایمانی اخوت پائی جاتی ہے اور وہ بیروت اور فلسطین میں ہونے والی وحشیانہ بمباری کی دھمک اپنے دل و دماغ میں محسوس کرتے ہیں اور بے گناہ خواتین اور معصوم بچوں کی چیخیں ان کا سکون غارت کیے دیتی ہیں۔

ملکی قوانین اور سرحدوں کی زنجیر کی وجہ سے ہم لبنانی اور فلسطینی شہریوں کے شانہ بشانہ تو

نہیں لڑ سکتے البتہ گھر بیٹھے ان کی کامیابی کے لیے دعاء تو کر سکتے ہیں بالخصوص مائیں بہنیں اور بیٹیاں تو اس کے علاوہ کچھ کر ہی نہیں سکتیں۔ آیئے ہم سب بارگاہ رب العلمین میں ہاتھ اٹھا کر دعاء کریں کہ اے اللہ! تو دشمنانِ اسلام کو ہدایت دے اور اگر ہدایت ان کے مقدر میں نہیں تو انہیں نیست ونابود فرمادے۔

ہمدردی کے یہ جذبات اور بلک بلک کر دعائیں، اخوتِ ایمانی کا تقاضا بھی ہیں اور وقت کی ضرورت بھی۔

صفاتِ کامرانی

سورۂ عصر قرآن کریم کی مختصر سورت ہے جو کہ تین آیات پر مشتمل ہے لیکن معانی کا ایک جہاں اس میں پوشیدہ ہے، یوں کہہ سکتے ہیں کہ پورے قرآن کریم کا خلاصہ ان تین آیات میں بیان کر دیا گیا ہے اسی لیے بعض روایات میں آتا ہے کہ صحابہ کرام جب آپس میں ملتے تھے تو ایک دوسرے کو سورۂ عصر سناتے تھے (طبرانی عن عبداللہ بن حفص رضی اللہ عنہ)

سورۂ عصر سنانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے زندگی کا مقصد اور قرآن کا پیغام ایک دوسرے کے سامنے بیان کر دیتے تھے۔

امام شافعی رحمہ اللہ اس سورت کے بارے میں فرماتے تھے کہ اگر انسان صرف اسی سورت میں تدبر کر لیں (اور پھر اس پر عمل بھی کر لیں) تو ان کی نجات کے لیے کافی ہو جائے۔

اس سورت کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے ''عصر'' کی قسم کھا کر فرمایا ہے کہ انسان خسارے میں ہے، عصر سے مراد وقتِ عصر بھی ہوسکتا ہے گویا انسان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تمہاری زندگی، بس اتنی ہی ہے جتنا عصر اور مغرب کے درمیان وقت ہوتا ہے لہٰذا اپنے آپ کو اس تجارت میں لگا دو جس میں خسارے کا کوئی امکان نہیں۔

عصر سے نمازِ عصر بھی مراد لی گئی ہے کیونکہ نمازِ عصر کی بہت زیادہ اہمیت بیان کی گئی ہے۔ ایک حدیث میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ''جس کی نمازِ عصر فوت ہوگئی اس کے اہل وعیال اور مال و دولت سب کچھ لٹ گئے'' سورۃ البقرہ کی آیت ۲۳۸ جس میں تمام نمازوں خصوصاً درمیانی نماز کی محافظت کا حکم دیا گیا ہے تو درمیانی نماز سے اکثر علماء نے نمازِ عصر مراد لی ہے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ عصر سے مراد سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہے اس لیے کہ آپ

کا زمانہ سارے زمانوں سے بہتر زمانہ ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کی آپ کی طرف نسبت ہے خواہ وہ شہر ہو یا مسجد ہو یا انسان ہوں یا سواری اور لباس ہو وہ سب سے بہتر ہے۔

گزرا ہوا وقت ہاتھ نہیں آتا، زندگی سے جنت کے پھل اور پھول بھی خریدے جا سکتے ہیں اور دوزخ کے انگارے اور سانپ اور بچھو بھی۔ اس کے صحیح استعمال سے اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے اور غلط استعمال سے اللہ کا غضب نازل ہوتا ہے، جو شخص زندگی صراطِ مستقیم پر چلتے ہوئے گزار دے وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور جو ٹیڑھے میڑھے راستوں پر چلتا رہے وہ خسارے میں رہتا ہے۔

عصر کے بارے میں آخری قول یہ ہے کہ اس سے زمانہ اور تاریخ مراد ہے، اللہ تعالیٰ پوری تاریخِ انسانی کی قسم کھا کر اور گویا اسے گواہ بنا کر کہتے ہیں کہ گزشتہ اقوام میں سے جنھوں نے کامیابی والی چار صفات اپنے اندر پیدا کر لیں انہیں عروج ملا اور ظاہری اور باطنی ترقیات نے ان کی قدم بوسی کی مگر جن قوموں نے ان صفات سے اپنے آپ کو محروم رکھا وہ ظاہری شان و شوکت اور مادی چکا چوند کے باوجود خسارے ہی میں رہیں۔

ان صفات میں سے پہلی صفت ایمان ہے یعنی انسان کی آئیڈیالوجی، نظریہ اور عقیدہ درست ہو وہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر، اس کی آیات و احکام پر، اس کے انبیاء اور ملائکہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو۔ ایمان کے بغیر عمل کا کوئی فائدہ نہیں، اعمال کے صحیح اور قبول ہونے کے لیے ایمان بنیادی شرط ہے۔

دوسری صفت عملِ صالح ہے جو کہ حقیقت میں ایمان کا لازمی تقاضا ہے، جس کے دل کی گہرائی میں ایمان کا پودا جڑ پکڑ چکا ہو اسے نیک اعمال کی توفیق مل ہی جاتی ہے، جس پودے کی جڑ جتنی مضبوط اور مٹی جتنی زرخیز ہو وہ پودا اتنا ہی سرسبز اور بارآور ہوتا ہے، جو شخص مومن ہونے کا دعویٰ کرتا ہے مگر نہ تو اس کے اعمال اچھے ہوتے ہیں اور نہ ہی اخلاق پاکیزہ

ہوتے ہیں اسے جان لینا چاہئے کہ ایمان کی جڑیں دل میں پیوست نہیں ہوئیں۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ صرف نماز روزہ ہی عمل صالح نہیں بلکہ ہر وہ نیک اور جائز عمل جو اللہ کی رضا کی نیت سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق کیا جائے وہ عملِ صالح ہے، اچھے اخلاق، انسانیت کی ہمدردی، کسبِ حلال، بیمار پرسی، امتِ مسلمہ کی فکر، اہلِ خانہ، والدین اور قرابت داروں کے ساتھ حسنِ سلوک یہ سب اعمالِ صالحہ میں شمار ہوتے ہیں۔ کامرانی کی تیسری صفت اور فلاح کا تیسرا اصول یہ ہے کہ ایک دوسرے کو حق کی تلقین کی جائے، نیکی کی ترغیب دی جائے اور برائی سے روکا جائے۔

اصل میں اسلام اجتماعیت کا علمبردار ہے۔ اجتماعیت تبھی قائم رہ سکتی ہے جب ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوجائے، محبت اور حکمت کے ساتھ ایک دوسرے کو اپنی اصلاح کی طرف متوجہ کیا جائے۔ عبادت واطاعت اور نہی عن المنکر کا ترک کردینا ایسا گناہ ہے کہ اس کی وجہ سے افراد اور جماعتیں اللہ کی لعنت اور غضب کا مستحق بن جاتی ہیں، سورۂ مائدہ میں بنی اسرائیل کے لعنتی ہونے کے اسباب میں سے ایک سبب آیت ۷۹ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو گناہوں سے نہیں روکتے تھے۔

جب دعوت وتبلیغ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ چھوڑ دیا جاتا ہے تو اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے اور یہ عذاب صرف گناہ گاروں تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ نیکوکار بھی اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں جو اپنے گردوپیش بلکہ اپنے گھر میں بھی گناہوں کی آگ جلتے ہوئے دیکھتے ہیں مگر اسے بجھانے کی کوشش نہیں کرتے، ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ”نیکی کا حکم دیتے رہو اور برائی سے روکتے رہو ورنہ ایسا ہوگا کہ تم دعائیں کروگے مگر تمہاری دعائیں قبول نہیں ہوں گی۔“ (ترمذي: ۲۲۵۷)

کامیابی سے ہمکنار ہونے والوں کی چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو صبر تلقین

کرتے ہیں، دعوت وتبلیغ کا راستہ مجاہدے کا راستہ ہے، اس راستے پر چلنے والوں کو بعض اوقات مشکلات اور مخالفتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے، مال اور جان کی قربانی بھی دینی پڑتی ہے، جس شخص کے اندر صبر کی صفت نہ ہو وہ اس راستے پر نہیں چل سکتا، اس لیے فرمایا گیا کہ فلاح اور کامیابی کا عزم رکھنے والے نہ صرف یہ کہ خود صبر کرتے ہیں بلکہ اپنے ہم سفر ساتھیوں کو بھی ابتلاؤں اور مصائب میں صبر کی وصیت اور تاکید کرتے رہتے ہیں۔

آخر میں سورۂ عصر کا مفہوم بھی سن لیجئے ''زمانے کی قسم! بے شک انسان خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جو نیک عمل کرتے ہیں، ایک دوسرے کو حق کی اور صبر کی تلقین کرتے ہیں۔''

جھوٹ کی تین قسمیں

عربی زبان میں دو لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ایک کذب، دوسرا تکذیب، کذب کا معنی جھوٹ بولنا اور تکذیب کا معنی ہے جھٹلانا یا دوسرے کو جھوٹا بتانا، قرآن کریم میں کذب کے مقابلے میں تکذیب کا ذکر زیادہ ہے، کفار اور مشرکین میں تکذیب کی بیماری پائی جاتی تھی، وہ جھٹلاتے تھے اللہ تعالیٰ کے کلام کو، اللہ کے نبیوں کو، قیامت کے دن کو، حقیقت اور سچائی کو۔ اس امر میں کسی مومن کو شک ہی کیسے ہوسکتا ہے کہ تکذیب اور کذب دونوں بدترین جرم ہیں۔دونوں میں فرق یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب تو بلاتاخیر کفر ہے البتہ کذب کی ہر صورت کو کفر نہیں کہا جاسکتا۔اہلِ علم نے کذب کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔

پہلی قسم ہے: کذب علی اللہ یعنی اللہ پر جھوٹ بولنا، مشرکین اور یہود ونصاریٰ کے متعدد ایسے نظریات اور اقوال پیش کیے جاسکتے ہیں جن کی بنیاد ''کذب علی اللہ'' پر تھی یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف کسی ایسی بات کی نسبت کردیتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے ارشاد نہیں فرمائی تھی، مثال کے طور پر یہود کو جب ایمان قبول کرنے کی دعوت دی جاتی تو وہ یہ کہتے کہ ''ہم سے اللہ نے یہ عہد لیا ہے کہ ہم کسی رسول پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک کہ وہ ایسی نذر ہمارے سامنے پیش نہ کردے جسے آسمانی آگ کھا جائے۔'' (سورۃ اٰلِ عمران : ۱۸۲)

ظاہر ہے یہ محض کٹ حجتی اور اللہ تعالیٰ پر بہتان تراشی تھی، ان میں اس قسم کا کوئی عہد نہیں لیا گیا تھا چناں چہ ان سے الزامی طور پر سوال کیا گیا کہ مجھ سے پہلے کئی رسول واضح دلائل کے ساتھ اور تمہارے مطلوبہ معجزہ کے ساتھ آچکے ہیں۔آخر تم ان پر ایمان کیوں نہیں لائے، اگر تمہارے ایمان لانے میں بڑی رکاوٹ ایسی نذر اور قربانی کا پیش نہ کرنا ہے جسے خلافِ عادت آسمان سے اترنے والی آگ کھا جائے تو پھر ان انبیاء پر تمہیں ضرور ایمان لانا

چاہیے تھا جنہوں نے یہ معجزہ تمہیں دکھایا تھا۔ اسی طرح سورہ آل عمران کی آیت: ۷۵ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بعض اہلِ کتاب، عربوں کا پیسہ ناجائز طریقے سے ہڑپ کر جاتے تھے، جب ان سے کہا جاتا کہ اس طرح کیوں کرتے ہو تو وہ جواب میں کہتے کہ ان پڑھ لوگوں کا مال دبا لینے سے کوئی گناہ نہیں ہوتا گویا اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا کرنے کی اجازت دے رکھی ہے، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''وہ جانتے بوجھتے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہیں۔''

جھوٹ کی دوسری قسم ہے: ''كذب على الرسول'' یعنی اللہ کے رسول پر جھوٹ بولنا، کل بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی اور آج بھی اس قسم کے لوگ بے شمار ہیں جو اپنے ذاتی خیالات ونظریات یا اِدھر اُدھر سے سنی ہوئی باتوں کی نسبت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بلا جھجک کر دیتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ بعض واعظ اور خطیب حضرات برسرِ منبر اس قسم کی غلط بیانی کے مرتکب ہوتے ہیں، وہ بزرگوں کے اقوال اور افواہوں کو احادیث کے طور پر پیش کر دیتے ہیں۔ بلا شبہ ان میں سے بعض اقوال بڑے عبرت افروز اور نصیحت آموز ہوتے ہیں، لیکن کسی بھی قول یا عمل کو خواہ وہ کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث یا سنت قرار دینا اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کا ارتکاب کرنے والے کو دوزخ کی وعید سنائی گئی ہے۔ ترمذی میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولتا ہے، اِسے چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے۔'' (بخاري: ۱۲۹۱)

جھوٹ کی تیسری قسم: انسانوں کا آپس میں جھوٹ بولنا، اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ عمل میں جھوٹ، یعنی انسان کا عمل اس کے قول کی تصدیق نہ کرے، وہ زبان سے کچھ کہے جب کہ اس کا عمل کسی اور بات کی چغلی کھاتا ہو، اسی طرح اس کا باطن بھی ظاہر کے مطابق نہ ہو،

منافقت اسی کو کہتے ہیں، سورہ منافقون میں اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

''منافق جب آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔'' ظاہر ہے منافقوں کا یہ کہنا حقیقت اور واقعے کے مطابق تھا، لیکن چوں کہ ان کا یہ اقرار نہ تو قلبی نظریات کے مطابق تھا اور نہ ہی ان کا عمل ان کی اقرار کی گواہی دیتا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اللہ خوب جانتا ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، لیکن ساتھ ہی اللہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹ بولتے ہیں۔'' (سورة المنافقون : ۱)

آپس میں جھوٹ بولنے کی دوسری قسم قول میں جھوٹ بولنا جو کہ مسلمان کی شان سے بہت بعید ہے، ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹ بولنے کو منافق کی نشانی بتایا ہے، جھوٹ اور جھوٹے کی مذمت کے بارے میں آپ نے جو کچھ فرمایا ہے، اس میں سے چند ارشادات درجِ ذیل ہیں:

☆ ابوداؤد میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں اس شخص کو جنت کے وسط میں جنت کی ضمانت دیتا ہوں جو کسی صورت بھی جھوٹ نہیں بولتا، خواہ مذاق میں ہی کیوں نہ ہو۔'' (ابو داؤد : ٤٨٠٠)

☆ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اگر تاجر (بائع و مشتری) سچ بولیں اور عیب واضح طور پر بیان کردیں تو ان کی تجارت میں برکت دی جائے گی اور اگر وہ عیب چھپائیں اور جھوٹ بولیں تو ان کی تجارت میں برکت ختم کردی جائے گی۔''

☆ صحیح بخاری میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم پر لازم ہے کہ سچ بولو کیوں کہ سچ نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور نیکی جنت تک پہنچا دیتی ہے۔ انسان سچ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ کے ہاں اللہ کا ''صدیق''

لکھ دیا جاتا ہے اور تم پر لازم ہے کہ جھوٹ سے بچ کر رہو کیوں کہ جھوٹ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور فجور تک لے جاتا ہے۔ اور فجور دوزخ میں پہنچا دیتا ہے، انسان جھوٹ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ کے ہاں اسے ''کذاب'' لکھ دیا جاتا ہے۔'' (مسلم : ٢٦٠٧)

☆ بعض لوگ ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے ابوداؤد کی حدیث میں تین بار فرمایا گیا ہے: " ويل له ويل له ويل له " (ان کے لیے خرابی ہے، خرابی ہے، خرابی ہے)

☆ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو اپنا قد بڑھانے کے لیے جھوٹے خواب سناتے ہیں۔ ان کے بارے میں صحیح بخاری میں ہے کہ انہیں قیامت کے دن بالوں میں گرہ لگانے کا حکم دیا جائے گا۔ (ظاہر ہے وہ ایسا نہیں کرسکیں گے) (بخاري : ٧٠٤٢)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات اور وعیدوں کے باوجود مسلمانوں کی زندگی میں جھوٹ عام ہو چکا ہے، تجارت ہو کہ سیاست، صحافت ہو کہ عدالت ہر جگہ جھوٹ کا چلن ہے۔ بعض لوگوں کا طرزِ زندگی دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جھوٹ کے بغیر زندگی گزارنا محال ہے حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی برکت اور راحت سچائی میں رکھی ہے اللہ تعالیٰ ہمیں جھوت سے بچنے اور سچ بولنے کی توفیق عطا فرمائے۔

توحید

توحید اصل دین ہے۔ تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے اس کی دعوت دی ہر آسمانی کتاب میں اسی پر زور دیا گیا ہے۔ عقیدۂ توحید کے بغیر نہ نماز قبول ہے نہ صدقہ اور خیرات۔ کوئی شخص کتنا ہی عبادت گزار کیوں نہ ہو وہ عقیدۂ توحید کے بغیر جنت میں داخل ہونے کا حقدار نہیں ہوسکتا۔ جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی عقیدہ توحید ہوگا وہ دوزخ میں ہمیشہ کے لیے داخل نہیں ہوگا۔ جس کے دل میں عقیدہ کامل طور پر پایا جائے اسے ایمان اور اطاعت سے محبت ہو جاتی ہے اور کفر وفسق اور گناہوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔

عقیدۂ توحید کا حامل شخص صرف اللہ سے اپنی امیدیں وابستہ کرتا ہے۔ وہ مخلوق سے بے نیاز ہو جاتا ہے، نہ تو انسانوں کے سامنے جھکتا ہے، نہ ان سے ڈرتا ہے، نہ ان کی چاپلوسی کرتا ہے اور نہ ہی انہیں خوش کرنے کے لیے عمل کرتا ہے۔ موحد کے حق میں نہ صرف یہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سفارش فرمائیں گے بلکہ خود اسے بھی سفارش کی اجازت دی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ کی نظر میں عقیدۂ توحید کی اس قدر اہمت ہے کہ قرآن کریم کی کوئی سورت کوئی رکوع اور کوئی صفحہ توحید کے مضمون سے خالی نہیں ہے۔

چند منتخب آیات کا مفہوم یہاں پیش کیا جاتا ہے:

سورۃ البقرہ کی آیت ۱۳۲، ۱۳۳ کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہم السلام نے اپنی اولاد کو عقیدہ توحید پر قائم رہنے کی وصیت فرمائی تھی۔

ظاہر ہے کہ والدین کو اگر اپنی شام زندگی کا احساس ہو جائے تو وہ اپنی اولاد کو اسی چیز کی وصیت کرتے ہیں جس کی ان کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ ایک مسلمان کی نظر میں کائنات کی سب سے بڑی نعمت ایمان ہے اور وہ کسی طور یہ برداشت نہیں کرتا کہ اس

کی اولاد ایمان سے محروم ہو جائے اس لیے اسے دنیا سے جاتے ہوئے یہ فکر ہونی چاہئے کہ اس کے لخت جگر زندگی بھر ایمان پر قائم رہیں اور کسی شیطانی ہتھکنڈے سے متاثر ہو کر ایمان کی راہ سے ہٹ نہ جائے۔

اس سلسلے میں حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہم السلام کی زندگی ہمارے لیے ایک روشن مثال اور مشعل راہ ہے کہ ان کی اولاد میں انبیاء اور صلحاء تھے اس کے باوجود وہ انہیں ایمان، اسلام اور عقیدۂ توحید پر قائم رہنے کی وصیت فرما کر دنیا سے رخصت ہوئے۔

سورۃ الانبیاء کی آیت ۲۵ میں اللہ تعالیٰ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: ’’ہم نے آپ سے پہلے جو بھی رسول بھیجا اس کی طرف ہم نے وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری ہی عبادت کرو۔‘‘

یہی وہ دعوت تھی جس کی وجہ سے انبیاء کرام علیہم السلام کو اپنی اپنی قوم کی طرف سے مخالفت اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ کسی کو ساحر اور دیوانہ کہا گیا کسی کو سنگ سار کیا گیا، کسی کو وطن سے نکلنا پڑا۔ ہٹ دھرمی اور کج فہمی کی وجہ سے مشرکین کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم نے جو متعدد معبود فرض کر رکھے ہیں ان سب کو چھوڑ کر صرف ایک معبود مان لیا جائے۔ سورۂ جن کی آیت ۴، ۵ میں ہے: ’’اور انہوں نے تعجب سے کہا کیا ان کے پاس ان ہی میں سے ہدایت کرنے والا آیا اور کافر کہنے لگے کہ یہ تو جادوگر ہے جھوٹا، کیا اس نے اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود بنا دیا یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔‘‘

احادیث بھی توحید کے ذکر سے بھری پڑی ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کو ایمان کے بنیادی ارکان میں سے پہلا رکن قرار دیا ہے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو آپ نے اہل یمن کی طرف بھیجا تو آپ نے انہیں تاکید فرمائی تھی کہ تم اہل کتاب کی ایک قوم کی طرف جا رہے ہو تم سب سے پہلے انہیں توحید کی دعوت دینا، جب وہ توحید کو جان

لیں تو پھر انہیں نماز زکوٰۃ کی فرضیت کے بارے میں بتانا۔ (بخاري : ٧٣٧٢)

یہ معاملہ صرف حضرت معاذ رضی اللہ عنہ تک محدود نہیں تھا بلکہ مختلف علاقوں اور ملکوں میں دین حق کے جو بھی داعی جاتے تھے وہ سب سے پہلے توحید ہی کی دعوت دیتے تھے۔[۱]

یہاں یہ جان لینا بھی مناسب ہے کہ اہل علم نے توحید کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔یعنی توحید ربوبیت،توحید الوہیت اور توحید اسماء وصفات:

(۱) توحیدِ رَبوبیت کا مطلب ہے کہ سارے عالم کا خالق مالک رازق اور مدبر صرف اللہ ہے۔توحید کے اس درجے کا کفار بھی اقرار کرتے تھے لیکن اس کے باوجود انہیں مسلمان شمار نہیں کیا گیا۔قرآن کریم کی متعدد آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ کفار کی اکثریت اسی توحید کی قائل تھی۔سورۃ یونس آیت ۳۱ میں ہے''ان سے پوچھو کہ تم کو آسمان اور زمین میں رزق کون دیتا ہے یا تمہارے کانوں اور آنکھوں کا مالک کون ہے اور بے جان سے جاندار کون پیدا کرتا ہے اور جاندار سے بے جان کون پیدا کرتا ہے اور دنیا کے کاموں کا انتظام کون کرتا ہے یہ فوراً کہیں گے کہ اللہ! تو کہو کہ پھر تم اللہ سے ڈرتے کیوں نہیں۔''

سورۃ مومنون کی آیات ۸۴،۸۹ میں ہے''ان سے پوچھیے کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے سب کس کی ملکیت ہے؟ فوراً بول اٹھیں گے کہ اللہ کا۔کہو پھر تم سوچتے کیوں نہیں،ان سے پوچھیں کہ سات آسمانوں اور عرش عظیم کا مالک کون ہے؟ بے ساختہ کہہ دیں گے کہ اللہ ہی مالک ہے،کہو کہ پھر تم ڈرتے کیوں نہیں۔ان سے سوال کیجیے کہ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابل کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا؟ وہ فوراً کہہ دیں گے کہ ایسی بادشاہی تو صرف اللہ ہی کی ہے کہو کہ پھر تم پر جادو کہاں سے پڑ جاتا ہے۔''

(۲) توحیدِ اُلوہیت کا مطلب یہ ہے کہ عبادت کے جتنے بھی انداز ہیں وہ صرف

اللہ کے ساتھ مخصوص رکھے جائیں خواہ وہ رکوع وسجود ہوں یا نذر ودعاء، قربانی اور خیرات ہو یا خوف، امید، توکل اور انابت۔ اصل میں عبادت کی بنیاد دو چیزوں پر ہوتی ہے۔ محبت اور تعظیم۔ محبت کی وجہ سے بندہ اللہ کے احکام بجالاتا ہے اور تعظیم کی وجہ سے ان گناہوں کو چھوڑ دیتا ہے جن سے اللہ نے منع فرمایا ہو اور اس کے عذاب سے ڈرتا ہے۔

(مجموعة التوحيد لابن قيمية : ٥٥٣٤، مسلم : ٢٦٢٨)

(۳) توحیدِ اَسماء وصفات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے لیے وہ ساری صفات ثابت کی جائیں جو اس نے اپنے لیے ثابت کی ہیں اور ان صفات کی نفی کی جائے جن کی اس نے نفی کی ہے اور جن کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول نے سکوت کیا ہے ہم بھی سکوت کریں اور اللہ کی صفات میں کسی دوسرے کو شریک نہ کیا جائے، وہ سمیع علیم اور بصیر ہے مخلوق میں سے بھی بعض کو سمع، علم اور بصر دیا گیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ جیسی سننے، دیکھنے اور جاننے کی صفت اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہے ویسی کسی اور کے لیے ثابت نہیں ہوسکتی۔

(الجواب المفيد في بيان اقسام التوحيد : ٨-١٧)

توحید کی یہ وہ دو قسمیں ہیں جس میں انسانوں نے اکثر ٹھوکر کھائی ہے اور وہ شرک جیسے ناقابل معافی جرم کے مرتکب ہوئے ہیں کسی نے غیر اللہ کے سامنے رکوع اور سجدہ کیا۔ کوئی درگاہوں پر نذریں چڑھاتا رہا کسی نے اللہ کے بندوں کو اسماء وصفات میں اللہ کا شریک بنادیا اور یوں اپنی آخرت تباہ کرلی۔

وعدہ خلافی

سورۂ مائدہ کی آیت ۱۲۔۱۳ میں یہود کا ذکر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ اگر تم نماز قائم کرو گے، زکوٰۃ ادا کرو گے، میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے، ان کی مدد کرو گے، اللہ کو قرضِ حسن دو گے تو میں تمہیں گناہوں سے پاک کر دوں گا اور جنت میں داخل کروں گا لیکن یہود نے عہد شکنی کی جس کے نتیجے میں ان پر لعنت ہوئی وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہو گئے اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا گیا، کسی پر اللہ کی لعنت ہونا اور دل کا سخت ہو جانا اللہ کے عذاب کی ایک صورت ہے بلکہ یہ شدید ترین عذاب ہے، جس کا دل سخت ہو جائے وہ ہدایت، توبہ اور رجوع سے محروم ہو جاتا ہے، نہ کوئی آیت اس پر اثر کرتی ہے اور نہ ہی حدیث، نہ کسی حادثہ سے وہ متاثر ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی سانحہ اس کے قلب و دماغ میں تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ وہ سراسر خواہشات کا اسیر اور شہوات کا نخچیر بن کر رہ جاتا ہے۔

اسی سورہ کی آیت ۱۴ میں نصاریٰ کا بھی ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے بھی شریعت پر عمل کرنے کا وعدہ لیا تھا لیکن وہ بھی وعدہ خلافی کے مرتکب ہوئے چنانچہ ان کے درمیان قیامت تک کے لئے بغض و عداوت ڈال دیا گیا۔

قرآنِ کریم میں کئی دوسری آیات میں بھی عہد شکنی کی مذمت کی گئی ہے سورۂ انفال کی آیت ۵۶۔۵۷ میں فرمایا گیا کہ ”اللہ کے نزدیک جانوروں میں سے بدترین وہ ہیں جو کافر ہیں اور ایمان نہیں لاتے، جن سے آپ وعدہ لیتے ہیں مگر وہ بار بار عدہ توڑ دیتے ہیں اور ڈرتے نہیں ہیں۔“

اسی طرح سورۂ رعد کی آیت ۲۵ میں فرمایا گیا ہے کہ ”وہ لوگ جو اللہ کے عہد و پیمان کو توڑ دیتے ہیں اور جن تعلقات کو اللہ نے قائم رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں کاٹ دیتے ہیں اور

زمین میں فساد مچاتے ہیں ان کے لئے لعنت اور برا انجام ہے۔“

جیسے وعدہ خلافی، یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی صفت بتائی گئی ہے اسی طرح ایفاءِ عہد اہلِ ایمان کی صفت کے طور پر ذکر کی گئی ہے، سورۂ رعد کی آیت ۲۰،۲۱ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے کلام سے صرف عقلمند لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں اور عقلمند لوگ وہ ہیں جو اللہ کا عہد پورا کرتے ہیں اور عہد شکنی کا ارتکاب نہیں کرتے۔

احادیثِ نبویہ میں بھی وعدہ خلافی کی مذمت کی گئی ہے اور اسے منافقوں کی نشانی قرار دیا گیا ہے، مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں جو بھی خطبہ دیتے تھے اس میں ارشاد فرماتے تھے ”جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس میں ایفاء عہد نہیں اس کے دین کا اعتبار نہیں۔“

ابنِ ماجہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس قوم میں اعلانیہ بدکاری عام ہو جائے اس میں طاعون اور ایسی بیماریاں پھیل جاتی ہیں جو ان کے پچھلے لوگوں میں نہیں ہوتیں اور جو لوگ ناپ تول میں کمی کرتے ہیں، ان پر قحط، مصائب اور ظالم حکمران مسلط ہو جاتے ہیں، جو لوگ زکوٰۃ دینے سے انکار کردیں ان پر بارش نہیں برستی، اگر جانور نہ ہوتے تو بارش کا سلسلہ بالکل ہی ختم ہو جاتا، جو قوم اللہ اور اللہ کے رسول سے عہد شکنی کرتی ہے، اللہ تعالیٰ اس پر کسی اجنبی دشمن کو مسلط کر دیتا ہے جو ان کی ملکیت میں موجود بعض چیزیں چھین لیتے ہیں اور جس قوم کے حاکم اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ نہ کریں اور احکامِ الٰہی کو پسند نہ کریں، انہیں اللہ آپس میں لڑا دیتے ہیں۔“ (ابن ماجہ: ۴۰۱۹)

مذکورہ آیات اور احادیث سے ایفاء عہد کی جو اہمیت اور وعدہ خلافی کی جو قباحت ثابت ہوتی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں، اسی لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عہد شکنی سے بچنے کا مبالغہ کی حد

تک اہتمام فرماتے تھے، اگرچہ بظاہر انہیں نقصان ہی اٹھانا پڑتا وہ نقصان برداشت کر لیتے تھے مگر وعدہ خلافی نہیں کرتے تھے۔

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں وہ مکہ سے مدینہ تشریف لا رہے تھے کہ راستے میں ابوجہل نے انہیں گرفتار کرلیا اور اس شرط پر انہیں آزاد کیا کہ وہ مدینہ جا کر اہل مکہ کے خلاف جنگ میں حصہ نہیں لیں گے یہ وہ دن تھے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بدر کے لئے مدینہ منورہ سے روانہ ہو چکے تھے چنانچہ راستے ہی میں آپ سے ملاقات ہوگئی، ہر صاحبِ علم جانتا ہے کہ کفر کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور انہیں ایک ایک فرد کی ضرورت تھی لیکن حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی خواہش کے باوجود اللہ کے نبی نے انہیں جنگ میں شرکت کی اجازت نہ دی تاکہ اس عہد کی خلاف ورزی لازم نہ آئے جو عہد ان سے تلوار کے زور پر لیا گیا تھا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ شام میں حکومتی فرائض سرانجام دے رہے تھے ان کے پڑوس میں وقت کی سپر پاور یعنی رومی حکومت تھی، رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان صلح اور جنگ کا سلسلہ جاری رہتا تھا، ایک مرتبہ معین تاریخ تک جنگ بندی کا دور چل رہا تھا کہ حضرت معاویہ اپنی فوجیں لے کر سرحد کی طرف لے کر چلے تاکہ معاہدے کی آخری تاریخ ختم ہوتے ہی رومیوں پر حملہ کر دیا جائے، آپ کا لشکر رواں دواں تھا کہ آپ نے اچانک دیکھا ایک تیز رفتار گھڑ سوار آرہا ہے اور بلند آواز میں کہہ رہا ہے:

" اللّٰه اكبر، اللّٰه اكبر، قفوا عباد اللّٰه قفوا عباد اللّٰه ."

''اللہ کے بندو ٹھہر جاؤ، ٹھہر جاؤ۔''

قریب آنے پر پتہ چلا کہ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ ہیں، جو فرما رہے ہیں:

" وفاء لا غدر و فاء لا غدر ."

”وعدہ پورا کرو عہد شکنی نہ کرو۔“

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے تو کوئی وعدہ خلافی نہیں کی، سرحد پر آیا ہوں، سرحد میں داخل تو نہیں ہوا، جواب میں حضرت عمرو نے فرمایا میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ”اگر تمہارا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو تو اس وقت تک اس کے خلاف کرنے کی اجازت نہیں جب تک مدت گزر نہ جائے یا پھر واضح طور پر اس قوم کو معاہدہ ختم کرنے کی اطلاع نہ دے دی جائے۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ آپ کا مدتِ معاہدہ ختم ہونے سے پہلے سرحد پر لشکر کو جمع کر لینا یہ بھی وعدہ خلافی میں شمار ہوگا چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کے استدلال کو تسلیم کیا اور لشکر کو واپسی کا حکم دے دیا۔

کہاں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کردار تھا کہ وہ ظاہری طور پر بھی وعدہ خلافی گوارا نہیں کرتے تھے اور کہاں ہمارا کردار ہے کہ کھلم کھلا وعدہ خلافی کو بھی جرم نہیں سمجھا جاتا، عوام تو رہے ایک طرف، خواص بھی عہد شکنی میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے۔

برا نمونہ

عربی کے بے شمار الفاظ ایسے ہیں کہ اردو میں ان کا ایسا ترجمہ بہت دشوار ہے جو ان کے مفہوم کو پوری طرح ادا کردے، "القدوة السیئہ" ہی کو لے لیجئے اس کا لفظی ترجمہ "برا نمونہ" ہی ہے لیکن اس کا اطلاق برے دوست، ناقابلِ اعتماد قیادت، بگڑتے ہوئے آباء اور جعلی پیر وغیرہ سب پر ہوسکتا ہے، یہ سب انسان کے خیالات اور عملی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور وہ انہیں اپنے لیے آئیڈیل اور نمونہ قرار دے لیتا ہے۔ وہ تمام آیات اور احادیث جن میں آباء پرستی، برے کی دوستی، ظالم اور عیاش حکمرانوں اور علماءِ سوء کی مذمت کی گئی ہے ہم ان سب کو مذکورہ بالا عنوان کے ذیل میں پیش کر سکتے ہیں۔

مشرکین اور کفار کی گمراہی کا بڑا سبب بر خود غلط آباء ہی تھے، وہ لکڑی اور پتھر کی مورتیوں کی عبادت کرتے تھے۔ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور نہ معلوم کیسی کیسی حماقتوں، ضلالتوں اور جہالتوں میں مبتلا تھے، جب انہیں سمجھانے کی کوشش کی جاتی اور ان سے سوال کیا جاتا کہ گمراہی کے اس گورکھ دھندے پر تمہارے پاس کوئی عقلی یا نقلی دلیل ہے؟ تو وہ جواب دیتے کہ ہمارے پاس سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ہمارے آباء واجداد وہ سب کچھ کرتے تھے جو ہم کر رہے ہیں وہی ہمارے آئیڈیل اور نمونہ ہیں۔

قرآن کریم کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر نبی اور رسول کو منکرینِ صداقت نے یہی جواب دیا، سورۂ زخرف میں ہے: "یونہی ہم نے جس بستی میں بھی کوئی ڈرسنانے والا بھیجا تو وہاں کے خوشحال لوگوں نے جواب دیا کہ ہم نے اپنے آباء کو ایک مخصوص مذہب پر پایا اور ہم انہی کے نقشِ قدم کی اقتداء کر رہے ہیں۔"

اللہ کے نبی ان سے سوال کرتے اچھا یہ بتاؤ "اگر ہم تمہارے سامنے تمہارے باپ دادا

کے مذہب سے بہتر مذہب پیش کریں تو بھی تم ہماری بات نہیں مانو گے؟'' تو وہ دوٹوک انداز میں جواب دیتے کہ ''جو کچھ تمہیں دے کر بھیجا گیا ہے ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔''

(سورة الزخرف : ۲۳، ۲٤)

آباء پرستی کی انتہا یہ تھی کہ وہ انبیاء کے لائے ہوئے پروگرام، ان کی دعوت اور دستورِ زندگی میں غور وفکر کرنے کے لئے بھی تیار نہ تھے، بلکہ سنتے ہی انکار کر دیتے تھے، قرآن کے الفاظ میں وہ ہدایت سے یوں بھاگتے تھے جیسے وحشی گدھے تیر کی دھاڑ سن کر بھاگتے ہیں۔

آیئے! اب چند احادیث کا بھی مطالعہ فرمالیں، یہ احادیث کسی ترتیب کے بغیر پیش کی جارہی ہیں، ان میں مشترک بات یہ ہے کہ یہ سب ''برا نمونہ'' بننے والوں کی مذمت کرتی ہیں اور ان سے بچ کر رہنے کی تلقین کرتی ہیں:

☆ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اللہ کی نظر میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت تین شخص ہیں، حرم میں الحاد اور بے دینی پھیلانے والا، اسلام میں جاہلیت کی سنت کو رواج دینے والا اور کسی شخص کا ناحق خون بہانے کے لیے اس کا تعاقب کرنے والا۔'' (بخاري : ٦٨٨٢)

جاہلیت کے طور طریقوں کو اسلام کا لیبل لگا کر پیش کیا جائے گا تو بے شمار لوگوں کا جاہلیت میں مبتلا ہونا یقینی ہو جائے گا اس لیے کہ ایک مسلمان جاہلیت کے نام سے بدکتا اور دور رہتا ہے مگر جب اسے دین کے عنوان سے پیش کیا جائے گا تو ممکن ہے کہ علم نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسے قبول کرلے، بدعت کی بھی اسی لیے مذمت کی گئی ہے کہ دین کا حصہ اور عمل نہ ہونے کے باوجود اس پر دین کا لیبل لگا دیا جاتا ہے، جتنے لوگ بھی بدعت کا ارتکاب کریں گے ان کے گناہ میں وہ شخص بھی شریک ہوگا جس نے اس کی ابتداء کی اور وہ ایک اسوہ اور نمونہ بنا۔

☆ حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا: ''اللہ تجھے ان امراء اور حکّام سے اپنی پناہ میں رکھے جو میرے بعد ہوں گے، عرض کیا یارسول اللہ! وہ کیسے لوگ ہوں گے؟ آپ نے فرمایا (بس یہ سن لو کہ) جو ان کے پاس جا کر ان کی ہاں میں ہاں ملائے گا اور ظلم پر ان کے ساتھ تعاون کرے گا اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ حوضِ کوثر پر میرے پاس آسکے گا، اے ابوعبدالرحمٰن! روزہ ڈھال اور نماز دلیل اور برہان ہے، اے ابوعبدالرحمٰن! اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو جنت میں داخل نہیں ہونے دے گا جو حرام کھا کر پلا ہو، اس کے لیے تو دوزخ کی آگ ہی زیادہ بہتر ہے۔''

(مستدرك حاكم: ٤/١٢٦)

حکام اور سربراہ بھی رعایا کے لیے ایک قدوہ اور نمونہ ہوتے ہیں اگر وہ عیاش اور فاسق و فاجر ہوں تو ان کے ساتھ تعاون کرنا اور ان کے نقشِ قدم پر چلنا یقیناً اللہ کے غضب کو دعوت دینے والی بات ہے۔

☆ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ''اللہ تعالیٰ دنیا سے علم کو یوں ختم نہیں کرے گا کہ وہ ان سے علم کو سلب کر لے بلکہ علم اٹھالیا جائے گا علماء کے اٹھالینے سے، یہاں تک کہ جب کوئی عالم نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا سردار اور پیشوا بنالیں گے پھر وہ علم کے بغیر فتوے دے کر خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔'' (بخاري: ١٠٠)

اس حدیث کا اطلاق علماءِ سوء، جاہل مفتیوں اور دنیا پرست پیروں سمیت سب پر ہوتا ہے، یہی وہ ناخلف گروہ ہے جسے نمونہ سمجھ کر عوام ان کی اتباع کرتے ہیں اور بالآخر گمراہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

☆ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نیک اور برے ہم نشین کی مثال مشک فروش اور بھٹی والے لوہار کی سی ہے۔ مشک فروش ممکن

ہے آپ کو کچھ ہدیہ دے دے یا تم اس سے خرید لو ورنہ جب تک اس کے پاس رہو گے خوشبو تو پاتے ہی رہو گے، آگ کی بھٹی والے کے پاس بیٹھنے سے تمہارے کپڑے بھی جل سکتے ہیں ورنہ اتنی بات تو یقینی ہے کہ تمہیں بدبو آتی رہے گی۔

(صحیح بخاری: ۵۵۳۴، صحیح مسلم: ۲۶۲۸)

انسان کا دوست بھی اس کے لیے ایک اسوہ ہوتا ہے اس لیے اللہ کے نبی نے یہ تعلیم دی ہے کہ دوست کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا جائے۔

بدنصیب

وہ مہینہ آ گیا جس میں قرآن نازل ہوا، یہی مہینہ تھا جس میں سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو منبر کے قریب ہونے کا حکم دیا تھا ظاہر ہے کہ حکم کی فوراً تعمیل کی گئی، آپ نے منبر کے پہلے درجہ پر قدم رکھا اور فرمایا۔ آمین۔ جب دوسرے پر قدم رکھا تو فرمایا آمین پھر تیسرے پر قدم رکھا اور فرمایا آمین، جب آپ خطبہ سے فارغ ہو کر نیچے اترے تو صحابہ نے عرض کیا آج آپ کے منبر پر چڑھتے ہوئے ایسی بات سنی جو پہلے کبھی نہیں سنی تھی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ اسی وقت جبرئیل میرے سامنے آئے تھے جب پہلے درجہ پر میں نے قدم رکھا تو انہوں نے کہا ہلاک ہوجائے وہ شخص جس نے رمضان کا مبارک مہینہ پایا پھر بھی اس کی مغفرت نہ ہوئی، میں نے کہا آمین، پھر جب میں دوسرے درجہ پر چڑھا تو انہوں نے کہا، ہلاک ہوجائے وہ شخص جس کے سامنے آپ کا ذکر مبارک ہو اور وہ آپ پر درود نہ بھیجے، میں نے کہا آمین، جب میں تیسرے درجہ پر چڑھا تو انہوں نے کہا تباہ ہوجائے وہ شخص جس کے سامنے اس کے والدین یا ان میں کوئی ایک بڑھاپے کو پائیں اور وہ اسے جنت میں داخل نہ کرائیں میں نے کہا: آمین۔ (بخاري : ٦٦٧٥)

آج جو ہماری زبانیں کلمہ توحید سے معطر اور ہمارے دل نورِ ایمان سے منور ہیں، ہمارے سر لاتعداد دیویوں اور دیوتاؤں کی بجائے صرف ایک اللہ کے سامنے جھکتے ہیں، ہمارے گھروں میں قرآن کریم کی جو تلاوت ہوتی ہے، ہمیں اسلامی اخلاق کی جو خوبصورت ترین وراثت ملی ہے، ہماری مساجد اور مدارس میں قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں گونجتی ہیں تو یہ سب نتیجہ ہے ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ومحنت اور دردِ دل کا، ہم آپ کے احسانات کا شکریہ کسی طور ادا نہیں کرسکتے البتہ درود شریف پڑھ کر یہ اطمینان محسوس

کر سکتے ہیں کہ ہم نے احسان کا بدلہ اتارنے کی کوشش تو کی ہے، درود کے پڑھنے سے آقا کے مراتب میں تو کیا اضافہ ہوگا، ہمارا مرتبہ کچھ بڑھ جائے گا، بدنصیب ہے جسے آپ کا اسمِ گرامی سن کر درود شریف پڑھنے کی بھی توفیق نہ ہو۔

والدین یوں تو زندگی کے ہر موڑ پر ہماری خدمت، محبت، اطاعت اور وفا کے مستحق ہیں لیکن بڑھاپے میں جبکہ طبیعت بڑی حساس اور جذبات نازک آبگینہ بن جاتے ہیں، اس وقت وہ سب سے زیادہ خدمت کے مستحق ہوتے ہیں۔ بدقسمت ہے وہ شخص جو بڑھاپے میں ان کی خدمت کر کے جنت کا حقدار نہ بنے، یا ان کا دل دکھائے، انہیں طعنے دے اور انہیں دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کردے، ایسے شخص کی نہ نماز قبول ہوتی ہے، نہ حج اور عمرے۔

رمضان المبارک کا مہینہ رحمتوں کی موسلا دھار بارش برسنے کا مہینہ ہے، اس مہینے کا آغاز ہوتے ہی سرکش شیاطین جکڑ دیئے جاتے ہیں، دوزخ کے سارے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں، جنت کے تمام دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، اللہ کا منادی پکار پکار کر کہتا ہے: اے خیر کے طالب! قدم بڑھا، کوشش کر اور اے بدی کے طالب رک جا! اس مہینے میں تو رک جا، اپنی بدبختی پر مہر ثبت نہ کر۔

بے شمار گنہگاروں کو دوزخ سے رہائی دے دی جاتی ہے، اللہ کے نیک بندے اس مہینے میں خوب دعائیں مانگتے ہیں، سب سے زیادہ جو دعاء مانگی جاتی ہے وہ دوزخ سے آزادی کی اور جنت کے حصول کی، اپنے لیے بھی اور اپنی اولاد، عزیز و اقارب اور سارے مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے بھی۔

یہی وہ مہینہ ہے جس کے دنوں میں روزہ رکھا جاتا ہے اور راتوں میں قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے، قیامت کے دن روزہ داروں کے دخولِ جنت کے لیے ایک دروازہ مخصوص کردیا جائے گا جس کا نام ''باب الریان'' ہوگا، اس دن پکارا جائے گا کہ کہاں ہیں وہ

بندے جو اللہ کے لیے بھوک پیاس کی تکلیف اٹھایا کرتے تھے، وہ اس پکار پر چل پڑیں گے، ان کے سوا کسی کو اس دروازے سے داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ (بخاري : ۱۸۹٦ ، مسلم : ۱۱۵۲) روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کو مشک سے زیادہ پسند ہے۔

روزہ داروں کی فضیلت پر ایک انتہائی جامع حدیث جسے امام بخاری، امام مسلم اور دیگر محدثین نے بھی روایت کیا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ابن آدم کا ہر عمل اس کے لیے ہے سوائے روزہ کے، وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا، پس جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو وہ گالی گلوچ اور شور وشغب نہ کرے، اگر اسے کوئی گالی دے یا لڑائی جھگڑا کرے تو وہ کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں، اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے، روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی بو سے زیادہ اچھی ہے، روزہ دار کو دو خوشیاں میسر آتی ہیں ایک افطار کے وقت اور دوسری اس وقت جب وہ اپنے رب سے ملے گا۔'' (بخاري : ۱۹۰٤ ، مسلم : ۱۱۵۱)

گالی گلوچ اور لڑائی جھگڑا عام حالات میں بھی مناسب نہیں لیکن روزہ کی حالت میں تو اس سے خاص طو ر پر بچنا چاہیے اس لیے کہ روزہ صرف پیٹ کا نہیں ہوتا بلکہ زبان، آنکھ اور کان سمیت تمام اعضاء کا ہوتا ہے، جو لوگ صبح سے شام تک کھانے پینے سے تو احتراز کرتے ہیں مگر جھوٹ، غیبت، بہتان، ظلم، زیادتی، بدنظری اور فحش گوئی وغیرہ سے بچنے کا اہتمام نہیں کرتے وہ روزے کے فوائد پوری طرح حاصل نہیں کر پاتے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہیں چھوڑتا، اللہ تعالیٰ کو اس کے کھانا پینا چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ ''بہت سارے روزہ دار ایسے ہیں جنہیں اپنے روزہ

سے بھوک پیاس کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا اور کئی شب زندہ دار ایسے ہیں جنہیں راتوں کو جاگنے کے سوا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔"

غرضیکہ وہ بھی بدنصیب ہیں جو رمضان میں نہ روزہ رکھتے ہیں نہ تلاوت کرتے ہیں انہیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ کیسا عظیم الشان مہینہ ہمارے سروں پر سایہ فگن ہے اور وہ بھی بدنصیب ہیں جو بظاہر صوم وصلوٰۃ کا اہتمام تو کرتے ہیں مگر قبولیت کی شرائط کا لحاظ نہیں کرتے اور نیکی کا بیج ڈالنے کے ساتھ ساتھ گناہوں کی آگ بھی جلائے رکھتے ہیں۔

ایک دلچسپ واقعہ

صحیح مسلم میں زبانِ نبوت سے نقل کیا گیا ایک دلچسپ واقعہ مذکور ہے، آیئے! پہلے ہم اس کا مطالعہ کرلیں آخر میں اس کے حوالے سے کچھ گفتگو ہوگی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں سب سے آخر میں وہ شخص داخل ہوگا جو کبھی چلے گا، کبھی چہرے کے بل گرے گا اور آگ اس کے چہرے کو جلا کر رکھ دے گی، جب وہ (اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد) دوزخ سے نکل جائے گا تو وہ آگ سے خطاب کرتے ہوئے کہے گا، بابرکت ہے وہ ذات جس نے مجھے تجھ سے نجات دی، یقیناً اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وہ انعام کیا ہے جو اولین اور آخرین میں سے کسی پر نہیں کیا، پھر اس کے سامنے ایک درخت ظاہر کیا جائے گا جسے دیکھ کر وہ درخواست کرے گا: یا رب! مجھے اس درخت کے قریب کردیجئے تا کہ میں اسی کے سائے میں راحت حاصل کرسکوں اور اس (کے نیچے بہنے والا) پانی پی سکوں، اللہ عزوجل فرمائیں گے: اے آدم کے بیٹے! اگر میں نے تیری یہ درخواست منظور کرلی تو ممکن ہے تم مجھ سے کچھ اور بھی مانگو، اللہ تعالیٰ اس کی بیقراری کو دیکھتے ہوئے اسے درخت کے قریب کردیں گے وہ اس کے سائے میں بیٹھے گا اور پانی نوش کرے گا، پھر اس کی نظر ایسے درخت پر پڑے گی جو پہلے والے سے بھی زیادہ سرسبز اور خوبصورت ہوگا، اب وہ اس دوسرے درخت کے قریب ہونے کی درخواست بارگاہِ الٰہی میں پیش کرے گا اور ساتھ ہی یہ بھی کہے گا کہ میں کچھ اور نہیں مانگوں گا، اللہ فرمائیں گے اگر میں نے تجھے اس کے قریب کردیا تو ممکن ہے تم کچھ اور مانگنے لگو، وہ وعدہ کرے گا کہ ایسا نہیں ہوگا، اس کے اصرار اور لجاجت کی وجہ سے یہ درخواست بھی قبول کرلی جائے گی اور اسے اس درخت تلے پہنچا دیا جائے گا، پھر اس کی نظر ایسے درخت پر

پڑے گی جو بابِ جنت کے قریب اور پہلے دونوں درختوں سے زیادہ خوبصورت ہوگا وہ تیسری بار وہی سوال کرے گا جو پہلے دو بار کر چکا۔

اسے یاد دلایا جائے گا کہ تم نے وعدہ کیا تھا کہ مزید کچھ نہیں مانگوں گا وہ عرض کرے گا کہ یہ آخری سوال تھا اب کسی چیز کا سوال نہیں کروں گا۔ اس کی معذرت قبول کرتے ہوئے اس کی یہ درخواست بھی پوری کر دی جائے گی، جب وہ جنت کے قریب آجائے گا تو اسے اہلِ جنت کی آوازیں سنائی دیں گی اب وہ جست میں داخل کیے جانے کی درخواست کرے گا۔

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اے ابنِ آدم! تیرے سوال کا سلسلہ تو ختم ہونے میں نہیں آرہا، کیا اگر تمہیں دنیا اور اس کی مثل دے دیا جائے تو پھر خوش ہو جاؤ گے؟ (اسے یقین نہیں آئے گا کہ مجھے جنت میں اتنی بڑی جگہ مل سکتی ہے) وہ عرض کرے گا یا رب! آپ رب العالمین ہو کر مجھ سے مذاق کر رہے ہیں؟ (یہ بات سناتے ہوئے)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہنس پڑے، حاضرین نے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یونہی مسکرائے تھے جب ہم نے آپ سے مسکرانے کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ جس وقت بندہ یہ کہے گا کہ آپ رب العالمین ہو کر مجھ سے مذاق کر رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ مسکرائیں گے اور فرمائیں گے کہ میں تجھ سے مذاق نہیں کرتا لیکن میں جو چاہتا ہوں اس کے کرنے کی قدرت رکھتا ہوں۔

اس حدیث میں انسان کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے یہ صرف آخرت میں نہیں ہوگی بلکہ دنیا میں بھی اس کا یہی حال ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ایک تمنا ظاہر کرتا ہے اس کی تکمیل کے بعد دوسری اور پھر تیسری اپنی ہر تمنا کے بارے میں اس کا یہی خیال ہوتا ہے کہ یہ پوری ہو جائے تو میرے سارے مسائل حل ہو جائیں گے لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے، بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خزانوں کو اپنی جیب پر قیاس کرتے ہوئے سوچتا ہے کہ کوئی

بڑا سوال اس سے نہ کیا جائے، اسی بناء پر وہ یہ وعدہ بھی کر لیتا ہے کہ اب کچھ اور نہیں مانگوں گا حالانکہ باری تعالیٰ کی طرف سے اسے ایسا وعدہ کرنے کا پابند نہیں کیا جاتا۔

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کے مسکرانے کا جو ذکر ہے تو اسے ہم ان متشابہات میں سے قرار دیں گے جن کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کیونکہ ضحک اور تبسم عارضی کیفیات میں سے ہیں اور باری تعالیٰ عوارض سے پاک ہے، مسکرانا تو یقینی ہے لیکن اس کی ٹھیک ٹھیک کیفیت کیا ہوگی یہ ہمیں معلوم نہیں۔

حدیثِ بالا اور بشارت پر مبنی دوسری احادیث سن کر آخرت کے عذاب کو ہلکا نہیں سمجھنا چاہئے جیسا کہ بعض جاہلوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ کیا ہوا اگر چند دن دوزخ میں رہ لیں گے۔ بالآخر ہمیں جنت میں جانا ہے، قیامت کا ایک دن کسی کے حق میں ایک ہزار سال اور کسی کے حق میں پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا، جس انسان کے ضعف کا یہ حال ہے کہ وہ چند لمحوں کے لیے ہاتھ پر انگارہ رکھنا برداشت نہیں کر سکتا وہ ایسی آگ کیسے برداشت کر سکے گا جو اسے دائیں بائیں، آگے پیچھے اور اوپر نیچے سے گھیرے ہوئے ہوگی۔

زیب وزینت کا اظہار

سورۂ احزاب کی آیت ۳۳ میں ویسے تو ازواجِ مطہرات سے خطاب ہے لیکن جو حکم دیا گیا ہے وہ تمام مسلمان خواتین کے لیے ہے: ''اور اپنے گھروں میں قرار سے رہو اور قدیم جاہلیت کے زمانے کی طرح اپنی زیب وزینت کا اظہار نہ کرو۔''

زمانۂ جاہلیت میں عورتیں بن سنور کر بے پردہ گھر سے باہر نکلا کرتی تھیں تا کہ مردان کی طرف متوجہ ہوں۔ اسلام نے ایک حکم تو یہ دیا کہ بلا ضرورت گھر سے باہر نہ نکلا کرو، عورت کے لیے محفوظ اور مناسب جگہ اس کا گھر ہے، یہاں تک کہ نماز بھی اسے گھر کے اندر ہی ادا کرنی چاہیے۔ دوسرا حکم یہ دیا کہ اگر مجبوری کی بناء پر گھر سے باہر نکلنا پڑے۔ تو باپردہ ہو کر نکلا جائے۔ نکلنے کا مقصد ضرورت کی تکمیل ہونی چاہئے۔ اپنے حسن وجمال اور بناؤ سنگھار کا اظہار ہرگز پیشِ نظر نہ ہونا چاہیے۔

عورت کا بن ٹھن کر بازار، شاپنگ سینٹر، مخلوط اجتماع، شادی ہال، تفریح گاہ اور کلب میں آنا جانا، چلنا پھرنا ایمان کے ضعف اور حیاء کی قلت کی دلیل ہے، ایسی عورت لعنت کی مستحق اور رحمت سے محروم ہو جاتی ہے، ایسی عورت اپنے آپ کو مجرموں، منافقوں، فاسقوں اور شہوت پرستوں کی ہولناک نگاہوں کی خوراک بنا کر پیش کرتی ہے، اس کی یہ حرکت معاشرے میں بے حیائی اور بدکاری عام کرنے کا سبب بنتی ہے، ایسا کرنا حقیقت میں زمانۂ جاہلیت کی یادگار اور کافرہ فاجرہ عورتوں کا شیوہ ہے، اسلامی تعلیمات پر ایمان رکھنے والی خواتین کو یہ حرکت قطعاً زیب نہیں دیتی۔

آیئے! اب سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی چند احادیث کا مطالعہ کریں جن سے غیر محرموں کے سامنے اظہارِ زینت کی مذمت ثابت ہوتی ہے:

☆ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کے آخری دور میں ایسی عورتیں ہوں گی جو بظاہر کپڑے پہنے ہوں گی لیکن حقیقت میں ننگی ہوں گی، ان کے سروں پر بختی اونٹ کی کمان کی طرح (جوڑے) ہوں گے، ان پر لعنت کرو کیونکہ وہ لعنت کی مستحق ہیں۔

یہ کون سی عورتیں ہیں جو بظاہر کپڑے پہنتی ہیں لیکن حقیقت میں ننگی ہوتی ہیں یہ وہ عورتیں ہیں جو اس قدر باریک لباس پہنتی ہیں جس سے جسم کی رنگت چھلکتی ہے یا ایسا تنگ اور مختصر لباس پہنتی ہیں جو جسم کو چھپانے میں ناکافی ثابت ہوتا ہے اور اس سے ستر کے تقاضے پورے نہیں ہوتے، ایسا لباس شہوانی نظروں سے عورت کو چھپانے کی بجائے ہر کسی کو اس کی طرف متوجہ کرنے کا سبب بنتا ہے اور شاید اس کے پہننے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری حدیث میں ایسی عورتوں کی ایک صفت ''ممیلات مائلات'' بھی ذکر کی ہے یعنی وہ دوسروں کو اپنی طرف مائل کرتی اور خود دوسروں کی طرف مائل ہوتی ہیں۔

زیبائش وآرائش عورت کی فطری کمزوری اور خواہش ہے اور یہ کمزوری قابل ملامت بھی نہیں مگر شرط یہ ہے کہ وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل حدود کے دائرے میں رہتے ہوئے کرے، اگر وہ نظافت پسندی کی وجہ سے خوشبو استعمال کرے یا اپنے شوہر کو خوش رکھنے اور طبعی میلان کی وجہ سے اچھا زیور پہنے یا پرکشش لباس زیب تن کرے تو اسے ہرگز ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن گھر کی چار دیواری کے اندر رہے۔ گھر سے باہر بھڑکیلے لباس پہن کر اور تیز خوشبو لگا کر نکلنا قطعاً جائز نہیں۔

☆ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب کوئی عورت عطر لگا کر لوگوں کے پاس گزرتی ہے تاکہ وہ اس کی خوشبو محسوس

کریں تو وہ ایسی ویسی ہوتی ہے یعنی اُس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت الفاظ استعمال فرمائے۔" (النسائی: ۱۳۵۰، ابو داؤد: ٤١٧٣)

☆ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک دفعہ بعض خواتین نے خضاب، پازیب، سونے کی انگوٹھی اور باریک لباس کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے بڑا جامع اور اصولی قسم کا جواب دیا فرمایا: "اے عورتوں کی جماعت! تم سب کا قصہ ایک ہے اللہ تعالیٰ نے تمہاری ایسی زینت کو حلال کیا ہے لیکن نامحرموں کے سامنے اس کی مائش جائز نہیں"

سیدہ نے مختصر الفاظ میں مسئلہ سمجھا دیا یعنی زیبائش تو جائز ہے مگر اس کی نمائش جائز نہیں۔ اسے کہتے ہیں کوزے میں دریا بند کرنا۔ بلاشبہ اس کی صلاحیت پائی جاتی تھی اس عظیم خاتون میں۔ جب سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رفیقۂ حیات اور امت کی مادرِ مہربان کے طور پر منتخب کیا تھا۔

نیک عمل کا واسطہ

قرآنِ کریم میں متعدد اقوام اور افراد کے عبرت آموز واقعات ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے: ''اس میں نشانیاں ہیں غور وفکر کرنے والوں کے لیے''، ''اس میں عبرتیں ہیں عقل والوں کے لیے'' اور یہ کہ ''اس میں نصیحتیں ہیں علم والوں کے لیے'' بلکہ فطرت کے مظاہر یعنی ارض وسماء ستاروں اور سیاروں، درختوں اور پہاڑوں کے مذکرہ کے بعد بھی یہی کچھ فرمایا گیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان کو ہر منظر، ہر واقعہ اور ہر سانحہ سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔

آج کی نشست میں ہم صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے حوالے سے تین مصیبت زدہ افراد کا قصہ ذکر کر رہے ہیں۔ جسے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے نقل کیا ہے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین شخص کہیں جا رہے تھے، اچانک بارش برسنے لگی، انہوں نے پہاڑ کی غار میں پناہ لے لی، ایک پہاڑی چٹان لڑھکتے ہوئے آئی اور غار کے منہ پر ٹک گئی، باہر نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہ رہا، انہوں نے ایک دوسرے سے کہا اپنے نیک اعمال میں سے کوئی عمل یاد کرو جو تم نے صرف اللہ کی رضا کے لیے کیا ہو، پھر اس عمل کا واسطہ دے کر اللہ تعالیٰ سے دعاء کرو ممکن ہے تمہیں اس مصیبت سے نجات مل جائے۔

☆...... ان میں سے ایک نے دعاء کی اے اللہ! میرے گھر میں بوڑھے والدین کے علاوہ میری بیوی اور چھوٹے بچے تھے جن کی میں کفالت کرتا تھا۔ جب میں شام کو گھر آتا تو دودھ نکال کر اپنے بچوں سے بھی پہلے والدین کو پلاتا، ایک دن مجھے کچھ دیر ہوگئی رات کو جب میں گھر پہنچا تو والدین سو چکے تھے، میں نے عام دنوں کی طرح دودھ نکالا اور والدین کے قریب کھڑا ہوگیا میں انہیں نیند سے بھی بیدار نہیں کرنا چاہتا تھا اور مجھے یہ بھی پسند نہیں تھا کہ ان سے پہلے بچوں کو پلاؤں، جبکہ بھوک کی وجہ سے بچے میرے قدموں میں گریہ وزاری

کررہے تھے،طلوعِ فجر تک میرا اوران کا معاملہ یونہی رہا،اے اللہ!اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یہ کام تیری رضا کے لیے کیا تھا تو اس چٹان کو اتنا دور ہٹادے کہ ہم آسمان دیکھ سکیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اتنا سوراخ بنادیا جس سے وہ آسمان کودیکھ سکتے تھے۔

☆......دوسرے نے بارگاہِ الٰہی میں یوں درخواست کی:اے اللہ!میری ایک چچازاد تھی جس سے میں ان مردوں کی طرح شدید محبت کرتا تھا جو عشق میں مبتلا ہوتے ہیں، میں نے اسے اپنی نفسانی خواہش کی تکمیل کے لیے کہا تو اس نے اس وقت تک اس کی تعمیل سے انکار کردیا جب تک کہ میں اسے سو دینار لا کر نہ دوں، میں نے اپنے آپ کو مشقت میں ڈال کر سو دینار جمع کیے اوراسے لاکر پیش کیے، جب میں جماع کے لیے تیار ہوگیا تو اس نے کہا اے اللہ کے بندے!اللہ سے ڈرو اور ناجائز طریقے سے مجھے کنوارپنے سے محروم نہ کرو۔ اے اللہ!اگر تو جانتا ہے کہ میں نے گناہ سے اجتناب تیرے ڈر سے کیا تھا تو اس چٹان کو مزید ہٹادیجیے چنانچہ چٹان مزید کھسک گئی۔

☆......تیسرے نے یوں دعاء کی اے اللہ!میں نے ایک شخص کو اپنے ہاں تھوڑے سے چاول کے عوض میں اجرت پر رکھا تھا، جب اس نے اپنا کام پورا کرلیا تو مجھ سے اپنے حق کی ادائیگی کا مطالبہ کیا، میں نے طے شدہ چاول اس کے سامنے پیش کیے مگر اس نے لینے سے انکار کردیا میں یہ چاول کاشت کرتا رہا یہاں تک کہ میں نے ان کی خرید وفروخت سے بہت سی گائے اوران کے بچے جمع کرلیے وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا اللہ سے ڈرو اور میرا حق نہ دباؤ میں نے اس سے کہا جاؤ یہ سب گائے اوران کے بچے لے لو یہ تمہارا ہی حق ہے، وہ کہنے لگا اللہ سے ڈرو اور میرے ساتھ مذاق نہ کرو، میں نے کہا میں تم سے مذاق نہیں کررہا۔ یہ گائے اوران کے بچے لے جاؤ چنانچہ وہ انہیں ہنکاتا ہوا لے گیا،اے اللہ!اگر تو جانتا ہے کہ میں نے یہ کام تیری رضا کے لیے کیا تھا،تو تو باقی ماندہ چٹان کو بھی ہٹادیے،اس

کی دعاء قبول ہوئی اور یوں انہیں مصیبت سے نجات ملی۔

(بخاري : ٣٤٦٥ ، مسلم : ٢٧٤٣)

اس حدیث سے ہمیں چند سبق حاصل ہوتے ہیں:

۱-مصیبت اور پریشانی میں اللہ تعالیٰ سے کسی نیک عمل کا واسطہ دے کر دعاء کرنی چاہیے۔

۲-والدین کی خدمت انتہائی محبوب نیک عمل ہے۔

۳-قدرت ہوتے ہوئے گناہ سے اپنے آپ کو بچالینا ایسا عمل ہے جس کی وجہ سے انسان اللہ کی رحمت کا مستحق ہوجاتا ہے۔

۴-مبارک ہیں وہ لوگ جو معاملات میں امانت اور دیانت ملحوظ رکھتے ہیں اور ان کے قدموں میں کبھی لغزش پیدا نہیں ہوتی۔

علمی نکات، پُراثر واقعات، لطائف واشعار، فقہی پہیلیوں اور حقائق
کا بے مثال گلدستہ

خزینہ

مؤلف
حضرت مولانا محمد اسلم شیخوپوری رحمۃ اللہ علیہ

تائید وتوثیق
خطیب اہل السنۃ
حضرت مولانا عبداللہ صاحب قاسمی حفظہ اللہ

باہتمام: ظفر احمد نعمانی

مکتبۃ شیخ الاسلام کوسہ ممبرا
MAKTABA SHAIKHUL ISLAM
Mobile & whats App: 9322471046
Email: msislam829@gmail.com

ماہ محرم الحرام کے فضائل واحکام، ماہ محرم الحرام سے اسلامی سال کے آغاز وسن ہجری کا تعلق نیز دینی احکام میں اسلامی وقمری سن وماہ کی اہمیت اور عاشورہ کے روزے کی فضیلت

ماہ محرم الحرام کے فضائل واحکام

مؤلف

حضرت مولانا مفتی محمد رضوان صاحب مدظلہ العالی

تصحیح ونظر ثانی

خطیب اھل السنۃ
حضرت مولانا عبداللہ صاحب قاسمی حفظہ اللہ

باہتمام: ظفر احمد نعمانی

مکتبۃ شیخ الاسلام کوسہ ممبرا
MAKTABA SHAIKHUL ISLAM
Mobile & whats App: 9322471046
Email: msislam829@gmail.com

مکتبہ شیخ الاسلام
کی اہم مطبوعات

- اپنا گھر بچایئے!
- خطبۂ جمعہ خطیب وسامع کی زبان میں
- فرض نماز کے بعد دعاء کا ثبوت
- اجتہاد وتقلید (خورد)
- خوشگوار ازدواجی زندگی کے رہنما اصول
- فرقہ اہلحدیث پاک وہند کا تحقیقی جائزہ
- احکام نماز مع احادیث وآثار
- دروس القرآن (اول، دوم)
- فرقہ بریلویت پاک وہند کا تحقیقی جائزہ
- ازالۃ الوسواس عن اثر ابن عباس
- دروس الحدیث (اول)
- فرقہ جماعت المسلمین کا تحقیقی جائزہ
- الشہاب الثاقب علی المسترق الکاذب
- دست وگریبان (جلد اول)
- فضائل اعمال اور اعتراضات کا علمی جائزہ
- اصول مناظرہ
- دفاع اہل السنۃ والجماعۃ (اول)
- فضائل ومسائل قربانی
- اعتکاف کورس
- دلائل احناف
- قرآن کریم کیسے پڑھنا چاہیے!
- السامی (حسامی کا نوٹ)
- ڈاکٹر ذاکر نائیک خیالات ونظریات
- کنز الایمان کا تحقیقی جائزہ
- المہند اور اعتراضات کا علمی جائزہ
- رد بدعات ومنکرات
- کیا اہل عرب غیر مقلد ہیں؟
- امور خانہ داری میں حسن انتظام
- رسائل گھمن "ہندی"
- مقلد کی نماز غیر مقلد کے پیچھے جائز ہے؟
- اہل حدیث اور انگریز
- زبدۃ الشمائل شرح اردو شمائل ترمذی
- نماز اہل السنۃ والجماعۃ "اردو، ہندی"
- اہل حق اور اختلافات کی حقیقت
- سرور العینین فی تکبیرات العیدین
- نماز تراویح بیس رکعت سنت مؤکدہ ہے
- بارہ مسائل
- سستی جنت
- ماہ رمضان المبارک فضائل ومسائل
- بہشتی زیور پر اعتراضات کے جوابات
- سفرنامہ برما
- ماہ محرم الحرام کے فضائل واحکام
- بیس رکعات تراویح کا ثبوت
- سلفی کون؟ حنفی یا غیر مقلد
- ماہ صفر المظفر اور توہم پرستی
- تبلیغی جماعت اور مشائخ عرب
- سوال گندم جواب چنا
- ماہ ربیع الاول کے فضائل واحکام
- تحفۃ الایضاح شرح مقدمہ ابن صلاح
- شادی کی پہلی دس راتیں
- ماہ ربیع الآخر کے فضائل واحکام
- تحفۃ المحبین
- شادی مبارک
- مجالس متکلم اسلام (اول، دوم)
- تراویح کا مسئلہ متنازع نہ بنایا جائے
- صراط مستقیم کورس (مرد، خواتین)
- مرد وعورت کی نماز کے فرق پر تفصیلی جائزہ
- تذکیر شرح اردو نحو میر
- عقائد اہل السنۃ والجماعۃ
- مسائل اربعہ غیر مقلد علماء کی نظر میں
- تناقضات زبیر علی زئی
- عورتوں اور مردوں کی نماز میں فرق
- مسلک اعلیٰ حضرت
- جی ہاں فقہ حنفی قرآن وحدیث کا نچوڑ ہے
- غصہ مت کیجیے!
- مضامین متکلم اسلام
- چالیس مسئلوں پر چالیس احادیث
- غیر مقلدین کا اصلی چہرہ
- مواعظ متکلم اسلام (اول، دوم)
- حسام الحرمین کا تحقیقی جائزہ
- غیر مقلدین کا فرار ایک دلچسپ داستان
- مہدی ومسیح کا جھوٹا دعویدار شکیل بن حنیف
- حضرت جی پیر ذوالفقار احمد صاحب نقشبندی کے دلچسپ واقعات (۱،۲)
- غیر مقلدین کی غیر مستند نماز (اردو)
- ننگے سر نماز غیر مقلد علماء کی نظر میں
- غیر مقلدین کی غیر مستند نماز (ہندی)
- ہدایہ علماء کی عدالت میں
- حقائق الفقہ بجواب حقیقۃ الفقہ (اول)
- غیر مقلد مناظر کی غیر مقلدیت سے توبہ
- ہم اہل السنۃ والجماعۃ کیوں ہیں؟
- خطبات متکلم اسلام (اول، دوم، سوم)
- فتاویٰ عالمگیری پر اعتراضات کے جوابات
- ھوالکذاب بجواب من الکذاب

مکتبہ شیخ الاسلام کی اہم مطبوعات

۱۰۰ ر تقریریں (مولانا اسلم شیخوپوریؒ)
۱۲ مسائل
اپنا گھر بچایئے!
اجتہاد و تقلید (خورد)
احکام نماز مع احادیث وآثار
اصول مناظرہ
ازالۃ الوسواس عن اثر ابن عباسؓ
اعتکاف کورس
السامی لحل اسئلۃ الحسامی (نوٹ)
الشہاب الثاقب علی المسترق الکاذب
المہند پر اعتراضات کا علمی جائزہ
امور خانہ داری میں حسن انتظام
اہل حدیث اور انگریز
اہل حق اور ان کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کی حقیقت
بہشتی زیور پر اعتراضات کے جوابات
تبلیغی جماعت اور مشائخ عرب
تحفۃ الایضاح شرح اردو مقدمہ ابن صلاح
تحفۃ المحبین
تراویح کا مسئلہ متنازع نہ بنایا جائے
تناقضات زبیر علی زئی
جی ہاں! فقہ حنفی قرآن وحدیث کا نچوڑ ہے
چالیس مسئلوں پر چالیس احادیث
حسام الحرمین کا تحقیقی جائزہ
حضرت جی پیر ذوالفقار احمد نقشبندی دام ظلہم کے دلچسپ واقعات (اول، دوم)
حضرت مہدی کی ۳۰ علامتیں
حقائق الفقہ بجواب حقیقۃ الفقہ (اول)

خزینہ (مولانا اسلم شیخوپوریؒ)
خطبات متکلم اسلام (اول، دوم، سوم)
خطبۂ جمعہ خطیب وسامع کی زبان میں
خوشگوار ازدواجی زندگی کے رہنما اصول
درس قرآن وحدیث (مولانا شیخوپوریؒ)
دست وگریباں (اول)
دلائل احناف
ڈاکٹر ذاکر نائیک کے خیالات ونظریات
رسائل گھمن "ہندی"
زبدۃ الشمائل شرح اردو شمائل ترمذی
سرور العینین فی تکبیرات العیدین
سستی جنت
سفر نامہ برما
سلفی کون؟ حنفی یا غیر مقلد
سوال گندم جواب چنا
شادی کی پہلی دس راتیں
شادی مبارک
صراط مستقیم کورس (برائے مرد، خواتین)
عشاق قرآن کے ایمان افروز واقعات
عقائد اہل السنۃ والجماعۃ
غصہ مت کیجیے
غیر مقلدین کا اصلی چہرہ
غیر مقلدین کی غیر مستند نماز (اردو)
غیر مقلدین کی غیر مستند نماز (ہندی)
غیر مقلدین کے قرآن وحدیث کے خلاف ۵۰ مسائل
فتاویٰ عالمگیری پر اعتراضات کے جوابات
فرض نماز کے بعد دعا کا ثبوت

فرقہ اہلحدیث پاک وہند کا تحقیقی جائزہ
فرقہ بریلویت پاک وہند کا تحقیقی جائزہ
فرقہ جماعت المسلمین کا تحقیقی جائزہ
فضائل اعمال پر اعتراضات کا علمی جائزہ
فضائل ومسائل قربانی
قرآن کریم کیسے پڑھنا چاہیے!
کنز الایمان کا تحقیقی جائزہ
کیا اہل عرب غیر مقلد ہیں؟
کیا مقلد کی نماز غیر مقلد کے پیچھے جائز ہے؟
نماز اہل السنۃ والجماعۃ "اردو"
نماز اہل السنۃ والجماعۃ "ہندی"
نماز تراویح بیس رکعت سنت مؤکدہ ہے
ماہ رمضان المبارک فضائل ومسائل
ماہ محرم الحرام کے فضائل واحکام
ماہ رجب المرجب کے فضائل واحکام
ماہ شعبان المعظم کے فضائل واحکام
ماہ رمضان المبارک کے فضائل واحکام
مثالی مرد
مثالی عورت
مرد وعورت کی نماز کے فرق پر تفصیلی جائزہ
مسائل اربعہ غیر مقلد علماء کی نظر میں
مسلک اعلیٰ حضرت
مہدی ومسیح کا جھوٹا دعویدار شکیل بن حنیف
ننگے سر نماز غیر مقلد علماء کی نظر میں
ہدایہ علماء کی عدالت میں بجواب ہدایہ عوام کی عدالت میں
ہم اہل السنۃ والجماعۃ کیوں ہیں؟
ہو الکذاب بجواب من الکذاب

Noor Graphics 9045909068